پت جھڑ کی آواز

قرۃ العین حیدر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی

پت جھڑ کی آواز

قرۃ العین حیدر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

© قرۃ العین حیدر

Patjhad Ki Aawaz
by
Qurratul Ain Haider
Rs.110/-

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 ☎ 011-26987295

Email: monthlykitabnuma@gmail.com

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔110006 ☎ 011-23260668

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی۔400003 ☎ 022-23774857

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔202002 ☎ 0571-2706142

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 ☎ 011-26987295

قومی اردو کونسل کی کتابیں مذکورہ شاخوں پر دستیاب ہیں

سنہ اشاعت: 2011 تعداد: 1100 قیمت: 115/- [redacted] روپے

ISBN :978-81-7587-479-4 سلسلۂ مطبوعات: 1385

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025

فون نمبر: 49539000 فیکس: 49539099

ای میل: urducouncil@gmil.com ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: سلاسار امیجنگ سسٹمس آفسیٹ پرنٹرز، C-7/5، لارنس روڈ، انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی۔110035

اس کتاب کی چھپائی میں 70 GSM TNPL Maplitho کاغذ کا استعمال کیا گیا ہے۔

معروضات

قارئین کرام! آپ جانتے ہیں کہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ایک قدیم اشاعتی ادارہ ہے، جو اپنے ماضی کی شاندار روایات کے ساتھ آج بھی سرگرم عمل ہے۔ 1922ء میں اس کے قیام کے ساتھ ہی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو زمانے کے سرد و گرم سے گزرتا ہوا آگے کی جانب گامزن رہا۔ درمیان میں کئی دشواریاں حائل ہوئیں، نامساعد حالات سے بھی سابقہ پڑا مگر سفر جاری رہا اور اشاعتوں کا سلسلہ کلی طور پر کبھی منقطع نہیں ہوا۔

اس ادارے نے اردو زبان و ادب کے معتبر و مستند مصنفین کی سیکڑوں کتابیں شائع کی ہیں۔ بچوں کے لیے کم قیمت کتابوں کی اشاعت اور طلبا کے لیے ''درسی کتب'' اور ''معیاری سیریز'' کے عنوان سے مختصر مگر جامع کتابوں کی تیاری بھی اس ادارے کے مفید اور مقبول منصوبے رہے ہیں۔ ادھر چند برسوں سے اشاعتی پروگرام میں کچھ تعطل پیدا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے فہرست کتب کی اشاعت بھی ملتوی ہوتی رہی مگر اب برف پگھلی ہے اور مکتبہ کی جو کتابیں کمیاب بلکہ نایاب ہوتی جا رہی تھیں شائع ہو چکی ہیں۔ زیر نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اب تمام کتابیں مکتبہ کی دلی، ممبئی اور علی گڑھ شاخوں پر دستیاب ہیں اور آپ کے مطالبہ پر بھی روانہ کی جائیں گی۔

اشاعتی پروگرام کے جمود کو توڑنے اور مکتبہ کی ناؤ کو بھنور سے نکالنے میں مکتبہ جامعہ بورڈ آف ڈائرکٹرس کے چیئرمین اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر جناب نجیب جنگ (آئی اے ایس) کی خصوصی دلچسپی کا ذکر ناگزیر ہے۔ موصوف نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے فعّال ڈائرکٹر جناب حمید اللہ بھٹ کے ساتھ (مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے درمیان) ایک معاہدے کے تحت کتابوں کی اشاعت کے معطل شدہ عمل کو نئی زندگی بخشی ہے۔ اس سرگرم عملی اقدام کے لیے مکتبہ جامعہ کی جانب سے میں ان صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ یہ تعاون آئندہ بھی شاملِ حال رہے گا۔

خالد محمود

منیجنگ ڈائرکٹر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

فہرست

۱۔ ڈالن والا ۵

۲۔ جلاوطن ۳۸

۳۔ یاد کی اِک دھنک جلے ۹۴

۴۔ قلندر ۱۴۳

۵۔ کارمن ۱۷۰

۶۔ ایک مکالمہ ۱۹۰

۷۔ پت جھڑ کی آواز ۲۱۴

۸۔ ہاؤسنگ سوسائٹی ۲۳۴

ڈالن والا

ہر تیسرے دن، سہ پہر کے وقت ایک بے حد دُبلا پتلا بوڑھا، گھسے اور جگہ جگہ سے چمکتے ہوئے سیاہ کوٹ پتلون میں ملبوس، سیاہ گول ٹوپی اوڑھے، پتلی کمانی والی چھوٹے چھوٹے شیشوں کی عینک لگائے، ہاتھ میں چھڑی لیے برساتی میں داخل ہوتا اور چھڑی کو آہستہ آہستہ بجری پر کھٹکھٹاتا۔ نقیرا باہر آکر باجی کو آواز دیتا — "بٹیا۔ چلیے۔ سائمن صاحب آگئے"۔ بوڑھا باہر ہی سے باغ کی سڑک کا چکر کاٹ کر پہلو کے برآمدے میں پہنچتا۔ ایک کونے میں جاکر اور جیب میں سے میلا سا رومال نکال کر جھکتا۔ پھر آہستہ سے پکارتا "ریشم — ریشم — ریشم —" ریشم دوڑتی ہوئی آتی۔ باجی بڑے آرٹسٹک انداز میں سرود کندھے سے لگائے برآمدے میں نمودار ہوتیں۔ تخت پر بیٹھ کر سرود کا سُرخ بنارسی غلاف اُتارتیں اور سبق شروع ہوجاتا۔

بارش کے بعد جب باغ بھیگا بھیگا سا ہوتا اور ایک انوکھی سی تازگی اور خوشبو فضا میں تیرتی تو بوڑھے کو واپس جاتے وقت گھاس پر گری کوئی خوبانی مل جاتی۔ وہ اسے اُٹھا کر جیب میں رکھ لیتا۔ ریشم اس کے پیچھے پیچھے چلتی۔ اکثر ریشم شکار کی تلاش میں جھاڑیوں کے اندر غائب ہوجاتی یا کسی درخت پر چڑھ جاتی تو بوڑھا سر اُٹھا کر

ایک لمحے کے لیے درخت کی ہلتی ہوئی شاخ کو دیکھتا اور پھر سر جھکا کر پھاٹک سے باہر چلا جاتا۔ تیسرے روز سہ پہر کو پھر اسی طرح بجری پر چھڑی کھٹکھٹانے کی آواز آتی۔

یہ معمول بہت دنوں سے جاری تھا۔

جب سے پڑوس میں مسز جوگ مایا چٹرجی کلکتے سے آن کر رہی تھیں، اس محلّے کے باسیوں کو بڑا سخت احساس ہوا تھا کہ ان کی زندگیوں میں کلچر کی بہت کمی ہے۔ موسیقی کی حد تک ان سب کے "گول کمرے" میں ایک ایک گراموفون رکھا تھا۔ (ابھی ریڈیو عام نہیں ہوئے تھے۔ فریجیڈیر STATUS SYMBOL نہیں بنا تھا۔ ٹیپ ریکارڈ ایجاد نہیں ہوئے تھے اور سماجی رتبے کی علامات ابھی صرف کوٹھی، کار اور بیرے پر مشتمل تھیں) لیکن جب مسز جوگ مایا چٹرجی کے وہاں صبح شام ہارمونیم کی آوازیں بلند ہونے لگیں تو سروے آف انڈیا کے اعلا افسر کی بیوی مسز گوسوامی نے محکمہ جنگلات کے اعلا افسر کی بیوی مسز فاروقی سے کہا ــــ "بہن جی۔ ہم لوگ تو بہت ہی بیک ورڈ رہ گئے۔ ان بنگالیوں کو دیکھیے، ہر چیز میں آگے آگے ــــ"

"اور میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ ان لوگوں میں جب تک لڑکی گانا بجانا نہ سیکھ لے اس کا بیاہ نہیں ہوتا۔" ملٹری اکیڈمی کے اعلا افسر کی بیوی مسز جسونت سنگھ نے اظہارِ خیال کیا۔

"ہم مسلمانوں میں تو گانا بجانا معیوب سمجھا جاتا ہے، مگر آج کل زمانہ دوسرا ہے۔ میں نے تو "ان" سے کہہ دیا ہے۔ میں اپنی حمیدہ کو ہارمونیم ضرور سکھاؤں گی۔" مسز فاروقی نے جواب دیا۔

اور اس طرح رفتہ رفتہ ڈالن والا میں آرٹ اور کلچر کی ہوا چل پڑی۔ ڈاکٹر سنہا کی لڑکی نے ناچ سیکھنا بھی شروع کر دیا۔ ہفتے میں تین بار ایک منحنی سے ڈانس ماسٹر اس کے گھر آتے۔ انگلیوں میں سلگتی ہوئی بیڑی تھامے، منہ سے عجیب عجیب آوازیں نکالتے جو

"جی جی کت' نا توم ترنگ تکا تن تُن" وغیرہ الفاظ پر مشتمل ہوتیں۔ وہ طبلہ بجاتے رہتے اور راد شا سنہا کے پلٹے، توڑوں کی چک پھیریاں لیتے لیتے گھنگروؤں کی چوٹ سے زخمی ہو جاتے۔

پڑوس کے ایک نوجوان رئیس سردار امرجیت سنگھ نے وائلن پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا۔ سردار امرجیت سنگھ کے والد نے ڈچ ایسٹ انڈیز کے دارالسلطنت بٹاویا میں جو اب جمہوریہ انڈونیشیا کا دارالسلطنت جکارتا کہلاتا ہے، بزنس کر کے بہت دولت جمع کی تھی۔ سردار امرجیت سنگھ ایک شوقین مزاج رئیس تھے۔ جب وہ گراموفون پر بڑے انہماک سے ببّو کا ریکارڈ سے

خزاں نے آ کے چمن کو اُجاڑ دینا ہے
مری کھلی ہوئی کلیوں کو لوٹ لینا ہے

بار بار نہ بجاتے تو دریچے میں کھڑے ہو کر وائلن کے تاروں پر اسی انہماک سے گز رگڑا کرتے، ورنہ پھیری والے بزازوں سے رنگ برنگی چھینٹوں کی جارجٹ اپنے صافوں کے لیے خریدتے رہتے۔ اور یہ بڑھیا بڑھیا صافے باندھ کر اور داڑھی پر سیاہ پٹی نفاست سے چڑھا کر مسز فلک ناز مروارید خاں سے ملاقات کے لیے چلے جاتے اور اپنی زوجہ سردارنی بی بی چرن جیت کور سے کہہ جاتے کہ وائلن سیکھنے جا رہے ہیں۔

اسی زمانے میں باجی کو سرود کا شوق پیدا ہوا۔

وہ موسم سرما گوناگوں واقعات سے پُر گزرا تھا۔ سب سے پہلے تو ریشم کی ٹانگ زخمی ہوئی۔ پھر موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلانے والی مس زہرہ ڈربی نے آکر پریڈ گراؤنڈ پر اپنے جھنڈے گاڑے ڈائنا بیکٹ قتالۂ عالم حسینہ لندن کہلائی۔ ڈاکٹر مس زبیدہ صدیقی کو رات کو دو بجے گدھے کی جسامت کا کتا نظر آیا۔ مسٹر پیٹر رابرٹ سردار خاں ہماری زندگیوں سے غائب ہو گئے۔ نیگس نے خودکشی کر لی اور فقیرا

کی بھاوج گویا چڑیا بن گئی۔

چونکہ یہ سب نہایت اہم واقعات تھے لہٰذا میں سلسلے وار ان کا تذکرہ کرتی ہوں۔

میری بہت خوب صورت اور پیاری ریحانہ باجی نے جو میری چچازاد بہن تھیں' اسی سال بی۔اے پاس کیا تھا اور وہ علی گڑھ سے چند ماہ کے لیے ہمارے یہاں آئی ہوئی تھیں۔ ایک سہانی صبح باجی سامنے کے برآمدے میں کھڑی ڈاکٹر ہون کی بیوی سے باتوں میں مصروف تھیں کہ اچانک برساتی کی بجری پر ہلکی سی کھٹ کھٹ ہوئی اور ایک نحیف اور منحنی سے بوڑھے نے بڑی دھیمی اور ملائم آواز میں کہا — "میں نے سُنا ہے یہاں کوئی لیڈی سرود سیکھنا چاہتی ہیں۔"

باجی کے سوالات پر انھوں نے صرف اتنا کہا کہ ان کی ماہانہ فیس پانچ روپے ہے اور وہ ہفتے میں تین بار ایک گھنٹہ سبق دیں گے۔ وہ کرزن روڈ پر پادری اسکاٹ کی خالی کوٹھی کے شاگرد پیشے میں رہتے ہیں۔ ان کے بیوی بچے سب مر چکے ہیں اور برسوں سے ان کا ذریعۂ معاش سرود ہے جس کے ذریعے وہ آٹھ دس روپے مہینا کما لیتے ہیں۔

"لیکن اس خوابیدہ شہر میں سرود سیکھنے والے ہی کتنے ہوں گے؟" باجی نے پوچھا۔

انھوں نے اسی دھیمی آواز میں کہا: "کبھی کبھی دو ایک طالب علم مل جاتے ہیں"۔ (اس کے علاوہ انھوں نے اپنے متعلق کچھ نہیں بتلایا) وہ انتہائی خوددار انسان معلوم ہوتے تھے، ان کا نام سائمن تھا۔

پیر کے روز وہ ٹیوشن کے لیے آ گئے۔ باجی پچھلے لان پر دھوپ میں بیٹھی تھیں "مسٹر سائمن کو یہیں بھیج دو" انھوں نے فقیرا سے کہا۔ باجی کی طرف جانے کے لیے فقیرا نے ان کو اندر بلا لیا۔ اس روز بڑی سردی تھی اور میں اپنے کمرے میں بیٹھی کسی سٹریچر میں محو تھی۔ میرے کمرے میں سے گزرتے ہوئے ذرا ٹھٹک کر سائمن نے چاروں طرف دیکھا۔ آتش دان میں آگ دہک رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے اُن کے قدم آتش دان

کی سمت بڑھے اور انھوں نے آگ کی طرف ہتھیلیاں پھیلائیں۔ مگر پھر جلدی سے نیقرا کے پیچھے پیچھے باہر چلے گئے۔

ریشم نے ان سے بہت جلد دوستی کرلی۔ یہ بڑے تعجب کی بات تھی۔ کیونکہ ریشم بے انتہا مغرور، اکل کھری اور اپنے سیامی حسن پر حد سے زیادہ نازاں تھی۔ اور بہت کم لوگوں کو خاطر میں لاتی تھی۔ زیادہ تر وہ اپنی ساٹن کے ریشمی جھالر دار غلاف والی ٹوکری کے گدیلوں پر آرام کرتی رہتی اور کھانے کے وقت بڑی مکاری سے آنکھیں بند کرکے میز کے نیچے بیٹھ جاتی۔ "اس کی ساری خاصیتیں ویمپ (VAMP) عورتوں کی سی ہیں"۔ باجی کہتیں "عورت کی خاصیت بلی کی ایسی ہوتی ہے، چمکارو تو پنجے نکال لے گی، بے رخی برتو تو خوشامد شروع کردے گی ــــ"

"اور آدمی لوگوں کی خاصیت کیسی ہوتی ہے باجی؟" میں پوچھتی، باجی ہنسنے لگتیں اور کہتیں: "یہ ابھی مجھے معلوم نہیں"۔

باجی چہرے پر دل فریب اور مطمئن مسکراہٹ لیے باغ میں بیٹھی مظفر بھائی کے بے حد دلچسپ خط پڑھا کرتیں، جو اُن کے نام ہر پانچویں دن بمبئی سے آتے تھے۔ جہاں مظفر بھائی انجینئرنگ پڑھ رہے تھے۔ مظفر بھائی میرے اور باجی کے چچازاد بھائی تھے اور باجی سے ان کی شادی طے ہو چکی تھی۔ جتنی دیر وہ باغ میں بیٹھتیں، غفور بیگم ان کے نزدیک گھاس پر پاندان کھولے بیٹھی رہتیں۔ جب باجی اندر چلی جاتیں تو غفور بیگم شاگرد پیشے کی طرف جاکر نیقرا کی بھاوج سے باتیں کرنے لگتیں یا پھر اپنی نماز کی چوکی پر آبیٹھتیں۔

غفور بیگم باجی کی بے حد وفادار انّا تھیں۔ ان کے شوہر نے، جن کی علی گڑھ میں میرس روڈ کے چوراہے پر سائیکلوں کی دکان تھی، پچھلے برس ایک نوجوان لڑکی سے نکاح کرلیا تھا، اور تب سے غفور بیگم اپنا زیادہ وقت نماز روزے میں گزارتی تھیں۔

سائمن کے آتے ہی ریشم دبے پاؤں چلتی ہوئی آکر خرخر کرنے لگتی اور وہ فوراً

جیب سے رومال نکال کر اسے کچھ کھانے کو دیتے۔ شام کے وقت جب فقیرا ان کے لیے چاے کی کشتی لے کر برآمدے میں جاتا تو وہ آدھی چاے تشتری میں ڈال کر فرش پر رکھ دیتے اور ریشم فوراً تشتری چاٹ جاتی اور فقیرا بڑبڑاتا، "ہمارے ہاتھ سے تو رانی صاحب دودھ پینے میں بھی نخرے کرتی ہیں"۔

فقیرا ایک ہنس مکھ گڑھوالی نوجوان تھا۔ دو سال قبل وہ چیتھڑوں میں ملبوس، نہر کی منڈیر پر بیٹھا، اون اور سلائیوں سے موزے بُن رہا تھا۔ جو پہاڑیوں کا عام دستور ہے، تو سکھ نندن خانساماں نے اس سے پوچھا تھا، "کیوں بے نوکری کرے گا—؟" اور اس نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے جواب دیا تھا، "مہینوں سے بھوکوں مر رہا ہوں کیوں نہیں کروں گا"۔ تب سے وہ ہمارے یہاں "اوپر کا کام" کر رہا تھا اور ایک روز اس نے اطلاع دی تھی کہ اس کے دونوں بڑے بھائیوں کی مٹی ہوگئی ہے اور وہ اپنی بھاوج کو لینے گڑھوال جا رہا ہے۔ اور چند دنوں بعد اس کی بھاوج جل دھرا پہاڑوں سے آکر شاگرد پیشے میں بس گئی تھی۔

جل دھرا ادھیڑ عمر کی ایک گوری چٹی عورت تھی جس کے ماتھے، ٹھوڑی اور کلائیوں پر نیلے رنگ کے نقش و نگار گدے ہوئے تھے۔ وہ ناک میں سونے کی لونگ اور بڑا سا بُلاق اور کانوں کے بڑے بڑے سوراخوں میں لاکھ کے پھول پہنتی تھی اور اس کے گلے میں ملکہ وکٹوریہ کے روپوں کی مالا بھی پڑی تھی۔ یہ تین گہنے اس کے تینوں مشترکہ شوہروں کی واحد جایداد تھے۔ اس کے دونوں متوفی شوہر مرتے دم تک یاتریوں کا سامان ڈھوتے رہے تھے اور اتفاق سے اکٹھے ہی ایک پہاڑی سے گر کر مر گئے تھے۔ جل دھرا بڑے میٹھے لہجے میں بات کرتی تھی اور ہر وقت سوئٹر بنتی رہتی تھی۔ اسے کنٹھ مالا کا پرانا مرض تھا۔ فقیرا اس کے علاج معالجے کے لیے فکرمند رہتا تھا اور اس سے بے حد محبت کرتا تھا۔ جل دھرا کی آمد پر باقی نوکروں کی بیویوں نے آپس میں چہ میگوئیاں کی

تھیں ـــ "یہ پہاڑیوں کے ہاں کیسا بُرا رواج ہے ایک لُگائی کے دو دو تین تین خاوند" ـــ اور جب جل دھرا کا تذکرہ دوپہر کو کھانے کی میز پر ہوا تھا تو باجی نے فوراً دروپدی کا حوالہ دیا تھا اور کہا تھا پہاڑوں میں پولی اینڈری کا رواج مہابھارت کے زمانے سے چلا آتا ہے اور ملک کے بہت سے حصّوں کا سماجی ارتقا ایک خاص اسٹیج پر پہنچ کر وہیں منجمد ہو چکا ہے اور پہاڑی علاقے بھی ان ہی پسماندہ حصّوں میں سے ہیں۔ باجی نے یہ بھی کہا کہ پولی اینڈری جسے اُردو میں "چند شوہری" کہتے ہیں، مادرانہ نظام کی یادگار ہے۔ اور معاشرے نے جب مادرانہ نظام سے پدری نظام کی طرف ترقی کی تو انسان بھی کثیرالازدواجی کی طرف چلا گیا۔ اور مادرانہ نظام سے بھی پہلے، ہزاروں سال قبل، تین چار بھائیوں کے بجائے قبیلوں کے پورے پورے گروہ ایک ہی عورت کے ساتھ رہتے تھے اور ویدوں میں ان قبائل کا ذکر موجود ہے ـــ میں منہ کھولے یہ سب سنتی رہی۔ باجی بہت قابل تھیں۔ بی۔اے میں انھیں فرسٹ ڈویژن ملا تھا اور ساری علی گڑھ یونی ورسٹی میں اوّل رہی تھیں۔

ایک روز میں اپنی چھوٹی سی سائکل پر اپنی سہیلیوں کے ہاں جا رہی تھی۔ ریشم میرے پیچھے پیچھے بھاگتی آ رہی تھی۔ اس خیال سے کہ وہ سڑک پر آنے والی موٹروں سے کچل نہ جائے۔ میں سائکل سے اُتری، اسے خوب ڈانٹ کر سڑک پر سے اٹھایا اور باڑ پر سے احاطے کے اندر پھینک دیا اور پیڈل پر زور سے پاؤں مار کر تیزی سے آگے نکل گئی۔

لیکن ریشم احاطے میں کودنے کے بجائے باڑ کے اندر لگے ہوئے تیز نوکیلے کانٹوں والے تاروں میں اُلجھ گئی۔ اس کی ایک ران بُری طرح زخمی ہوئی۔ وہ لہولہان ہو گئی اور اس نے زور زور سے چلّانا شروع کیا اور اسی طرح تار سے لٹکی چیختی اور کراہتی رہی۔ بہت دیر بعد جب فقیرا ادھر سے گزرا جو جھاڑیوں سے مرچیں اور ٹماٹر توڑنے اس طرف آیا تھا تو اس نے

بڑی مشکل سے ریشم کو باڑ میں سے نکالا اور اندر لے گیا۔

جب میں کملا اور ملا کے گھر سے لوٹی تو دیکھا کہ سب کے چہرے اترے ہوئے ہیں۔ "تمھاری ریشم مر رہی ہے۔" باجی نے کہا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ "کمبخت جانے کس طرح جا کر باڑ کے تاروں میں اُلجھ گئی۔ جانے اس قدر احمق کیوں ہے؟ چڑیوں کی لالچ میں وہاں جا گھسی ہوگی۔ اب بُری طرح چلّا رہی ہے۔ ابھی ڈاکٹر صاحب مرہم پٹی کر کے گئے ہیں۔"

میرا دل دہل گیا۔ ریشم کی اس ناقابلِ برداشت تکلیف کی ذمّے دار میں تھی۔ اس کی تکلیف اور ممکن موت کے صدمے کے ساتھ انتہائی شدید احساسِ جرم نے مجھے سراسیمہ کر دیا اور میں جا کر گھر کے پچھواڑے گھنے درختوں میں چھپ گئی تاکہ دُنیا کی نظروں سے اوجھل ہو جاؤں۔ کچھ فاصلے پر کھٹ کھٹ بڑھیا کی شکل والی مسز وار برٹ کے گھر میں سے وائرلیس کی آواز آ رہی تھی۔ دور شاگرد پیشے کے سامنے فقیرا کی بھاوج گھاس پر بیٹھی غفور بیگم سے باتیں کر رہی تھی۔ پچھلے برآمدے میں باجی اب مظفر بھائی کو خط لکھنے میں محو ہو چکی تھیں۔ باجی کی عادت تھی کہ دن بھر میں کوئی بھی خاص بات ہوتی تھی تو وہ فوراً مظفر بھائی کو طویل سا خط لکھتی تھیں۔ ریشم پٹیوں سے بندھی ان کے نزدیک اپنی ٹوکری میں پڑی تھی۔ ساری دُنیا پُرسکون تھی، صرف میں ایک روپوش مجرم کی طرح اونچی اونچی گھاس میں کھڑی سوچ رہی تھی کہ اب کیا کروں۔ آخر میں آہستہ آہستہ اپنے والد کے کمرے کی طرف گئی اور دریچے میں سے اندر جھانکا۔ والد آرام کرسی پر بیٹھے کچھ پڑھ رہے تھے۔ میں اندر گئی اور کرسی کے پیچھے جا کر کھڑی ہو گئی "کیا بات ہے بی بی؟" میری سسکی کی آواز پر انھوں نے چونک کر مجھے دیکھا۔

"ریشم کو — ریشم کو ہم نے باڑھ میں پھینک دیا تھا"

"آپ نے پھینک دیا تھا؟"

"ہم — ہم کملا و ملا کے ہاں جانے کی جلدی میں تھے۔ وہ اتنا منع کرنے کے باوجود پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ ہم نے اسے جلدی سے باغ کے اندر پھینک دیا۔" اتنا کہہ کر میں نے

زار و قطار رونا شروع کر دیا۔

رونے کے بعد دل ہلکا ہوا اور جرم کا تھوڑا سا پرائسچت بھی ہو گیا مگر ریشم کی تکلیف کسی طرح کم نہ ہوئی۔ شام کو سائمن بستی سکھانے کے بعد دیر تک اس کے پاس بیٹھے اس سے باتیں کرتے رہے۔

ریشم کی روزانہ مرہم پٹی ہوتی تھی اور ہفتے میں ایک دفعہ اسے گھوڑا ہسپتال بھیجا جاتا تھا۔ اس کی ران پر سے اس کے گھنے اور لمبے لمبے سرمئی بال مونڈ دیے گئے تھے اور زخم کی گہری سُرخ لکیریں دور تک کھنچی ہوئی تھیں۔ کافی دنوں کے بعد اس کے زخم بھرے اور اس نے لنگڑا کر چلنا شروع کر دیا۔ ایک مہینے بعد وہ آہستہ آہستہ لنگڑاتی ہوئی سائمن کو پہنچانے پھاٹک تک گئی اور جب فقیرا بازار سے اس کے لیے چھیچھڑے لے کر آتا تو وہ اسی طرح لنگڑاتی ہوئی کونے میں رکھے ہوئے اپنے برتن تک بھی جانے لگی

ایک روز صبح کے وقت مسٹر جارج ہیکٹ باڑ پر نمودار ہوئے اور ذرا جھجکتے ہوئے انھوں نے مجھے اپنی طرف بلایا۔

"ریشم کی طبیعت اب کیسی ہے؟" انھوں نے دریافت کیا۔ "مجھے مسٹر سائمن نے بتایا تھا کہ وہ بہت زخمی ہو گئی تھی۔"

مسٹر جارج ہیکٹ نے پہلی بار اس محلے میں کسی سے بات کی تھی۔ میں نے ریشم کی خیریت دریافت کرنے کے لیے ان کا شکریہ ادا کیا۔ اور وہ اپنے چارخانہ کوٹ کی پھٹی ہوئی جیبوں میں انگوٹھے ٹھونس کر آگے چلے گئے۔

مسٹر جارج ہیکٹ ایک بے حد فاقہ زدہ اینگلو انڈین تھے اور بلیلی صاحب کہلاتے تھے۔ وہ سڑک کے سرے پر ایک خستہ حال کائی آلود کاٹج میں رہتے تھے اور بالٹی اٹھا کر صبح کو میونسپلٹی کے نل پر خود پانی بھرنے جایا کرتے تھے۔ ان کی ایک لڑکی تھی جس کا نام ڈولنا تھا۔ وہ پریڈ گراؤنڈ پر ایک انگریزی سینما ہال میں ٹکٹ بیچتی تھی اور خوش رنگ فراک پہنے اکثر سامنے سے

سائکل پر گزرا کرتی تھی، اس کے پاس صرف چار فراک تھے جنھیں وہ دھو دھو کر اور بدل بدل کر پہنا کرتی تھی اور مسز گوسوامی، مسز فاروقی اور مسز جسونت سنگھ کا کہنا تھا کہ "سینا ہال کی نوکری کے اسے صرف پچیس روپلی ملتے ہیں اور کیسے ٹھاٹ کے کپڑے پہنتی ہے۔ اسے گورے پیسے دیتے ہیں"۔ لیکن گورے اگر اسے پیسے دیتے تھے (یہ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اسے گورے کیوں پیسے دیتے تھے) تو اس کا بوڑھا باپ نل پر پانی بھرنے کیوں جاتا تھا۔

یہ پنشن یافتہ متمول انگریزوں کا محلہ تھا جو پُر فضا خوبصورت کوٹھیوں میں خاموشی سے رہتے تھے۔ ان کے انتہائی نفاست سے سجے ہوئے کمروں اور برآمدوں میں لندن السٹریٹیڈ نیوز، ٹیٹلر، کنٹری لائف اور پنچ کے انبار میزوں پر رکھے تھے۔ اور ٹائمز اور ڈیلی ٹیلی گراف کے پلندے سمندری ڈاک سے ان کے نام آتے تھے۔ ان کی بیویاں روزانہ صبح کو اپنے اپنے "مورننگ روم" میں بیٹھ کر بڑے اہتمام سے "ہوم" خط لکھتی تھیں۔ اور ان کے گول کمروں میں ان کے بیٹوں کی تصویریں رو پہلے فریموں میں سجی تھیں جو مشرقی افریقہ اور جنوب مشرقی ایشیا میں سلطنت برطانیہ کے آفتاب کو مزید چمکانے میں مصروف تھے۔ یہ لوگ مدتوں سے اس ملک میں رہتے آرہے تھے مگر "کوئی ہائے" اور "عبدل چھوٹا حاضری مانگتا" سے زیادہ الفاظ نہ جانتے تھے۔ یہ عزلت پسند انگریز دن بھر باغبانی یا برڈ واچنگ (BIRD WATCHING) یا ٹکٹ جمع کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ یہ بڑے عجیب لوگ تھے۔ مسٹر ہارڈ کاسل تبتی زبان اور رسم و رواج کے ماہر تھے۔ مسٹر گرین آسام کے کھاسی قبائل پر اتھارٹی تھے۔ کرنل وائٹ ہیڈ جو شمالی مغربی سرحد کے معرکوں میں اپنی ایک ٹانگ کھو چکے تھے اور لکڑی کی ٹانگ لگاتے تھے۔ خوش حال خاں خٹک پر عبور رکھتے تھے۔ میجر شیلٹن اسٹیٹسمین میں شکار کے متعلق مضامین لکھا کرتے تھے۔ اور مسٹر مارچ مین کو شطرنج کا خبط تھا۔ مس ڈرنک واٹر پلانچٹ پر روحیں بلاتی تھیں اور مسز وار برٹوک تصویریں بناتی تھیں۔

مسز وار ٹبروک ایک بریگیڈیر کی بیوہ تھیں۔ اور ہمارے پچھواڑے رہتی تھیں۔ ان کی بوڑھی پھونس کنواری بہن بھی ان کے ساتھ رہتی تھیں۔ ان دونوں بہنوں کی شکلیں لمبی چونچ والے پرندوں کی ایسی تھیں۔ اور یہ دونوں اپنے طویل و عریض ڈرائینگ روم کے کسی کونے میں بیٹھی آبی رنگوں سے ہلکی پھلکی تصویریں بنایا کرتی تھیں۔ وہ دونوں اتنی مختصر سی تھیں کہ پھول دار غلافوں سے ڈھکے ہوئے فرنیچر اور دوسرے ساز و سامان کے جنگل میں کھو جاتی تھیں اور پہلی نظر میں بڑی مشکل سے نظر آتی تھیں۔

ڈالن والا کی ایک کوٹھی میں "انگلش اسٹورز" تھا جس کا مالک ایک پارسی تھا۔ محلے کی ساری انگریز اور نیٹو بیویاں یہاں آکر خریداری کرتی تھیں اور اسکنڈل اور خبروں کا ایک دوسرے سے تبادلہ کرتی تھیں۔

اس خوش حال اور مطمئن انگریزی محلے کے واحد مفلس اور اینگلو انڈین باسی بھی بھی نیلی آنکھوں والے مسٹر جارج بیکٹ تھے۔ مگر وہ بڑی آن بان والے اینگلو انڈین تھے اور خود کو پکا انگریز سمجھتے تھے، انگلستان کو "ہوم" کہتے تھے اور چند سال اُدھر جب شہنشاہ جارج پنجم کے انتقال پر کولاگڑھ میں سلو مارچ پر بڑی بھاری پریڈ ہوئی تھی اور گوروں کے بینڈ نے موت کا نغمہ بجایا تھا تو مسٹر جارج بیکٹ بھی بازو پر سیاہ ماتمی پٹی باندھ کر کولاگڑھ گئے تھے اور انگریزوں کے مجمعے میں بیٹھے تھے اور ان کی لڑکی ڈائنا روز نے اپنے سنہرے بالوں اور خوبصورت چہرے کو سیاہ ہیٹ اور سیاہ جالی سے چھپایا تھا۔ اور مسٹر بیکٹ بہت دنوں تک سیاہ ماتمی پٹی بازو پر باندھے رہے تھے۔

لیکن بچے بہت بے رحم ہوتے ہیں۔ ڈالن والا کے سارے ہندستانی بچے مسٹر جارج بیکٹ کو نہ صرف بلیلی صاحب کہتے تھے بلکہ کملا اور وملا کے بڑے بھائی سورن نے جو ایک پندرہ سالہ لڑکا تھا اور ڈون پبلک اسکول میں پڑھتا تھا۔ مسٹر بیکٹ کی لڑکی ڈائنا کو چڑانے کی ایک اور ترکیب نکالی تھی۔

کملا اور وملا کے والد ایک بے حد دلچسپ اور خوش مزاج انسان تھے۔ انھوں نے ایک بہت ہی انوکھا انگریزی ریکارڈ ۱۹۲۸ء میں انگلستان سے خریدا تھا۔ یہ ایک انتہائی بے تکا گیت تھا جس کا اینگلو انڈین اردو ترجمہ بھی ساتھ ساتھ اسی دھن میں گایا گیا تھا۔ نہ جانے کس منچلے انگریز نے اسے تصنیف کیا تھا۔ یہ ریکارڈ اب سورن کے قبضے میں تھا۔ اور جب ڈائنا سائکل پر ان کے گھر کے سامنے سے گزرتی تو سورن گراموفون دریچے میں رکھ کر اس کے بھونپو کا رخ سڑک کی طرف کر دیتا اور سوئی ریکارڈ پر رکھ کر چھپ جاتا۔
مندرجہ ذیل بلند پایہ روح پرور گیت کی آواز بلند ہوتی ——

There was a rich merchant in London did stay.
Who had for his daughter an uncommon liking.
Her name it was Diana, she was sixteen years old,
And had a large fortune in silver and gold.

ایک بار ایک سوداگر شہر لندن میں تھا
جس کی ایک بیٹی نام ڈائنا اس کا
نام اس کا ڈائنا سولے برس کا عمر
جس کے پاس بہت کپڑا چاندی اور سونا

As Diana was walking in the garden one day.
Her father came to her and thus did he say:
Go dress yourself up in gorgeous array,
For you will have a husband both gallant
and gay.

ایک دن جب ڈائنا بگیچہ میں تھی
باپ آئی اور بولی بیٹی

جاؤ کپڑا پہنو اور ہو صفا
کیوں کہ میں ترے واسطے ایک خاوند لایا

O father, dear father I've made up my mind,
To marry at present I don't feel inclined.
And all my large fortune every day adore,
If you let live me single a year or two more.

ارے رے مورا باپ تب بولی بیٹی
شادی کا ارادہ میں نا ہیں کرتی
اگر ایک دو برس تکلیف نا ہیں دیو
آ آ ارے دولت میں بالکل چھوڑ دیوں

Then gave the father a gallant reply:
If you don't be this young man's bride,
I'll leave all your fortune to the fearest of things,
And you should not reapthe benefit of a single thing.

تب باپ بولا ارے بچہ بیٹی
اس شخص کی جورو تو نا ہیں ہوتی
مال اور اسباب تیرا کُرکی کر دیوں
اور ایک پکی دمڑی بھی تجھے نا دیوں

As Wilikins was walking in the garden one day,
He found his dear Diana lying dead on the way.

A cup so fearful that lay by her side.
And Wilikins doth fainteth with a cry in his eye

ایک دن جب وہ پکن ہوا کھانے کو گیا
ڈائنا کا مُردہ ایک کونے میں پایا
ایک بادشاہ پیالہ اس کے کمرے پر پڑا
اور ایک چٹھی جس میں لکھا:-
" زہر پی کے مرا"

جیسے ہی ریکارڈ بجنا شروع ہوتا، بے چاری ڈائنا سائکل کی رفتار تیز کر دیتی اور اپنے سنہرے بال جھٹک کر زناٹے سے آگے نکل جاتی۔

اس موسم سرما کا دوسرا اہم واقعہ پریڈ گراؤنڈ میں "دی گریٹ ایسٹ انڈین سرکس اینڈ کارنیول" کی آمد تھا۔ اس کے اشتہار لنگوروں اور مسخروں کے لمبے جلوس کے ذریعے بانٹے گئے تھے جن پر لکھا تھا:-

بیسویں صدی کا حیرت ناک تماشا
شیر دل حسینہ مس زہرہ ڈربی
موت کے کنویں میں
آج شب کو

سب سے پہلے فقیرا سرکس دیکھ کر لوٹا۔ وہ اپنی بھاوج کو بھی کھیل دکھانے لے گیا تھا۔ اور صبح کو اس نے اطلاع دی تھی ــ "بیگم صاحب ــ بڑی بٹیا ــ بی بی ــ

زنانی ڈیتھ آف ویل میں ایسے چھٹ پھٹی چلاتی ہے کہ بس کیا بتاؤں ــــ عورت ہے کہ شیر کی بچی ــــ ہرے رام ــــ ہرے رام ــــ"

دوسرے دن اسکول میں کملا دملانے مجھے بتایا کہ مس زہرہ ڈربی ایک نہایت سنسنی خیز خاتون ہے۔ اور وہ دونوں بھی اس کے دلیرانہ کمالات بچشم خود دیکھ کر آئی ہیں۔

چونکہ میں سرکسوں پر پہلے ہی سے عاشق تھی لہٰذا جلد از جلد باجی کے ساتھ پریڈ گراؤنڈ پہنچی۔ وہاں تمبو کے باہر ایک اونچے چوبی پلیٹ فارم پر ایک موٹر سائکل گھڑگھڑا رہی تھی اور اس کے پاس مس زہرہ ڈربی کرسی پر فروکش تھی۔ اس نے نیلے رنگ کی چمک دار ساٹن کا اس قطع کا لباس پہن رکھا تھا جو مس نادیا نے ہنٹر والی فلم میں پہنا تھا۔ اس نے چہرے پر بہت سا گلابی پاؤڈر لگا رکھا تھا جو بجلی کی روشنی میں نیلا معلوم ہو رہا تھا۔ اور ہونٹ خوب گہرے سُرخ رنگے ہوئے تھے۔ اس کے برابر میں ایک بے حد خوفناک، بڑی بڑی مونچھوں والا آدمی اسی طرح کی رنگ برنگی "برجیس" پہنے، لمبے لمبے پٹّے سجائے اور گلے میں بڑا سا سُرخ آدی رومال باندھے بیٹھا تھا۔ مس زہرہ ڈربی کے چہرے پر بڑی اُکتاہٹ تھی اور وہ بڑی بے لطفی سے سگریٹ کے کش لگا رہی تھی۔

اس کے بعد وہ دونوں موت کے کنویں میں داخل ہوئے جس کی تہ میں ایک اور موٹر سائکل رکھی تھی۔ خوفناک آدمی موٹر سائکل پر چڑھا اور مس زہرہ ڈربی سامنے اس کی باہوں میں بیٹھ گئی۔ اور خوفناک آدمی نے کنویں کے چکّر لگائے۔ پھر وہ اُتر گیا۔ اور مس زہرہ ڈربی نے تالیوں کے شور میں موٹر سائکل پر تنہا کنویں کے چکّر لگائے اور اوپر آکر دونوں ہاتھ چھوڑ دیے۔ اور موٹر سائکل کی تیز رفتاری کی وجہ سے موت کا کنواں زور زور سے ہلنے لگا اور میں مس زہرہ ڈربی کی اس حیرت انگیز بہادری کو مسحور ہو کر دیکھتی رہی۔ کھیل کے بعد وہ دوبارہ اسی طرح چبوترے پر جا بیٹھی اور بے تعلقی سے سگریٹ پینا شروع کر دیا۔ گویا کوئی بات ہی نہیں۔

یہ واقعہ تھا کہ مس زہرہ ڈربی جاپانی چھتری سنبھال کر تار پر چلنے والی میموں اور شیر کے پنجرے میں جانے والی اور اونچے اونچے تاروں اور جھولوں پر کمالات دکھانے والی لڑکیوں سے بھی زیادہ بہادر تھی۔ پچھلے برس وہاں "عظیم الشان آل انڈیا دنگل" آیا تھا جس میں مس حمیدہ بانو پہلوان نے اعلان کیا تھا کہ جو مرد پہلوان انھیں ہرا دے گا وہ اس سے شادی کر لیں گی۔ لیکن بقول فقیرا کوئی مائی کا لال اس شیر کی بچی کو نہ ہرا سکا تھا اور اسی دنگل میں پروفیسر تارا بائی نے بھی بڑی زبردست کشتی لڑی تھی اور ان دونوں پہلوان خواتین کی تصویریں اشتہاروں میں چھپی تھیں جن میں وہ بنیان اور نیکریں پہنے ڈھیروں تمغے لگائے بڑی شان و شوکت سے کیمرے کو گھور رہی تھیں —

یہ کون پُراسرار ہستیاں ہوتی ہیں جو تار پر چلتی ہیں اور موت کے کنویں میں موٹر سائکل چلاتی ہیں اور اکھاڑے میں کشتی لڑتی ہیں۔ میں نے سب سے پوچھا لیکن کسی کو بھی ان کے متعلق کچھ نہ معلوم تھا۔ —

"دی گریٹ ایسٹ انڈین سرکس" ابھی تماشے ہی دکھا رہا تھا کہ ایک روز فقیرا پلٹن بازار سے سودا لے کر لوٹا تو اس نے ایک بڑی تہلکہ خیز خبر سُنائی کہ مس زہرہ ڈربی کے عشاق ماسٹر گلقند اور ماسٹر مچھندر کے درمیان چکو چل گیا۔ ماسٹر مچھندر نے مس زہرہ ڈربی کو بھی چکو سے گھائل کر دیا اور وہ ہسپتال میں پڑی ہیں اور اس سے بھی تہلکہ خیز خبر، جو فقیرا نے چند دن بعد میونسپلٹی کے نل پر سُنی، یہ تھی کہ بلیلی صاحب کی مسیا نے سرکس میں نوکری کر لی۔

"ڈائنا بیکٹ نے —— ؟" باجی نے دُہرایا۔

"جی ہاں بڑی بٹیا —— بلیلی صاحب کی مسیا سُنا ہے کہتی ہے کہ اس سے اپنے باپ کی گریبی اور تکلیف اب نہیں دیکھی جاتی اور دنیا والے تو یوں بھی تنگ کرتے ہیں۔ اوڈین سینما میں اسے پچیس روپے ملتے تھے۔ سرکس میں پچھتر روپے ملیں گے —— یہ تو سچ ہے۔ وہ گریب تو بہت تھی بڑی بٹیا ——"

"اور گورے جو اس کو پیسے دیتے تھے؟" میں نے پوچھا۔
غفور بیگم نے مجھے گھور کر دیکھا اور کہا "جاؤ۔ بھاگ جاؤ یہاں سے"۔ لہٰذا میں بھاگ گئی اور باہر جا کر رشیم کی ٹوکری کے پاس بیٹھ کے ڈائنا بیکٹ کی بہادری کے متعلق غور کرنے لگی۔

اب کی بار جب لنگوروں اور مسخروں نے سرکس کے اشتہار بانٹے تو ان پر چھپا تھا —

سرکس کے عاشقوں کو مژدہ
پری جمال یورپین دوشیزہ کے حیرت انگیز کمالات
قتالۂ عالم، حسینۂ لندن مس ڈائنا روز
موت کے کنوئیں میں
آج شب کو

ان ہی دنوں سینما کا چرچا ہوا۔ یوں تو سینما کے اشتہار عرصے سے لکڑی کے ٹھیلوں پر چپکے سامنے سے گزرا کرتے تھے:

سالِ رواں کی بہترین فلم
"چیلنج"
جس میں مس سردار اختر کام کرتی ہیں۔ پریڈ کے سامنے
پلیڈیم سینما میں — آج شب کو

اور

سالِ رواں کی بہترین فلم
"دہلی ایکسپریس"
جس میں مس سردار اختر کام کرتی ہیں
پریڈ کے سامنے، راکسی سینما میں
آج شب کو

اور مجھے بڑی پریشانی ہوتی تھی کہ مس سردار اختر دونوں جگہوں پر بیک وقت کس طرح "کام" کریں گی۔ لیکن قسمت نے ایک دم یوں پلٹا کھایا کہ باجی اور ان کی سہیلیوں کے ساتھ یکے بعد دیگرے تین فلم دیکھنے کو ملیں ــ "اچھوت کنیا" جس کے لیے مسز جوگ مایا چٹرجی نے بتایا کہ ہمارے دیش میں بہت زبردست سماجی انقلاب آگیا ہے اور گرودیو ٹیگور کی بھانجی دیویکا رانی اب فلموں میں کام کرتی ہیں اور "جیون لتا" جس میں سیتا دیوی نازک نازک چھوٹی سی آواز میں گاتیں ــ "موہے پریم کے جھولے جھلا دے کوئی ــ" اور "جیون پربھات" جسے باجی بڑے ذوق و شوق سے اس لیے دیکھنے گئیں کہ اس میں خورشید آپا "کام" کررہی تھیں، جو اب رینوکا دیوی کہلاتی تھیں، جو اس زبردست سماجی انقلاب کا ثبوت تھا، مسز جوگ مایا چٹرجی کی بشارت کے مطابق ہندستان جس کے دروازے پر کھڑا تھا اور تبھی مسز جوگ مایا چٹرجی کی لڑکیوں نے ہارمونیم پر فلمی گانے "نکالنے" شروع کردیے۔ بانکے بہاری بھول نہ جانا ــ ہم تم پیاری پریت نبھانا ــ" اور "چور چرادے مال خزانہ، پیا نینوں کی نندیا چرادے" اور ــ "تم اور میں مُنا پیارا ــ گھر دا ہوگا سورگ ہمارا ــ"

غفور بیگم کام کرتے کرتے ان آوازوں پر کان دھرنے کے بعد کمر پر ہاتھ رکھ کر

کہتیں ۔"بڑے بوڑھے سچ کہہ گئے تھے۔ قربِ قیامت کے آثار یہی ہیں کہ گائے مینگنیاں کھائے گی اور کنواریاں اپنے منہ سے بر مانگیں گی۔"

اتنے میں منورا چترجی کی سُریلی آواز بلند ہوتی ۔"موہے پریم کے جھولے جھلا دے کوئی۔"

"ہے حیا! تیرا آسرا۔" غفور بیگم کانپ کر فریاد کرتیں اور سلیپر پاؤں میں ڈال سٹر پٹر کرتی اپنے کام کاج میں مصروف ہو جاتیں۔

ان ہی دنوں نیقرا بھی اپنی بھاوج کو یہ ساری فلمیں سیکنڈ شو میں دکھا لایا۔ مگر جس رات جل دھرا "چنڈی داس" فلم دیکھ کر لوٹی تو اُسے بڑا سخت بخار چڑھ گیا اور ڈاکٹر ہون نے صبح کو آکر اسے دیکھا اور کہا کہ اس کا مرض تشویشناک صورت اختیار کر چکا ہے۔ اب وہ روز تانگے میں لیٹ کر ہسپتال جاتی اور واپس آکر دھوپ میں گھاس پر کمبل بچھا کر لیٹی رہتی۔ کچھ دنوں میں اس کی حالت ذرا بہتر ہو گئی۔ اور سکھ نندن خانساماں کی بیوی دھن کلیا اس سے ذرا فاصلے پر بیٹھ کر اس کا دل بہلانے کے لیے پوربی گیت گایا کرتی اور اُسے چھیڑ چھیڑ کر رلاتی ۔

"ناجو ادا سے سرم و حیا سے
بالے سیّاں سے سرمائے گئی میں تو۔"

اور غفور بیگم جب جل دھرا کی خیریت پوچھنے جاتیں تو وہ مسکرا کر کہتی ۔"اناجی ۔ میرا تو سمے آگیا۔ اب تھوڑے دنوں میں پران نکل جائیں گے۔"

اور غفور بیگم اس کا دل رکھنے کے لیے کہتیں "اری تو ابھی بہت جیے گی ۔ اور اے جل دھرا۔ ذرا یہ تو بتا کہ تو نے نیقرا گوڑے پر کیا جادو کر رکھا ہے ۔ ذرا مجھے بھی وہ منتر بتا دے، مجھ بدبختی کو تو اپنے گھر والے کو رام کرنے کا ایک بھی نسخہ نہ ملا ۔ تو ہی کوئی ٹوٹکا بتا دے۔ سُنا ہے پہاڑوں پر جادو ٹونے بہت ہوتے ہیں ۔ نیقرا بھی کیسا تیرا کلمہ

پڑھتا ہے ـــ اری تو تو اس کی ماں کے برابر ہے ـــ!" اور وہ بڑی ادا سے ہنس کر جواب دیتی ـــ "اناجی۔ کیا تم نے سنا نہیں پُرانے چاول کیسے ہوتے ہیں؟"

"پُرانے چاول ـــ؟" میں دہراتی۔ اور غفور بیگم ذرا گھبرا کر مجھے دیکھتیں اور جلدی سے کہتیں ـــ "بی بی آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟ جائیے بڑی بٹیا آپ کو بُلا رہی ہیں۔" لہٰذا میں سر جھکائے بجری کی رنگ برنگی کنکریاں جوتوں کی نوک سے ٹھکراتی باجی کی طرف چلی جاتی۔ مگر وہ فلسفے کی موٹی سی کتاب کے مطالعے میں یا مظفر بھائی کا خط پڑھنے یا اس کا جواب لکھنے میں مستغرق ہوتیں اور مجھے کہیں اور جانے کا حکم دے دیتیں تو میں گھوم پھر کر دوبارہ ریشم کی ٹوکری کے پاس جا بیٹھتی اور اس کے جلد تندرست ہونے کی دُعائیں مانگنے لگتی۔

اسکول میں کرسمس کی چھٹیاں شروع ہو چکی تھیں، میں صبح صبح کملا دملا کے گھر جا رہی تھی کہ راستے میں مسٹر بیکٹ نظر آئے۔ وہ بے حد حواس باختہ اور دیوانہ وار ایک طرف کو بھاگے چلے جا رہے تھے۔ اتنے میں میجر شیلٹن نے اپنی ۱۹۲۶ء ماڈل کی کھڑکھڑیا فورڈ روک کر انہیں اس میں بٹھا لیا اور فورڈ یورپین ہسپتال کی سمت روانہ ہو گئی۔

میں کملا کے گھر پہنچی تو سورن خلاف معمول بہت خاموش تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ ابھی پریڈ گراؤنڈ سے سارا واقعہ سُن کر آیا ہے ـــ

ڈاینا بیکٹ ابھی ماسٹر مہندر کے ساتھ ہی موٹر سائکل پر بیٹھتی تھی اور دیکھنے والوں کا بیان تھا کہ دہشت کے مارے اس کا رنگ سفید پڑ جاتا تھا اور وہ آنکھیں بند کیے رہتی تھی۔ مگر سرکس منیجر نے اصرار کیا کہ وہ تنہا موٹر سائکل چلانے کی ٹریننگ بھی شروع کر دے۔ تاکہ اس کے دل کا خوف نکل جائے۔ دل کا خوف نکالنے کے لیے اس نے موٹر سائکل پر تنہا بیٹھ کر کنوئیں کی دیوار پر چڑھنے کی کوشش کی مگر موٹر سائکل بے قابو ہو گئی اور ڈاینا کی دونوں ٹانگیں موٹر سائکل کے تیزی سے گھومتے ہوئے پہیّوں میں آ کر چور چور

ہوگئیں۔ اسے فوراً یورپین ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ کرنل وائی کومب سول سرجن نے کہا ہے کہ اس کی دونوں ٹانگیں ہمیشہ کے لیے بے کار ہوگئی ہیں۔ اور اسے ساری عمر پہیوں والی کرسی پر بیٹھ کر گزارنی ہوگی۔"

اس دن ہم لوگوں کا کسی چیز میں دل نہ لگا۔ اور ہم سب ایک درخت کی شاخ پر چپ چاپ بیٹھے رہے۔ کچھ دیر بعد دفعتاً سورن شاخ پر سے نیچے کودا، اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا کرکٹ کھیلنے چلا گیا۔ اور میں نے دیکھا کہ سب کے چہرے پر ایک عجیب سی ندامت طاری تھی۔ ایک انجانا سا احساسِ جُرم اور ندامت ــــــ

دوسرے روز دی گریٹ ایسٹ انڈین سرکس اینڈ کارنیول کے نوکیلی مونچھوں اور بے شمار تمغوں والے منیجر اور رنگ ماسٹر پروفیسر شہباز نے اعلان کیا کہ سرکس کوچ کر رہا ہے اور آیندہ سال معزز شایقین کو اس سے زیادہ حیرت ناک تماشے دکھائے جائیں گے لیکن فقیرا کی اطلاع کے مطابق وہ ڈرا ہوا تھا۔ اس کے سرکس میں پے در پے دو شدید حادثے ہوئے تھے اور پولس اس کے پیچھے لگ گئی تھی۔

سرکس نے کوچ کر دیا اور مس زہرہ ڈربی بھی ہسپتال سے جانے کہاں غائب ہوگئی۔

کرسمس کی چھٹیاں شروع ہوئے ایک ہفتہ گزرا تھا کہ ایک بہت لمبی اور دُبلی پتلی بی بی ہمارے یہاں مہمان آئیں۔ ان کا نام ڈاکٹر زبیدہ صدیقی تھا۔ وہ دہلی سے کلکتہ جا رہی تھیں اور ایک ہفتے کے لیے ہمارے یہاں ٹھہری تھیں۔ انھوں نے ولایت سے سائنس کے کسی مضمون میں پی۔ ایچ۔ ڈی کیا تھا۔ وہ کسی دور افتادہ دیسی ریاست کے گرلز کالج کی پرنسپل تھیں اور سیاہ کنارے کی سفید ساری اور لمبی آستینوں کا سفید بلاؤز پہنتی تھیں، وہ اپنی طویل القامتی کی وجہ سے ذرا جھک کر چلتی تھیں اور سر موڑ کر بڑی گہری نظر سے ہر ایک کو دیکھتی تھیں۔ اس وقت وہ گنتی کی ان مسلمان خواتین میں سے تھیں جنھوں نے سمندر پار جاکر اعلا تعلیم حاصل

کی تھی۔

پہلے روز جب وہ کھانا کھانے بیٹھیں تو انھوں نے ذرا جھجک کر کہا "آپ کے ہاں سارے ملازم ہندو ہیں۔ میں دراصل ہندو کے ہاتھ کا پکا نہیں کھاتی ــــ"۔

"مسلمان ہوکر آپ چھوت چھات کرتی ہیں زبیدہ آپا؟ کمال ہے، اور آپ تو ولایت تک ہو آئی ہیں زبیدہ آپا ــــ" باجی نے اپنی خوبصورت آنکھیں پھیلا کر کہا۔

"دراصل ــــ وہ ــــ میں ــــ میں ایک وظیفہ پڑھ رہی ہوں آج کل ــــ" انھوں نے جھینپتے ہوئے جواب دیا۔ لہٰذا ان کا کھانا غفور بیگم نے باوضو ہوکر اپنے ہاتھ سے تیار کرنا شروع کیا۔

پڑوس کی مسلمان بیبیوں پر ڈاکٹر صدیقی کی مذہبیت کا بے انتہا رعب پڑا۔ "لڑکی ہو تو ایسی، سات سمندر پار ہو آئی مگر ساری کا آنچل مجال ہے جو سر سے سرک جائے ــــ" مسز فاروقی نے کہا۔

"شرعی پردہ تو دراصل یہی ہے کہ عورت بس اپنا چہرہ اور ہاتھ کھلے رکھے۔ اور اپنی زینت مردوں سے چھپائے۔ قرآن پاک میں یہی آیا ہے۔" مسز قریشی نے جواب دیا۔

"روزے نماز کی پابند، شرم و حیا کی پتلی۔ اور مومنہ ایسی کہ ہندو کے ہاتھ کا پانی نہیں پیتی ــــ" مسز انصاری نے تعریف کی۔

ڈاکٹر صدیقی سارے وقت گھاس پر کرسی بچھائے باجی کو جانے کون سی داستان امیر حمزہ سنانے میں مشغول رہتی تھیں، اور فقیرا کی بھاوج کو دیکھ کر انھوں نے کہا تھا "کیسی خوش نصیب عورت ہے۔"

جب ڈاکٹر صدیقی صبح سے شام تک ایک ہی جیسی سنجیدہ اور غم ناک شکل بنائے بیٹھی رہتیں تو ان کو محظوظ کرنے کے لیے باجی مجھے بلاتیں (گویا میں کوئی تماشا دکھانے والی بھالو تھی) اور حکم دیتیں۔ فلاں گیت گاؤ۔ فلاں قصہ سناؤ زبیدہ آپا کو، ذرا بھاگ کے اپنی دوستوں

کو بلاؤ اور سب مل کر ناچو—

ایک دن ڈاکٹر صدیقی پچھلے لان پر بیٹھی باجی سے کہہ رہی تھیں "مرے کے لیے تو صبر آجاتا ہے، ریحانہ خاتون — زندہ کے لیے صبر کیسے کروں —" اور اس دن جب انھوں نے کسی طرح مسکرانے کا نام ہی نہ لیا تو باجی نے مجھے بُلا کر حکم دیا —"ارے رے. ذرا وہ اپنے مسخرے پن کا اینگلو انڈین گیت تو سُناؤ زبیدہ آپا کو—"

"بہت اچھا" میں نے فرمانبرداری سے جواب دیا- اور سیدھی کھڑی ہو کر ہاتھ گھٹنوں تک چھوڑ کر (جس طرح اسکول میں انگریزی گانے گاتے یا نظمیں پڑھتے وقت کھڑا ہونا سکھلایا گیا تھا) میں نے گیت شروع کیا:

ایک بار ایک سوداگر شہر لندن میں تھا
جس کی ایک بیٹی نام ڈائنا اس کا
نام اس کا ڈائنا سولے برش کا عمر
جس کے پاس بہت کپڑا — اور — چاندی — اور —

دفعتاً میرے حلق میں کوئی چیز سی آ اٹکی، میری آواز رُندھ گئی اور میں گیت ادھورا چھوڑ کر وہاں سے تیزی سے بھاگ گئی. ڈاکٹر صدیقی حیرت سے مجھے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئیں-

---

شام کو میں نے دملا سے کہا— "یہ زبیدہ آپا ہر وقت مجھے اتنی پریشان کیوں نظر آتی ہیں —"

"مجھے معلوم ہے" دملا نے جواب دیا. وہ مجھ سے ذرا بڑی تھی. اور ایک ماہر فن ڈیٹکٹیو تھی — "کل صبح آنٹی فاروقی آنٹی گوسوامی کو انگلش اسٹورز میں بتا رہی تھیں کہ ایک سائنٹسٹ ہیں. ان کا نام بھی ڈاکٹر کچھ ہے. مجھے یاد نہیں آرہا. آنٹی فاروقی نے آنٹی گوسوامی کو بتایا تو تھا — تو وہ کلکتہ یونی ورسٹی میں زبیدہ آپا کے کلاس فیلو تھے.

اور جب زبیدہ آپا ولایت گئی تھیں تو وہاں مانچسٹر یونیورسٹی میں بھی کئی سال ان کے ساتھ پڑھا تھا — تو یہ زبیدہ آپا جو ہیں، تو یہ پچھلے پندرہ برس سے ڈاکٹر کے نام کی مالا جپ رہی ہیں۔"

"یہ کسی کے نام کی مالا کیسے جپتے ہیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"یہ پتا نہیں۔" وملا نے جواب دیا۔

جب میں گھر کے اندر آئی تو زبیدہ آپا کو غفور بیگم سے تبادلۂ خیالات کرتے پایا۔ اور تبھی یہ پتا چلا کہ جس ریاست میں زبیدہ آپا کام کرتی ہیں وہ اجمیر شریف کے بہت قریب ہے۔ اور اسی وجہ سے زبیدہ آپا بہت مذہبی ہوگئی ہیں، اور جب سے ان کو یہ اطلاع ملی ہے کہ ڈاکٹر محمود خاں خود ان کی یعنی زبیدہ آپا کی سگی بھتیجی سائرہ سے شادی کرنا چاہتے ہیں جو ایک بے حد خوب صورت سترہ سالہ لڑکی ہے اور کلکتہ کے ورتھوا دُس میں پڑھ رہی ہے، تب سے زبیدہ آپا نماز پنجگانہ کے علاوہ چاشت اشراق اور تہجد بھی پڑھنے لگی ہیں اور یہاں وہ غفور بیگم سے پنجسورہ شریف۔ دعائے گنج العرش اور درودِ تاج کے کتابچے مستعار لے کے پڑھا کرتی تھیں۔ کیوں کہ یہ کتابچے سفر پر چلتے وقت وہ گھر پر بھول آئی تھیں۔ غفور بیگم نے ان سے کہا کہ بٹیا روز رات کو سوتے وقت تسبیح فاطمہؓ پڑھا کیجیے — چنانچہ ایک مرتبہ جب وہ کھانے کے بعد اپنے کمرے میں بیٹھی تسبیح پھیر رہی تھیں تو میں نے، جو جا نری پر لگی ہوئی تھی ان کو دیکھ لیا اور صبح کو وملا کو اطلاع دی —

"ہمیں معلوم ہوگیا — کل رات زبیدہ آپا ڈاکٹر کھچ کے نام کی مالا جپ رہی تھیں ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔"

ایک رات دو بجے کے قریب مہمان کمرے سے ایک دلخراش چیخ کی آواز آئی۔ سب لوگ ہڑبڑا کر اپنے اپنے لحافوں سے نکلے اور بھاگتے ہوئے مہمان کمرے کی طرف گئے۔ مگر دروازہ اندر سے بند تھا۔ باجی نے کواڑوں پر زور زور سے دستک دی۔ اندر سے کچھ منٹ بعد زبیدہ

آپا نے بڑی کمزور آواز میں بولیں "ٹھیک ہوں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم لوگ خدا کے لیے فکر نہ کرو۔ جاؤ، سو جاؤ — میں بالکل ٹھیک ہوں — سوتے میں ڈر گئی تھی"۔

"زبیدہ آپا — دروازہ کھولیے"۔ باجی نے چلا کر کہا۔

"چلے جاؤ تم لوگ — ورنہ میں پھر چیخوں گی —" زبیدہ آپا اندر سے ہسٹریائی آواز میں دہاڑیں۔

صبح کو اُن کا چہرہ بالکل اُترا ہوا اور سفید تھا۔ ناشتے کے بعد جب کھانے کا کمرہ خالی ہوگیا تو انھوں نے باجی کو آہستہ سے مخاطب کیا۔ "میں نے کسی کو بتایا نہیں تھا — میں ایک چلّہ کر رہی تھی انتالیس راتیں پوری ہو چکی تھیں۔ کل چالیسویں اور آخری رات تھی۔ حکم تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے، میں اس جلالی وظیفے کے دوران میں مڑ کر نہ دیکھوں ورنہ اس کا سارا اثر ختم ہو جائے گا۔ اور کل رات — دو بجے کے قریب وظیفہ پڑھتے میں میں نے اچانک دیکھا کہ جانماز کے سامنے ایک گدھے کی جسامت کا ہیبت ناک سیاہ کتا میرے مقابل میں بیٹھا دانت نکوس رہا ہے — میں نے دہل کر چیخ ماری اور چلّہ ٹوٹ گیا۔ کتا غائب ہوگیا۔ مگر میرا سارا کیا کرایا اکارت گیا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا —" ان کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے اور انھوں نے عینک اتار کر پلکیں خشک کیں۔ باجی ہکا بکا ہو کر انھیں دیکھنے لگیں —

"مگر زبیدہ آپا — آپ تو — آپ تو سائنسداں ہیں۔ مانچسٹر یونی ورسٹی سے پڑھ کر آئی ہیں۔ اور ایسی توہم پرستی کی باتیں کرتی ہیں۔ ہوش کی دوا کیجیے۔ آپ کو ہیلوسی نیشن Hallucination ہوا ہوگا — گدھے کے برابر کتا — اور وہ آپ سے آپ غائب بھی ہوگیا —!" اتنا کہہ کر باجی کھلکھلا کے ہنس پڑیں۔

"ریحانہ خاتون —" ڈاکٹر صدیقی نے سر نیہوڑا کر باجی کو گہری نظر سے دیکھا اور آہستہ آہستہ کہا "تم ابھی صرف بائیس برس کی ہو۔ تمھارے ماں باپ اور محبت کرنے

والے چچاؤں کا سایہ تمھارے سر پر قائم ہے۔ تم ایک بھرے پُرے کنبے میں، اپنے چہیتے بہن بھائیوں کے ساتھ، سکھ کی چھاؤں میں زندہ ہو۔ اپنی پسند کے نوجوان سے تمھارا بیاہ ہونے والا ہے — ساری زندگی تمھاری منتظر ہے، دنیا کی ساری مسرتیں تمھاری راہ دیکھ رہی ہیں۔ خدا نہ کرے تم پر کبھی ایسی قیامت گزرے جو مجھ پر گزر رہی ہے۔ خدا نہ کرے کہ تمھیں کبھی تنِ تنہا اپنی تنہائی کا مقابلہ کرنا پڑے — کسی کی بے بسی اور اس کے دُکھی دل کا مذاق نہ اُڑاؤ —" اچانک ان کی نظر مجھ پر پڑگئی جو مینز کے سرے پر بیٹھی مستعدی سے جاسوسی میں مصروف تھی۔ کیوں کہ گدھے کے برابر سیاہ کتا ایک انتہائی سنسنی خیز واقعہ تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ خاموش ہوگئیں۔ باجی نے پلکیں جھپکا کر مجھے اشارہ کیا کہ میں اُڑنچھو ہو جاؤں۔ چنانچہ میں اُڑنچھو ہوگئی۔

اس واقعے کے دوسرے دن ڈاکٹر صدیقی کلکتہ روانہ ہوگئیں۔ اور اُن کے جانے کے چند روز بعد ہی ایک انوکھی اور بن بُلائی مہمان آن اُتریں۔

ڈالن والا کی سڑکیں عموماً خاموش پڑی رہتی تھیں۔ اِکا دُکا راہگیر یا موٹروں اور تانگوں کے علاوہ کبھی کبھار کوئی سکھ جوتشی ہاتھ میں سرٹیفکیٹوں کا میلا سا پلندہ سنبھالے اِدھر اُدھر تاکتا سامنے سے گزر جاتا تھا۔ یا موٹے موٹے "چائنامین" زین میں بڑی نفاست سے بندھے ہوئے بے حد وزنی گٹھر سائکلوں پر لادے چکّر کاٹا کرتے تھے، یا کشمیری قالین فروش یا بزاز یا قیمتی پتھر فروخت کرنے والا پھیری لگا جاتے تھے۔

مسٹر پیٹر رابرٹ سردار خاں ان ہی پھیری والوں میں سے ایک تھے۔ مگر وہ اپنے آپ کو ٹریولنگ سیلز مین کہتے تھے۔ اور انتہا سے زیادہ چرب زبان اور لسّان آدمی تھے۔ موصوف مسلمان سے عیسائی ہوگئے تھے۔ ترکی ٹوپی اوڑھتے تھے اور سائکل پر پلاسٹک کے برتن بیچتے گھوما کرتے تھے، اور مہینے دو مہینے میں ایک بار ہماری طرف کا پھیرا لگا جاتے

تھے۔ وہ اپنی ہر بات کا آغاز "خدا باپ کا شکر ہے" سے کرتے تھے اور کبھی کبھی تبلیغ بھی شروع کر دیتے تھے۔

اس دن مسٹر پیٹر رابرٹ سردار خاں جو سائکل برساتی میں ٹکا کر برآمدے میں داخل ہوئے تو انھوں نے ناک کی سیدھ جاکر مہمان کمرے کے اندر جھانکا جس کا دروازہ کھلا پڑا تھا اور اطمینان سے اظہارِ خیال کیا ——

"ہوں۔ تو یہ کمرہ تو ہمیشہ خالی ہی پڑا رہتا ہے —— بات یہ ہے کہ میری ایک بہن ہیں۔ وہ لیڈی ڈاکٹر ہیں۔ اور چند روز کے لیے دہرہ دون آ رہی ہیں۔" اس کے بعد جواب کا انتظار کیے بغیر وہ سائکل پر بیٹھ کر غائب ہو گئے۔

تیسرے روز جاپانی جارجٹ کی ملاگیری ساری میں ملبوس ایک بے حد فربہ خاتون تانگے سے اُتریں۔ مسٹر سردار خاں سائکل پر ہمرکاب تھے۔ انھوں نے اسباب اُتار کر مہمان کمرے میں پہنچایا اور والدہ اور باجی سے ان کا تعارف کرایا ——"یہ میری بہن ہیں۔ آپ کے یہاں دو تین دن رہیں گی۔ اچھا' اب میں جاتا ہوں۔" پھر خاتون کو مخاطب کیا۔ "بھئی تم کو جس چیز کی بھی ضرورت ہو بلا تکلف بیگم صاحبہ سے کہہ دینا —— اپنا ہی گھر سمجھو' اچھا —— بائی بائی ——" اور سائکل پر بیٹھ کر یہ جا وہ جا۔

یہ ایک مسلمان بی بی تھیں' جنھوں نے یہ نہ بتایا کہ کہاں سے آ رہی ہیں اور کہاں جائیں گی۔ محض اس امر سے انھوں نے آگاہ کیا کہ پرائیوٹ طور پر ہومیوپیتھک ڈاکٹری پڑھ رہی ہیں۔ اور شام کے وقت اپنے اٹیچی کیس میں سے ایک موٹی سی اُردو کتاب نکال کر دکھائی جو ان کی ہومیوپیتھک ڈاکٹری کا کورس تھا۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ "دی رائل تحفہ ہارمونیم گائیڈ سیریز" کے رسالوں کے ذریعے انھوں نے اس فن میں بھی مہارت حاصل کر لی ہے۔ اور انھوں نے "اے ماؤ' بہنو' بیٹیو' دُنیا کی عزت تم سے ہے" سپاٹ اور بے سُری آواز میں باجے پر گا کر سنائی۔ انھوں نے یہ بھی واضح کیا کہ وہ آزادیِ نسواں کی قائل ہیں اور اپنی

مرضی سے کتخدائی کریں گی ۔ تیسرے روز مسٹر سردار خاں دوبارہ نمودار ہوئے ۔ وہ تانگہ ساتھ لے کر آئے تھے جس میں بٹھا کر ہومیوپیتھک لیڈی ڈاکٹر کو ہمراہ لے گئے ۔

مسٹر پیٹر رابرٹ سردار خاں اس کے بعد کبھی نہ آئے ۔

دنیا میں بڑے عجیب و غریب واقعات ہوا کرتے تھے ۔

نیگس ہمارا سیاہ رنگ اور سفید کانوں والا بدشکل اور چھوٹا سا دوغلا کتا تھا ۔ وہ دن بھر برساتی کے کونے میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہتا تھا ۔ چونکہ وہ نجس تھا ، یعنی کتا تھا اس لیے اسے گھر کے اندر آنے کی اجازت نہ تھی ۔ جاڑوں میں وہ ایک کوٹھری میں پڑے ہوئے اپنے کھٹولے پر سو رہتا ۔ ریشم کو ہاں نکال کر اس پر غراتی تو وہ اس کا بھی بُرا نہ مانتا ۔ وہ بے حد وفادار اور نجابت مرنج طبیعت کا مالک ۔ اور اپنی قسمت پر شاکر و قانع تھا کیونکہ خدا نے اسے ایک نجس کتا ہی پیدا کیا تھا ۔ وہ جانتا تھا کہ ریشم کی اس گھر میں بے حد قدر و قیمت ہے ۔ اسے اس حقیقت کا بھی علم تھا کہ اس کمینی دنیا میں محض ظاہری رنگ و روپ کی قدر کی جاتی ہے ۔ ایک رواقی فلسفی کی مانند آنکھیں بند کیے وہ غالباً دن بھر یہی سب سوچتا رہتا تھا اور اجنبی قدموں کی چاپ سنتے ہی آنکھیں کھول کر فوراً بھونکنا شروع کر دیتا تھا ۔ وہ اٹلی اور حبشہ کی جنگ کے زمانے میں میجر شیلٹن کی اعلانسل کتیا میگی کے یہاں پیدا ہوا تھا ، میجر شیلٹن چونکہ بین الاقوامی سیاست سے گہری دلچسپی رکھتے تھے اس لیے انھوں نے اس کا نام نیگس رکھا تھا ۔

جس روز باجی نے اپنی چند سہیلیوں کو چائے پر بُلایا تو بجلی کا ایک تار روشنی کے انتظام کے لیے باغ میں پہنچا دیا گیا تھا ۔ اس روز موسم بہت خوش گوار تھا اور باجی اور ان کی سہیلیاں غروب آفتاب کے بعد تک اوور کوٹ پہنے باہر ٹہلتی رہی تھیں ۔ پارٹی کے بعد باجی اپنے مہمانوں کو رخصت کرنے کے لیے ٹہلتی ہوئی سڑک پر چلی گئیں اور نیگس

برآمدے میں رکھے ہوئے دعوت کے سامان کی حفاظت کے لیے مستعدی سے سیڑھیوں پر بیٹھا رہا۔ جب باجی واپس آئیں تو انھوں نے جھک کر دور سے ٹیگس کو پکارا۔ ٹیگس اس خلاف توقع اور غیر معمولی اظہار التفات سے بے انتہا خوش ہوا۔ اور زور زور سے اُچھلنے کودنے لگا اور باجی کو مزید خوش کرنے کے لیے اس نے وہ سارے کھیل تماشے دکھانے شروع کیے جو اسے برکت مسیح جمعدار نے سکھلائے تھے۔ اس طرح کھیلتے کھیلتے اس نے پام کے گملوں کے عقب میں پڑا ہوا بجلی کا تار منہ میں اُٹھا لیا۔

تار میں کرنٹ موجود تھا۔ لہٰذا ٹیگس پٹ سے گر گیا۔ اور چند منٹ بعد اس کے منہ سے دھواں نکلا۔ کیوں کہ بجلی نے اسے اندر سے جلا دیا تھا۔

ایک روز ڈاکٹر زبیدہ صدیقی کا خط باجی کے نام کلکتے سے آیا۔ انھوں نے لکھا تھا:

"۔۔جس روز میں یہاں پہنچی اسی ہفتے میں محمود صاحب نے میری بھتیجی سائرہ سے شادی کرلی۔ بڑی دھوم کی شادی ہوئی ہے۔ تم نے السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا میں دولھا دلھن کی تصویر بھی دیکھی ہوگی۔

پی۔ ایس:۔ میں نے اب اللہ میاں کے خلاف اسٹرائک کر دیا ہے اور پرسوں میں نے بھی ڈاکٹر اُپل سے سول میرج کرلی۔ ڈاکٹر اُپل بردوان کالج میں پڑھاتے ہیں۔

پی۔ پی۔ ایس:۔ ڈاکٹر اُپل ہندو ہیں۔

یہ اطلاع کہ میں نے ایک کافر سے شادی کرلی مسز فاروقی، مسز قریشی اور مسز انصاری کو بھی دے دینا۔

دعا گو

زبیدہ اُپل"

دسمبر کے پہلے ہفتے میں جل دھرا کی حالت دفعتاً زیادہ بگڑ گئی۔ اسے فوراً ہسپتال

پہنچایا گیا جہاں دوسرے دن اس نے پران تج دیے۔

فقیرا دھاڑیں مار مار کر روتا پھرا "صبر کر بچے۔ صبر کر۔" غفور بیگم نے اسے دلاسا دیا۔

"اناجی۔ صبر کیسے کروں۔ میرے لیے ماں تھی تو وہ۔ بھاوج تھی تو وہ۔ بیوی تھی تو وہ۔"

اور وہ روتا دھوتا پھر باہر چلا گیا۔

مگر تیسرے دن پھول چننے کے بعد جب وہ شمشان گھاٹ سے واپس لوٹا تو بہت خوش تھا۔ اس نے ہاتھ میں مٹی کا ایک کونڈا اٹھا رکھا تھا جس میں جل دھرا کی راکھ تھی اور اس نے کہا کہ رات میں اسے اپنے سرہانے رکھ کر سوؤں گا اور جل دھرا نے جس جون میں جنم لیا ہوگا اس کے پیروں کے نشان راکھ پر بن جائیں گے۔"

جیسا کہ میں پہلے بتا چکی ہوں، باجی ایم۔ اے کے لیے فلسفے کا مطالعہ کر رہی تھیں اور بہت زیادہ قابل تھیں۔ فقیرا کی بات انھوں نے بڑی دل چسپی سے سنی اور رات کو کھانے کی میز پر بہت دیر تک مسئلۂ تناسخ اور عوام کے توہمات کے متعلق والد سے تبادلۂ خیالات کرتی رہیں۔

رات کو سونے سے پہلے فقیرا نے اپنی کوٹھری کی کنڈی اندر سے چڑھائی اور راکھ کا کونڈا چارپائی کے نیچے رکھ کر سو گیا۔

صبح سویرے وہ بے حد خوش خوش کھانے کے کمرے میں داخل ہوا۔ فرطِ انبساط سے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے: "بیگم صاحب — بڑی بٹیا — بی بی —" اس نے اطلاع دی — "میری جل دھرا گوریا بن گئی —"

"گوریا بن گئی — ؟" باجی نے دہرایا، اور جلدی سے شال لپیٹ کر شاگرد پیشے کی طرف دوڑیں — میں بھی ان کے پیچھے پیچھے سرپٹ بھاگی۔

فقیرا کوٹھری میں سے کونڈا باہر لایا "بڑی بٹیا — دیکھ لیجیے — یہ دیکھیے —

یہ دیکھیے — " میں نے اور باجی نے آنکھیں پھاڑ کر راکھ کو دیکھا جس پر چڑیا کے پنجوں کے نشان بہت واضح بنے ہوئے تھے۔

"گوریا چڑیا ہے۔ بڑی ڈیٹیا — بی بی —" اس نے کہا اور کونڈا بڑی احتیاط سے اندر لے گیا۔

اس کے بعد سے فقیرا روز صبح کو گوریا چڑیوں کو دانا ڈالتا۔ ان کے لیے پانی کی کوڑیاں بھر بھر کر رکھتا اور اگر کوئی گوریا روشندان یا دریچے میں سے کسی کمرے میں داخل ہو جاتی تو وہ سارے کام چھوڑ کر چٹکی بجا بجا کر کہتا — "چہ چہ چہ — آہ — آہ — آہ — لے — لے — لے —" اور باجرے کے دانے ہتھیلی پر ڈال کر ساکت کھڑا رہتا۔ اس مقصد کے لیے وہ باجرے کے دانے ہمیشہ جیب میں رکھتا تھا اور اب اُسے مستقل یہ تشویش رہتی تھی کہ ریشم کسی گوریا کو نہ پکڑ لے۔

اس سال چلّے کا جاڑا پڑا تھا۔ ڈاکنا روز ابھی ہسپتال میں داخل تھی۔ مسٹر بکیٹ اب میونسپلٹی کے نل پر بھی نظر نہ آتے۔ اب وہ دن بھر پریڈ گراؤنڈ کی ایک بنچ پر دھوپ میں سر جھکائے بیٹھے رہتے۔ اور اسی طرح بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگتے۔ ان کی ٹوپی ان کے پاس بنچ پر کاسۂ گدائی کی طرح رکھی رہتی۔ اور درختوں کے زرد پتے گر گر کر اس میں جمع ہوتے رہتے۔

کرسمس نزدیک آگئی۔ کیرل گانے والوں کی ٹولیاں رات کے وقت ڈالن والا کی سڑک پر گھوم گھوم کر اکارڈین اور گٹار پر ولادتِ مسیحؑ کے گیت گاتی پھرتیں۔ صبح منہ اندھیرے کوئلہ بیچنے والے پہاڑیوں کی آوازیں آتیں جو چیتھڑوں اور گدڑیوں میں ملبوس کوئلے کی بھاری کنڈیاں نواڑ کی پٹی کے ذریعے ماتھے سے باندھے "کوئلہ چاہیے کوئلہ —" چلّاتے پھرتے۔ سورج اوپر آتا تو سامنے ہمالیہ کا برف پوش سلسلہ کرنوں میں جگمگا اُٹھتا۔

رات کو جتنا پانی نقیرا چڑیوں کے لیے باہر رکھتا تھا وہ صبح کو جما ہوا ملتا۔ رات گئے کسی پہاڑی راہگیر کی بانسری کی آواز کہرے میں تیرتی ہوئی سُنائی دے جاتی۔

کرسمس سے ایک دن پہلے سائمن نے بتایا کہ وہ صبح سویرے اُٹھ کر اسٹوو پر کرسمس پڈنگ تیار کرتے ہیں، گرجا جاتے ہیں۔ اور اس کے بعد اپنی کوٹھری میں بیٹھ کر دن بھر انجیلِ مقدس پڑھتے ہیں۔ اور کرسمس کے دوسرے روز وہ پڈنگ لے کر آئیں گے۔ بڑے دن کے تحفے کے طور پر وہ باجی کے لیے گلابی نقلی موتیوں کا ننھا سا ہار، میرے لیے بالوں کے دو سُرخ اور سبز ربن اور رشیم کے لیے ربر کی چھوٹی سی رنگین گیند لائے تھے۔ انھیں بڑے دن کے تحفے کے طور پر دس روپے دیے گئے، جو ان کے لیے اتنی بڑی اور غیر متوقع رقم تھی کہ وہ چند لمحوں تک دس کے نوٹ کو آنکھیں پھاڑے دیکھتے رہے اور پھر ذرا کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اسے احتیاط سے اندر واسکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔

کرسمس کو تین دن گزر گئے مگر سائمن نہ آئے۔ چوتھے دن ان کی خیر خبر لانے کے لیے نقیرا کو پادری اسکاٹ کے گھر بھیجا گیا۔ اس نے واپس آکر سر جھکا لیا اور آہستہ سے کہا — "سائمن صاحب کی مٹی ہوگئی۔ پادری صاحب کا مالی بتا رہا تھا کہ بڑے دن کے روز اس نے کوٹھری کا دروازہ کھولا تو سائمن صاحب چارپائی پر مرے ہوئے پڑے تھے۔ انھیں سردی لگ گئی۔

"ان کے پاس ایک ہی کمل تھا بیگم صاحب — رات کو وہی کوٹ پتلون پہنے پہنے سوتے تھے۔"

"بڑا جاڑا پڑ رہا ہے بڑی بٹیا۔ ہمارے ہاں گڑھوال میں تو لوگ باگ اکثر سردی سے اکڑ اکڑ مرتے رہتے ہیں، اب اتنا گرم کپڑا کہاں سے لاؤ۔ سردی تو ہر سال ہی پڑتی ہے۔"

تیسرے پہر کو جب سائمن کے آنے کا وقت ہوا تو ریشم جو سردی کی وجہ سے پچھلے ایک ہفتے سے اپنی ملائم پشمینے کی شال میں لپٹی ٹوکری کے نرم و گرم گدیلوں میں سمٹی سمٹائی بیٹھی رہتی تھی۔ ٹوکری سے اتر کر لنگڑاتی لنگڑاتی پھاٹک کی طرف چلی گئی اور پلیا پر بیٹھ کر انتظار میں مصروف ہو گئی۔ کیونکہ سائمن روزانہ راستے میں میجر شیلٹن کے باورچی خانے سے مرغوں اور پرندوں کی مزے دار ہڈیاں اپنے میلے سے رومال میں احتیاط سے لپیٹ کر اس کے لیے لایا کرتے تھے۔

سائمن نہ آئے۔ دھوپ مدھم پڑ گئی۔ تو اس نے اکتا کر، اندر واپس آنے سے پہلے ایک گوریا چڑیا پر تاک لگائی۔ گوریا پھر سے اڑ کر سلوداک کی شاخ پر جا بیٹھی۔ ریشم نے اس کے تعاقب میں درخت پر چڑھنا چاہا مگر اپنی شکستہ ٹانگ کی وجہ سے جڑ پر سے پھسل کر نیچے آ رہی۔ گوریا پھدک کر اس سے اونچی شاخ پر چلی گئی۔ ریشم نے منہ اٹھا کر بڑی بے کسی سے کمزور سی میاؤں کی۔ گوریا نے پر پھیلائے اور کھلے، نیلے آسمانوں کی سمت اڑ گئی۔

جلاوطن

سُندر لالہ۔ سجے دُلالہ۔ ناچے سری ہری کیرتن میں۔
ناچے سری ہری کیرتن میں۔
ناچے۔

چوکھٹ پر اکڑوں بیٹھی رام رکھی نہایت انہاک سے چاول صاف کر رہی تھی۔ اس کے گانے کی آواز دیر تک نیچے سُرخ گمٹوں والی سنسان گلی میں گونجا کی۔ پھر ڈاکٹر آفتاب رائے صدر اعلا کے چبوترے کی سمت سے بڑے پھاٹک کی سمت آتے دکھلائی پڑے۔

"بندگی بھیّن صاحب —" رام رکھی نے گھونگھٹ اور زیادہ طویل کر کے آواز لگائی۔

"بندگی — بندگی —" ڈاکٹر آفتاب رائے نے زینے پر پہنچتے ہوئے بے خیالی سے جواب دیا۔

"واجی کھُسی ہو بھیّن صاحب —" رام رکھی نے اخلاقاً دریافت کیا۔

"اور کیا — مجھے کیا ہوا ہے جو راضی خوشی نہ ہوں گا۔ یہ سُوپ ہٹا بیچ میں سے۔" انھوں نے جھنجھلا کر کہا۔

"بھیّن صاحب ناچ پھنک رہی تھی "

"تو ناچ پھنکنے کے لیے تجھے گاڑی بھر راستہ چاہیے۔ چل ہٹا سب چیز۔"

ڈاکٹر آفتاب رائے نے دنیا بھر کی ڈگریاں توڑ ڈالی تھیں۔ لیکن حالت یہ تھی کہ ذری ذری سی بات پر بچوں کی طرح خفا ہو جایا کرتے تھے۔ رام رکھی پر برستے ہوئے وہ اوپر آئے اور مونڈھے پر بیر ٹکا کر انھوں نے اپنی بہن کو آواز دی۔ جیجی۔ جی ای ای ـــــ جی ای ای ـــ (چھوڑا ہے اب تلک مورا بھیّن ـــ ہیم کرن پیار سے کہا کرتیں) دالان کے آگے کھلی چھت پر نیم کی ڈالیاں منڈیر پر جھکی پچھوا ہوا میں سرسرا رہی تھیں۔ شام کی گہری کیفیت موسم کی اداسی کے ساتھ ساتھ سارے میں بکھری تھی۔ دن بھر نیچے مہوے کے باغ میں شہد کی مکھیاں بھنبھنایا کرتیں اور ہر چیز پر غنودگی ایسی چھائی رہتی۔ آم اب پیلے ہو چلے تھے۔ "ٹھکرائن کی بگیا" میں صبح سے لے کر رات گئے تک روں روں کرتا رہٹ چلا کرتا۔

"آوت ہیں بھیّن صاحب ـــ" ہیم کرن نے دالان کا پیتل کے نقش و نگار والا کواڑ کھولتے ہوئے غلّے کے گودام میں سے باہر آ کر جواب دیا۔ اور کنجیوں کا گچھا ساری کے پلّو میں باندھ کر چھن سے پشت پر پھینکتی ہوئی صحنچی میں آ گئیں

"جے رام جی کی بھیّن صاحب ـــ" رسوئیے نے چوکے میں سے آواز لگائی "کٹھل کی ترکاری کھیو بھیّن صاحب ـــ؟"

"ہاں۔ ہاں ضرور کھیبا بھائی ـــ" ڈاکٹر آفتاب رائے مونڈھے پر سے ہٹ کر ٹہلتے ہوئے تلسی کے چبوترے کے پاس آ گئے۔ صحنچی میں رنگ برنگی مورتیاں اور گول پتھر سالگ رام سے لے کر بجرنگ بلی مہاراج تک سیندور سے لپی پتی گنگا جل سے نہائی دھوئی قرینے سے سجی تھیں۔ ہیم کرن تھیں تو بڑی پکی رام بھگت۔ لیکن باقی کے سبھی دیوی دیوتاؤں سے سمجھوتہ رکھتی تھیں کہ نہ جانے کون کس سمے آڑے آ جائے۔

سب سے بنائے رکھنی چاہیے۔ ابھی سرین رماکانت کھیل کے میدان سے لوٹیں گے۔ آٹھ بجے کھیما کھٹک کے توڑے سیکھ کر جمنا مہراج کے ہاں سے واپس آئے گی۔ پھر چوکے میں کھانا پروسا جائے گا۔ (پیتل کے برتن ٹھنڈی چاندنی میں جھلملائیں گے۔ نیچے آنگن میں رام رکھی کوئی لگری شروع کر دے گی) یہاں پر بالآخر امن تھا اور سکون۔

اب کھیم نیچے پکے گلیارے میں سے چلتی ہوئی اوپر آ رہی تھی (ٹھکرائن کی بگیا میں سے ابھی اس نے کروندے اور کمرکھیں اور مکوہ توڑ کر جلدی جلدی منہ میں ٹھونسے تھے) دھاکر دادھی ناکت تا — دھاکر دا — ارے باپ رے۔ اس نے منڈیر پر سے اوپر جھانک کر مینتی سے کہا — ماما آئے ہیں۔ بھاگ جاؤ ورنہ ماما مجھے ماریں گے کہ ہر سمے کھیلتی ہے — مینتی بھاگ گئی۔

کھیم چھت پر آئی۔ لمبے سے ڈھیلے ڈھالے فراک میں ملبوس، جس پر موتیوں سے خوب تتلیاں اور پھول پتے ٹنکے تھے، کھینچ کر بالوں کی مینڈھیاں گوندھے، ہاتھوں میں چھن چھن چوڑیاں بجاتی کھیم وتی رائے زادہ اپنے اتنے پیارے اور اتنے سندر ماما کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئی۔

"نمستے ماما — ابھی کتاب لاتی ہوں بس ذرا منہ ہاتھ دھو آؤں۔"

"چل چڑیل — بہانے باز — سبق سُنا پہلے —" ڈاکٹر آفتاب رائے نے پیار سے کہا (لیکن یہ کچھ تجربہ انھیں تھا کہ اپنے سے کم عمر لوگوں سے اور کنبہ برادری والوں سے یہ گرہستی اور لاڈ پیار کے مکالمے وہ زیادہ کامیابی سے ادا نہ کر پاتے تھے)۔

"تجھے تو میں انٹرمیڈیٹ میں بھی حساب دلاؤں گا۔ دیکھتی جا —" انھوں نے پھر بزرگ بننے کی سعی کی۔

"ارے باپ رے — !!" کھیم نے مصنوعی خوف کا اظہار کیا۔

"اور تو نے چوڑیاں تو بہت خوبصورت خریدی ہیں ری —"

"ہی ہی ہی — ماما —" کھیم نے دلی مسرت سے اپنی چوڑیوں کو دیکھا۔

"اور تو ساری تو پہنا کر، کہ فراک ہی پہنے پھرے گی — باؤلی سی —" (انھوں نے اپنی بُزرگی کا احساس خود اپنے اوپر طاری کرنا چاہا)

"جی ماما —" کھیم کے ذہن میں وہ ساریاں جھما جھم کرتی کوند گئیں، جو ماں کے صندوقوں میں ٹھنسی تھیں۔ وہ تو خدا سے چاہتی تھی کہ کل کی بجائے آج ہی وہ ساریاں پہن ڈالے۔ مگر ہیم کرن ہی پر انگریزیت سوار تھی۔ ایک تو وہ یہ نہیں بھولی تھیں کہ تھیں تو وہ جون پور کے اس ٹھیٹھ، دقیانوسی سریواستوا گھرانے کی بٹیا — پر ان کا بیاہ ہوا تھا الٰہ آباد کے اتنے فیشن ایبل کنبے میں جس کے سارے افراد سول لائنز میں رہتے تھے۔ اور جوتے پہنے پہنے کھانا کھاتے تھے اور مسلمانوں کے ساتھ بیٹھ کر چائے پانی پیتے تھے۔ ودھوا ہوئے اب ان کو سات برس ہونے آئے تھے اور تب سے وہ میکے ہی میں رہتی تھیں۔ لیکن محلے پر ان کا رُعب تھا۔ کیوں کہ الٰہ آباد کے رائے زادوں کی بہو تھیں — دوسرے یہ کہ یہ فراک کا فیشن ڈاکٹر سین گپتا کے ہاں سے چلا تھا۔ ڈاکٹر سین گپتا ضلع کے سول ہسپتال کے اسسٹنٹ سرجن تھے۔ اور ہسپتال سے ملحق ان کے پیلے رنگ کے اُجاڑ سے مکان کے سامنے ان کی پانچوں بیٹیاں رنگ برنگے فراک پہنے دن بھر اُودھم مچایا کرتیں۔ شام ہوتی تو آگے آگے ڈاکٹر سین گپتا دھوتی کا پلّا نہایت نفاست سے ایک انگلی میں سنبھالے، ذرا پیچھے ان کی بی بی سُرخ کنارے والی سفید ساری پہنے، پھر پانچوں کی پانچوں لڑکیاں سیدھے سیدھے بال کندھوں پر بکھرائے چلی جا رہی ہیں۔ ہوا خوری کرنے۔ اُفوہ۔ کیا ٹھکانہ تھا بھلا بس ہر بنگالی گھرانے میں یہ لڑکیوں کی فوج دیکھ لو۔ ہیم کرن کو ڈاکٹر سین گپت سے بڑی ہمدردی تھی۔ کھیم کی ان سب سے بہت گھٹتی تھی۔ خصوصاً مونڈیرا سے۔ اور اسکول کے ڈرامے کے دنوں میں تو بس کھیم اور مونڈیرا ہی سب پر چھائی رہتیں۔ کیا کیا ڈرامے مہادیوی کنیّا پاٹھ شالہ نے نہ کر ڈالے — "نل دمینتی" اور "شکنتلا ہریش چندر"

اور "راج رانی میرا"۔ اور اوپر سے ڈانس الگ ــــ گربا بھی ہو رہا ہے کہ "آ تیرے گنگا پار تیرے جمنا بیچ میں ٹھاڑے ہیں نندلال"ــــ اور آپ کا خدا بھلا کرے رادھا کرشنا ڈانس بھی پنیجیے کہ میں تو گردھر آگے ناچوں گی ــــ جی ہاں۔ اور وہ گگری والا ناچ بھی موجود ہے کہ چلو چلو سکھی سکھیاری ری چلو پنگھٹ بھروا پانی ــــ اور ساتھ ساتھ مونڈیرا ایبن گیتا ہے کہ فرّاٹے سے ہارمونیم بجا رہی ہے۔

ایسے ہونے کو تو مسلمانوں کا بھی ایک اسکول تھا۔ انجمن اسلام گرلز اسکول۔ وہاں یہ سب ٹھاٹھ کہاں۔ بس بارہ وفات کی بارہ وفات میلاد شریف ہو جایا کرتا اور اس میں کھڑے ہو کر لڑکیوں نے خاصی بے سُری آوازوں میں پڑھ دیا:

تم ہی فخرِ انبیا ہو۔ یا نبیؐ سلام علیک . چلیے قصہ ختم۔ ایک مرتبہ ایک سرپھری ہیڈ مسٹرس نے جو نئی نئی لکھنؤ سے آئی تھی "روپ متی باز بہادر" خواتین کے سالانہ جلسے میں اسٹیج کروا دیا تو جنابِ عالی لوگوں نے اسکول کے پھاٹک پر پکیٹنگ کر ڈالی اور روزنامہ صدائے حق نے پہلے صفحے پر جلی حروف میں شائع کیا۔

"ملّتِ اسلامیہ کی غیرت کا جنازہ ــــ
گرلز اسکول کے اسٹیج پر نکل گیا

مسلمانو! تم کو خدا کے آگے بھی جواب دینا ہو گا ــــ بناتِ اسلام کو رقص و سرود کی تعلیم ــــ اسکول کو بند کرو"ــــ (یہ سب قصّے کھیم کی مسلمان سہیلی کشوری اُسے سُنایا کرتی تھی جو پڑوس میں رہتی تھی۔) صدر اعلا کے چبوترے کے آگے والے مکان میں۔ وہ اسلامیہ گرلز اسکول میں پڑھتی تھی۔ اس کا بڑا بھائی اصغر عباس، سرین اور رما کانت کے ساتھ ہاکی کھیلنے آیا کرتا تھا۔ ویسے پڑھتے وہ لوگ بھی الگ الگ تھے۔ سرین اور رما کانت ڈی اے وی کالج میں تھے۔ اصغر عباس فیض اسلام کنگ جارج انٹر کالج میں۔

کیوں ری ــــ ایف اے کرنے کہاں جائے گی۔ جولائی آ رہی ہے۔ بنارس جائے گی

یا لکھنؤ —؟" ڈاکٹر آفتاب رائے نے چوکے میں بیٹھے ہوئے سوال کیا۔

اب یہ ایک ایسا ٹیڑھا اور اچانک سوال تھا جس کا جواب دینے کے لیے کھیم وتی ہرگز تیار نہ تھی۔ دونوں جگہوں سے متعلق اسے کافی انفرمیشن حاصل تھی۔ لیکن دوٹوک فیصلہ وہ فی الحال کسی ایک کے حق میں نہ کر سکتی تھی۔ بنارس میں ایک تو یہ کہ چوڑیاں بہت عمدہ ملتی تھیں۔ لیکن لکھنؤ کو بھی بہت سی باتوں میں فوقیت حاصل تھی۔ مثلاً سینما تھے اور دس سیناؤں کا ایک سینما تو خود مہیلا ودّیالہ تھا۔ جہاں اسے بھیجنے کا تذکرہ ماما نے کیا تھا۔ پردہ غالباً اسے بہرصورت ہر جگہ کرنا تھا۔ بآنگے پر پردہ۔ یہاں بھی ہیم کرن اپنے اور اس کے لیے بندھواتی تھیں اور ماما جو اتنا بڑا ڈنڈا لیے سر پر موجود تھے۔

یہ ماما اس کے آج تک پلّے نہ پڑے۔ ولایت سے ان گنت ڈگریاں لے آئے تھے۔ یونی ورسٹی میں پروفیسری کرتے تھے۔ تاریخ پر کتابیں لکھتے تھے۔ فارسی میں شعر کہتے تھے۔ چوں چوں کے مربّا تھے کھیم کے ماما۔

رہے رماکانت اور سرین۔ تو رماکانت تو شاعر آدمی تھا۔ سارے مقامی مشاعروں میں جا کر دو غزلے سہ غزلے پڑھ ڈالتا۔ اور حضرت ناشاد جونپوری کے نام نامی سے یاد کیا جاتا۔ سرین اس کے بالکل برعکس انجینیر تھا۔ اس سال وہ بھی انٹر کر کے بنارس انجینیرنگ کالج چلا جائے گا۔ باقی کے سارے کنبے برادری کے بہن بھائی یوں ہی بکواس تھے۔ اس سلسلے میں اس کی گوئیاں کشوری یعنی کشور آرا بیگم کے بڑے ٹھاٹھ تھے۔ اس کے بے شمار رشتے کے بھائی تھے اور سب ایک سے ایک سُورما۔ یہاں کسی کے سُورما بننے کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ کسی نے آج تک اس سے یہ نہ کہا کہ چل کھیم تجھے سرکس یا نوٹنکی ہی دکھلا دیں —— نوٹنکی کے دنوں میں رسوتیا تک لہک لہک کر گاتا — اب یہی ہے میں نے ٹھانی —

لاؤں گا نوٹن کی رانی ـــ) کہاں کستوری کے ماجد بھائی ہیں تو اس کے لیے لکھنؤ سے چوڑیاں لیے چلے آتے ہیں۔ اکرام بھائی ہیں تو کستوری ان کے لیے چھپا چھپ پُل اوور بُن رہی ہے۔ اشفاق بھائی ہیں تو کستوری کو بیٹھے انگریزی شاعری پڑھا رہے ہیں۔ ان بھائیوں اور کھیم کے بھائیوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ کہاں کی چوڑیاں اور پُل اوور۔ یہاں تو جوتیوں میں دال بٹتی تھی۔

ہیم کرن کو گھر کے کام دھندوں ہی سے فرصت نہ ملتی۔ آفتاب رائے ان کے لیے بڑا سہارا تھے۔ وہ ہر تیسرے چوتھے مہینے لکھنؤ سے آکر مل جاتے۔ رہنے والے ان کے بھتیجے صاحب جون پور ہی کے تھے۔ پر یہاں اُن کی کسی سے ملاقات نہ تھی" ضلع کے روسا اور مقامی عمائدین شہر" میں ان کا شمار تھا۔ پر آپ کا خیال اگر یہ ہے کہ ڈاکٹر آفتاب رائے جون پور کے اُن معززین کے ساتھ اپنا وقت خراب کریں گے تو آپ غلطی پر ہیں۔ حکام سے اُن کی کبھی نہ بنی۔ انٹلکچوئل آدمی تھے۔ ان سول سروس اور پولیس والوں سے کیا دماغ سوزی کرتے۔ جگن ناتھ جین آئی سی ایس جب نیا نیا حاکم ضلع ہو کر آیا تو اُس نے کئی بار ان کو کلب میں بلا بھیجا۔ پر یہ ہرگز نہ گئے۔ رئیس الدین کاظمی ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج نے دعوت کی۔ اس میں بھی نہ پہنچے۔ اور تو اور ولایت واپس جاتے وقت مسٹر چارلس مارٹن نے کوئین وکٹوریہ گورنمنٹ انٹر کالج کی پرنسپل شپ پیش کی لیکن کھیم کے ماما نے اسے بھی رد کر دیا۔ یوں تو خیر کانگریسی وانگریسی ہونا کوئی خاص بات نہیں۔ شہر اور قصبہ جات کا ہر ہندو جو سرکاری ملازم نہ تھا۔ گھر پر ترنگا لگاتا تھا۔ اور ہر مسلمان کے اپنے دسیوں مشغلے تھے۔ احرار پارٹی تھی۔ شیعہ کانفرنس تھی۔ ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی میں مسلمان بھرے ہوئے تھے۔ مسلم لیگ کا تو خیر اس وقت کسی نے نام بھی نہ سُنا تھا۔ پر بہت سے

مسلمان اگر انصاف کی پوچھیے تو کچھ بھی نہ تھے یا شاعری کرتے تھے یا مجلسیں پڑھتے تھے۔

تو کہنے کا مطلب یہ کہ کوئی ایسی تشویشناک بات نہ تھی، پر ڈاکٹر آفتاب رائے کی زیادہ تر لوگوں سے کبھی نہ پٹی۔ ارے صاحب یہاں تک سنا گیا ہے کہ ہری پورہ کانگریس کے موقع پر انھوں نے سب کو کھری کھری سنا دیں۔ گو یہ راوی کو یاد نہیں کہ انھوں نے کیا کہا تھا۔

ضلع کی سوسائٹی جن عناصر پر مشتمل تھی۔ انھیں سے ڈاکٹر آفتاب رائے کوسوں دور بھاگتے تھے۔ وسط شہر میں مہاجنوں، ساہوکاروں اور زمینداروں کی اونچی حویلیاں تھیں۔ یہ لوگ سرکاری فنڈوں میں ہزاروں روپیا چندہ دیتے، اسکول کھلواتے، مشاعرے اور دنگل کرواتے، جلسے جلوس اور سرپھٹول بھی ان ہی کی زیر سرپرستی منعقد ہوتے۔ ہندو مسلمانوں کا معاشرہ تقریباً یکساں تھا۔ وہی تیج تہوار، میلے ٹھیلے، محرم، رام لیلا، پھر اس سے اونچی سطح پر وہی مقدمے بازیاں، موکل، گواہ، پیشکار، سمن، عدالتیں، صاحب لوگوں کے لیے ڈالیاں۔

شہر کے باہر ضلع کا ہسپتال تھا۔ لق ودق ہری گھاس کے میدانوں میں بکھری ہوئی اداس پیلے رنگ کی عمارتیں۔ کچے احاطے نیم کے درختوں کی چھاؤں میں آوٹ ڈور، مریضوں کے ہجوم، گرد آلود یکوں کے اڈے، سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے دو دو آنے میں خط لکھ کر دینے والے، بہت بوڑھے اور شکستہ حال منشی جو دھاگوں والی عینکیں لگائے دھندلی آنکھوں سے راہگیروں کو دیکھتے۔ بجھر گلیاں تھیں جن کے گٹوں کے فرش پر پانی بہتا تھا۔ سیاہی مائل دیواروں پر کوئلے سے اشتہار لکھے تھے جکیم مارکہ دھاگا خریدیے۔ پری۔ برانڈ بیڑی پیو۔

ایک بیٹیا باپ سے لو چاٹے جا کر ماں کو دو — آگیا۔ آگیا — سال رواں کا سنسنی خیز فلم "اپری راجا" آگیا۔ جس میں مِس مادھوری کام کرتی ہے۔

پھر سایے دار سڑکوں کے پرے آم اور مولسری میں چھپی ہوئی حکام ضلع کی بڑی بڑی کوٹھیاں تھیں؛ انگریزی کلب تھا جس میں بے اندازہ خنکی ہوتی۔ چپ چاپ اور سایے کی طرح چلتے ہوئے مؤدب اور شایستہ "بیرے" انگریز اور کالے صاحب لوگوں کے لیے ٹھنڈے پانی کی بوتلیں اور برف کی بالٹیاں لا کر گھاس پر رکھتے، نیلے پردوں کی قناتوں کے پیچھے ٹینس کی گیندیں سبزے پر لڑھکتی رہتیں۔

۲

اور سول لائنز کی اس دنیا میں اوپر سے آئی کنول کماری جین جگن ناتھ جین آئی سی ایس کی بالوں کٹی بیوی جس نے لکھنؤ کے مشہور انگریزی کالج ازابلا تھوبرن میں پڑھا تھا اور جو گیند بلا کھیلتی تھی، کلب میں بڑی چہل پہل ہوگئی — گنتی کی کل تین تو میمیں ہی تھیں کلب میں۔ کوین وکٹوریہ گورنمنٹ انٹر کالج کے انگریز پرنسپل کی میم ایک، زنانہ ہسپتال کی بڑی ڈاکٹرنی میم مس مک کنزی دو، اور لے۔ بی مشن گرلز ہائی اسکول کی بڑی استانی مس سالفرڈ جو چُنیا میم کہلاتی تھی کہ نوکروں پر چِلاتی بہت تھی۔ ان تین کے علاوہ ڈاکٹرنی میم کی چھوٹی بہن مس اولیو مک کنزی تھی جو اپنی بہن سے ملنے نینی تال سے آئی ہوئی تھی اور ضلع کے غیر شادی شدہ حکام کے ساتھ ٹینس کھیلنا اس کا خاص مشغلہ تھا اور اس میں ایسا کچھ اس کا جی لگا تھا کہ اب واپس جانے کا نام نہ لیتی تھی۔ شام ہوتے ہی وہ کلب میں آن موجود ہوتی اور وہ مسٹر سکسینہ اور وہ مسٹر فرحت علی اور وہ مسٹر پانڈے، سبھی تو اس کے چاروں طرف کھڑے دانت نکوسے ہنس

رہے ہیں۔ اس ایک سیانے بھائی لوگوں کو گنگنی کا ناچ نچا رکھا تھا۔ باقیماندہ حضرات بھی کہتے تھے کہ میاں کیا مضائقہ ہے، جون پور ایسی ڈل جگہ پر مس یک کنزی کا دم ہی غنیمت جانو۔ اب غور کرنے کا مقام ہے کہ مس شبیرہ حمایت علی جو دوسری لیڈی ڈاکٹر تھیں ان کا تو نام سن کر ہی جی بیٹھ جاتا تھا۔ مگر وہ خود بے چاری بڑی اسپورٹنگ آدمی تھیں۔ برابر جی داری سے ٹینس کھیلنے آیا کرتیں۔ لکھنؤ کے کنگ جارج کی پڑھی ہوئی تھیں۔ لندن جاکر ایک ڈپلوما بھی مار لائی تھیں لیکن کیا مجال جو کبھی بدماغی دکھلاجاویں۔ لوگ کہتے تھے صاحب، بڑی شریف ڈاکٹرنی ہے۔ بالکل گائے بھیجے گائے، جی ہاں، اب یہ دوسری بات ہے کہ آپ یہ توقع کریں کہ ہر لیڈی ڈاکٹر افسانوں اور ناولوں کی روایت کے مطابق بالکل حور شمائل، مہ وش، پری پیکر ہو۔ اچھی آدمی کا بچہ تھیں۔ بلکہ ایک مرتبہ تو ڈسٹرکٹ جج مسٹر کاظمی کی بیگم صاحب نے مسٹر فرحت علی سے تجویز بھی کی تھی کہ بھیا آزادی کا زمانہ ہے مس شبیرہ ہی سے بیاہ کرلو۔ یہ جو سال کی سال چھٹیوں میں تمھاری اماں بھیں لڑکیاں دیکھنے کے لیے نینی تال، مسوری بھیجا کرتی ہیں، اس دردِ سر سے بھی نجات ملے گی اور کیا۔

راوی کہتا ہے کہ فرحت علی نے جو اُن دنوں بڑے معرکے کا سپرنٹنڈنٹ پولس تھا، بیگم کاظمی کے سامنے کان پکڑ کر اٹھک بیٹھک کی تھی اور تھر تھر کانپا تھا اور دست بستہ یوں گویا ہوا تھا کہ آئندہ وہ مس شبیرہ حمایت علی سے جو گفتگو کرے گا وہ صرف چار جملوں پر مشتمل ہوگی — آداب عرض، آپ اچھی طرح سے ہیں؟ جی ہاں میں بالکل اچھی طرح ہوں، شکریہ، آداب عرض۔

مصیبت یہ تھی کہ جہاں کسی شامت کے مارے نے کسی "غیر منسلک" خاتون محترم سے سوشل گفتگو کے دوران ان چار جملوں سے تجاوز کیا تو

بس سمجھ لیجیے ایکٹی ولی ہوگئی۔

تو غرض کہ راوی دریا کو یوں کوزے میں بند کرتا ہے کہ کنول کماری کے میاں کا تقرر اس جگہ پر ہوا (انگریز حاکموں کی اصطلاح میں صوبے کا ضلع "اسٹیشن" کہلاتا تھا)

اور نئے حاکم ضلع کے اعزاز میں کنور نرنجن داس رئیس اعظم جون پور نے (کہ یہ سارا کا سارا ایک نام تھا) اپنے باغ میں بڑی دھوم کی دعوت کی۔ چبوترے پر زرتار شامیانہ تانا گیا۔ رات گئے تک جلسہ رہا۔ بیبیوں کے لیے اندر علاحدہ دعوت تھی۔ مصرانیوں نے کیا کیا کھانے نہ بنائے۔ مسلمان مہمانوں کے لیے باولے ڈپٹیوں کے وہاں سے باورچی بلوائے گئے تھے (باولے ڈپٹیوں کا ایک خاندان تھا جس میں عرصہ ہوا ایک ڈپٹی صاحب کا دماغ چل گیا تھا۔ اس کے بعد سے وہ پورا خاندان باولے ڈپٹیوں کا گھرانا کہلاتا تھا) کہار آواز لگاتے، اجی باولے ڈپٹیوں کے ہاں سے سواریاں آئی ہیں اتروالو۔ مہریوں سے کہا جاتا: ارے باولے ڈپٹیوں کے ہاں نیوتا دینے آنا رہی رام رکھی جھاڑو پیٹی۔

ہیم کرن ایسے تو کہیں آتی جاتی نہ تھیں پر رانی نرنجن داس کی زبردستی پر وہ بھی دعوت میں آگئی تھیں۔ کلکٹر کی بیوی سے ملنے کے لیے عمائدین شہر کی بیویوں نے کیا کیا جوڑے نہ پہنے تھے لیکن جب خود کنول کماری کو دیکھا تو پتا چلا کہ یہ تو پوری میم ہے۔ غضب خدا کا ہاتھوں میں چوڑیاں تک نہ تھیں۔ ناک کی کیل تک نہیں۔ چوٹی کی جگہ بال کٹے ہوئے۔ ناک کی کیل نوگئی چولھے بھاڑ میں۔ ہلکے نیلے رنگ کی ساری پہنے گاؤ تکیے سے ذرا ہٹ کر بیٹھی وہ سب سے مسکرا مسکرا کر باتیں کرتی رہی۔

"ارے لو بٹیا تم نے سہاگ کی نشانی ہی کو جھاڑو پیٹے فیشن کی بھینٹ کر دیا۔" صدر اعلا کی بیگم نے ناک پر انگلی رکھ کر اس سے کہا۔

"اے ہاں سچ تو ہے. کیا ڈنڈا ایسے ہاتھ میں لیے بیٹھی ہو۔ دوُپار چھائیں بھویں دیکھے ہی سے ہول آتا ہے!" بیگم کاظمی نے بھی صاد کیا۔

کھیم کی تو بہرحال آج عید تھی۔ اس نے تیز جامنی رنگ کی بنارسی ساری باندھی تھی۔ پانو میں رام جھول پہنے تھے. سونے کی کردھنی اور دوسرے سارے گہنے پاتے علاحدہ کندن کا چیپکا تو کستوری بھی پہن آئی تھی، لیکن کستوری کی ماں (جو محلے میں بڑی بھادج کے نام سے یاد کی جاتی تھیں) بن بیاہی لڑکیوں کے زیادہ سنگار پٹار کی قطعی قائل نہ تھیں۔ ان کے یہاں تو لڑکیاں بالیاں مانگ تک بالوں میں نہ کاڑھ سکتی تھیں، پر اب زمانے کی ہوا کے زیر اثر نئی پود کی لڑکیوں نے سیدھی اور آڑی مانگیں کاڑھنی شروع کر دی تھیں. کھیم دور سے بیٹھی کنول کماری کو دیکھتی رہی — کتنی سُندر ہے اور پھر ایم۔ اے پاس — ایم۔ اے پاس لڑکی کھیم اور کستوری کی نظروں میں بالکل دیوی دیوتا کا درجہ رکھتی تھی۔

کنول کماری جین ساری مہمان بیبیوں سے ہنس ہنس کر بے حد خوش اخلاقی سے گفتگو کرنے میں مصروف تھی (اور ساری محفل نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ لڑکی سابق کلکٹر کی بیوی اس مُخّریل مسز بھارگو اسے کہیں زیادہ اچھی اور ملنسار ہے، رانی بٹیا ہے بالکل)

دالان کے گملوں کی اوٹ میں کھیم اور کستوری بیٹھی تھیں، اور منٹ منٹ پر ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہوئی جاتی تھیں۔ اب ایک بات ہو تو بتلائی جائے، دسیوں تھیں. مثلاً موٹی مصرانی کی چال ہی دیکھ لو اور اوپر سے کنور نرنجن داس صاحب خانہ کی اسٹیٹ کے منیجر صاحب لالہ گنیش مہاشے بار بار ڈیوڑھی میں آن کر للکارتے —"اجی پردہ کرلو کہار اندر آرہے ہیں"

تو ان کے حلق میں سے ایسی آواز نکلتی جیسے ہارمونیم کے پردوں کو برساتی ہوا مار گئی ہو۔

اب کے سے جب ماما لکھنؤ سے گھر آئے تو کھیم نے دعوت کی ساری داستان ان کے گوش گزار کر دی۔ کنول کماری ایسی اور کنول کماری ویسی، ماما چپکے بیٹھے سنتے رہے۔

۳

کھیم جب رات کا کھانا کھا کر سونے چلی گئی اور سارے گھر میں خاموشی چھا گئی تو ڈاکٹر آفتاب رائے چھت کی منڈیر پر آکر کھڑے ہوگئے۔ باغ اب سنسان پڑے تھے۔ گرمیوں کا موسم نکلتا جا رہا تھا اور گلابی جاڑے شروع ہو گئے تھے۔ پُروائی ہوا آہستہ آہستہ بہہ رہی تھی۔ نیچے ٹھکراین کی بگیا والی گلی کے برابر سے مسلمانوں کا محلہ شروع ہوتا تھا۔ اس کے بعد بازار تھا، جس میں مدھم گیس اور لالٹین کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں، پھر پولیس لائنز کے میدان تھے۔ اس کے بعد کچہری اور سول لائنز۔

سول لائنز میں حاکم ضلع کی بڑی کوٹھی تھی، جس پر یونین جیک جھٹ پٹے کی نیم تاریکی میں بڑے سکون سے لہرا رہا تھا۔ سارے میں یہ تھکی ہوئی خاموشی چھائی تھی۔ سامنے سلطان حسین شرقی کے زمانے کے اونچے پھاٹک اور مسجدوں کے بلند مینار رات کے آسمان کے نیچے پانچ سو سال سے اسی طرح ساکت اور صامت کھڑے تھے۔ زندگی میں بے کیفی تھی، اُداسی اور ذلت تھی اور شدید غلامی کا احساس تھا۔

عمر بھر آفتاب رائے نے یوں ہی سوچا تھا کہ اب وہ اور کچھ نہ کریں گے

لیکن دنیا موجود تھی۔ وہ کام بھی کرتے، کھانا بھی کھاتے۔ سال میں چار دفعہ جون پور آکر جی جی سے دماغ سوزی بھی کرتے۔ زندگی کے بھاری پن کے باوجود گاڑی تھی کہ چلے جا رہی تھی۔

کنول کماری اس منظر کے پرے، مولسری کے جھنڈ کے دوسری طرف یونین جیک کے سایے میں براجتی تھی۔ بہت سے لوگ ہیں کہ جو راستہ سوچا اختیار کر لیا۔ آرام سے اس پر چلتے چلے گئے۔ یہاں کسی راستے کا تعین ہی نہ ہو پاتا تھا۔ ایک کے بعد ایک سب اِدھر اُدھر نکل گئے تھے آفتاب رائے رہیں کے رہیں تھے۔

"کنول کماری ــــ؟ لاحول ولا قوۃ"

جب وہ یونی ورسٹی سے ڈاکٹریٹ کے لیے ولایت جا رہے تھے تو کنول نے اُن سے کہا تھا: "آفتاب بہادر تم کو اپنے اوپر بڑا مان ہے۔ پر وہ مان ایک روز ٹوٹ جائے گا۔ جب میں بھی کہیں چلی جاؤں گی۔"

"تم کہاں چلی جاؤ گی؟"

"اُفوہ ــ لڑکیاں کہاں چلی جاتی ہیں ــــ؟"

"گویا تمھارا مطلب ہے کہ تم بیاہ کر لو گی؟"

"میں خود تھوڑا ہی بیاہ کرتی پھروں گی۔ ارے عقلمند داس، میرا بیاہ کر دیا جائے گا۔" اُس نے جھنجھلا کر جواب دیا تھا۔

"ارے جاؤ ــــ" آفتاب رائے خوب ہنسے تھے ــــ "میں اس جھانسے میں آنے والا نہیں ہوں، تم لڑکیوں کی پسند بھی کیا شے ہے۔ تم جیسی موڈرن لڑکیاں آخر میں پسند اسی کو کرتی ہیں جو اُن کے سماجی اور معاشی معیار پر پورا اُترتا ہے باقی سب بکواس ہے۔ پسند اضافی چیز ہے تمھارے لیے ــــ"

"ہاں ــــ بالکل اضافی چیز ہے، آفتاب بہادر ــ" وہ غصّے کے مارے بالکل خاموش ہوگئی تھی۔

وہ چاند باغ میں تھی۔ آپ بادشاہ باغ میں بڑی دھوم دھام سے براجتے تھے۔ یونین کی پریذیڈنٹی کرتے تھے۔ تقریریں بگھارتے تھے۔ ایک منٹ نچلے نہ بیٹھتے تھے۔ تاکہ کنول نوٹس نہ بھی لیتی ہو تو لے۔ وہ اے پی سین روڈ پر رہتی تھی اور سائکل پر روز چاند باغ آیا کرتی تھی۔ لکھنؤ کی بڑی نمائش ہوئی تو وہ بھی اپنے کنبے کے ساتھ میوزک کانفرنس میں گئی۔ وہاں یونی ورسٹی والوں نے سہگل کو اپنے محاصرے میں لے رکھا تھا۔ جس گانے کی یونی ورسٹی اور چاند باغ کا مجمع فرمایش کرتا وہی سہگل کو بار بار گانا پڑتا۔ بھائی آفتاب بھی شور مچانے میں پیش پیش، لیکن اگلی صف میں کنول کو بیٹھا دیکھ کر فوراً سٹپٹا کر چپ ہو گئے اور سنجیدگی سے دوستوں سے بولے کہ یار چھوڑو کیا ہلّڑ مچا رکھا ہے۔ اس پر عزت نے عسکری بلگرامی سے کہا (آج ان دونوں پیارے دوستوں کو مرے بھی اتنا عرصہ ہو گیا ہے، منڈیر پر کھڑے ہوئے آفتاب رائے کو خیال آیا)

"اُستاد یہ اپنا آفتاب جو ہے یہ اس لونڈیا پر اچھا امپریشن ڈالنے کی فکر میں غلطاں و پیچاں ہے۔ اب خداوند تعالیٰ ہی اس پر رحم کرے۔"

"بی۔ اے کے بعد تم کیا کرو گی ــ ؟" ایک روز آفتاب رائے نے کنول سے سوال کیا۔

"مجھے کچھ پتا نہیں ــ" کنول نے کہا تھا۔ اس میں گویا یہ اشارہ تھا کہ مجھے تو کچھ پتا نہیں تم ہی کوئی پروگرام بناؤ۔

لیکن کچھ عرصے بعد وہ سیدھے سیدھے ولایت نکل گئے۔ کیونکہ غالباً ان

کی زندگی ان کے لیے، ان کے گھر والوں کے لیے، کنول کے وجود سے کہیں زیادہ اہم تھی۔ پھر اُن کی آئیڈیالوجی تھی (یار کیا بکواس لگا رکھی ہے۔ عزت نے ڈپٹ کر کہا تھا)

پَر ایک روز، لندن میں، جب وہ سینیٹ ہاؤس کی لائبریری سے گھر کی طرف جارہے تھے تو راہ میں انھیں مہی پال نظر آیا جس نے دور سے آواز لگائی۔ چائے پینے چلو تو ایک واقعۂ فاجعہ گوش گزار کروں۔ کنول کماری کا جگن ناتھ جین سے بیاہ ہوگیا۔ وہی جو سن پینتیس کے بیچ کا ہے ــــ"

لڑکیوں کی عجیب بے ہودہ قوم ہے۔ اس روز آفتاب رائے اس نتیجے پر پہنچے "ان کو سمجھنا ہمارے تمھارے بس کا روگ نہیں۔ میاں وہ جو بڑی انٹلکچوئل کی سانس بنی پھرتی تھی۔ ہوگئی ہوگی۔ اب گلیڈ ــــ جگن ناتھ جین مائی فٹ ــــ کون تھا یہ اُلّو ــــ میں نے کبھی دیکھا ہے اسے؟" مہی پال کے کمرے میں پہنچ کر آتشدان سلگاتے ہوئے انھوں نے سوال کیا۔

مہی پال رائے زادہ کھڑکی میں جھکا باہر سڑک کو دیکھ رہا تھا جہاں ٹھیلے والے کوکنی، دن بھر گلا پھاڑ کر چلاتے رہنے کے بعد اب اپنے اپنے ترکاریوں کے ٹھیلے گھسیٹتے ہوئے سر جھکائے آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ شام کا دھندلکا سارے میں بکھر گیا تھا۔ زندگی بہت اُداس ہے، اس نے خیال کیا تھا۔ ہاں۔ اس نے آفتاب رائے سے کہا تھا میں نے اسے پٹنے میں دیکھا تھا۔ کالا سا آدمی ہے۔ عینک لگاتا ہے۔ کچھ کچھ لومڑی سے ملتی جلتی اس کی شکل ہے۔

"بے وقوف بھی ہے ــــ؟" آفتاب رائے نے پوچھا تھا۔

"خاصا بے وقوف ہے —" ہری پال رائے زادہ نے جواب دیا تھا۔

"— پھر کنول اس کے ساتھ خوش کیسے رہ سکے گی؟" آفتاب رائے نے ہری پال سے مطالبہ کیا۔

"میاں آفتاب بہادر —" ہری پال نے مڑ کر ان کو مخاطب کیا — "یہ جتنی لڑکیاں ہیں نا — جو افلاطونِ زماں بنی پھرتی ہیں۔ یہ بے وقوفوں کے ساتھ ہی خوش رہتی ہیں۔ آیا عقل میں تمھاری — ؟"

"کیا بکواس ہے —" آفتاب رائے نے بڑی آزردگی سے کہا۔

اب ہری پال رائے زادہ کو صریحاً غصہ آگیا۔ اس نے جھنجھلا کر کہا تھا — "تو میاں تم کو روکا کس نے تھا اس سے بیاہ کرنے کو' جواب مجھے بور کر رہے ہو۔ کیا وہ تم سے خود آکر کہتی کہ میاں آفتاب بہادر میں تم سے بیاہ کرنا چاہتی ہوں۔ ایں — ؟ اور فرض کرو اگر وہ خود سے ہی انکار کر دیتی تو کیا قیامت آجاتی۔ میاں لڑکی تھی یا ہوّا۔ کیا مارتی وہ تم کو جھاڑ دے کر — کیا کرتی — ؟ تم نے لیکن کہہ کے نہیں دیکھا۔ خیر چلو — خیریت گزر گئی' اچھا ہی ہوا۔ کہاں کا جھگڑا مول لیتے بے کار میں۔ کیوں کہ میرا مقولہ ہے (اس نے انگلی اٹھا کر عالمانہ انداز میں کہا) کہ شادی کے ایک سال بعد سب شادیاں ایک سی ہو جاتی ہیں — تم کو تو جگن ناتھ جی کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس نے تم کو ایک بارِ عظیم سے سبکدوش کیا بلکہ وہ تمھارے حق میں بالکل دافعِ بلیات ثابت ہوا۔"

"بے ہودہ ہیں آپ انتہا سے زیادہ —" آفتاب رائے نے جھنجھلا کر کہا تھا۔

لکھنؤ لوٹ کر ایک روز آفتاب رائے اتفاقاً اے پی سین روڈ پر سے گزرے۔ سامنے کنول کے باپ کی سُرخ رنگ کی بڑی سی کوٹھی تھی' جس کی برساتی پر کاسنی پھولوں کی بیل پھیلی تھی۔ یہاں ایک زمانے میں کتنا اودھم

مچا تھا۔ کنول کے سارے بہن بھائیوں نے مل کر اپنا آرکیسٹرا بنا رکھا تھا۔ کوئی بانسری بجاتا، کوئی جلترنگ، کنول طبلہ بجاتی۔ ایک بھائی وائلن کا استاد تھا۔ سب مل کر جے جے ونتی شروع کر دیتے۔ مورے مندر اب لوں نہیں آئے —— کیسی چوک بھئی موسے آلی —— پھر ارچنا بنرجی آجاتی اور کوئل ایسی آواز میں گاتی —— آمی پوہوڑی بھورنا مکر مکر پوجوئے ہو —— اتوار کو دن بھر بیڈمنٹن ہوتا۔ ہرسے تو آفتاب رائے ان لوگوں کے یہاں موجود رہتے تھے اور جب ایک روز خود ہی چپکے سے ولایت کھسک لیے تو ان لوگوں کا کیا قصور۔ وہ لڑکی کو بنک کے بیعف ڈپازٹ میں تو ان کے خیال سے رکھنے سے رہے اور جگن ناتھ جین ایسا رشتہ، تو بھائی قسمت والوں ہی کو ملتا ہے۔

پھر ایک روز امین آباد میں انھوں نے کنول کو دیکھا۔ وہ کار سے اتر کر اپنی سسرال والوں کے ساتھ پارک کے مندر کی طرف جا رہی تھی اور سُرخ ساری میں ملبوس تھی اور آلتا اس کے پیروں میں تھا (آلی ری سائیں کے مندر دیا بار آؤں۔ کر آؤں سولہ سنگار) وہ گرمیوں کی شام تھی۔ امین آباد جگمگا رہا تھا۔ ہوا میں موتیا اور خس کی مہک تھی اور مندر کا گھنٹہ یکسانیت سے بجے جا رہا تھا۔

اب آفتاب رائے یونیورسٹی میں تاریخ کی چیئر سنبھالے ہوئے تھے۔ ساتھیوں کی محفل میں خوب ادھم مچاتے، ٹینس کھیلتے اور صوفی ازم کی تاریخ پر ایک مقالہ لکھ رہے تھے، میں وہ نہیں ہوں جو میں ہوں۔ میں وہ ہوں جو میں نہیں ہوں۔ ہر چیز باقی ساری چیزیں ہیں۔ بھگوان کرشن جب ارجن سے کہتے ہیں —— اور پرنس ارجنا —— (" ارے جا بے۔ عسکری ڈانٹ بتاتا اگر تم اس چکر میں ہو کہ تم بھی پروفیسر ڈی۔پی۔ مکرجی کی طرح مہا گرو بن کے بیٹھ جاؤ گے تو تم غلطی پر ہو۔

ڈاکٹر آفتاب رائے، تمھارا تو ہم مارتے مارتے حلیہ ٹھیک کردیں گے —" ممی پال اضافہ کرتا)

جون پور آکر وہ کھیم کو دیکھتے کہ تندہی سے کچا لو کھا رہی ہے۔ کتھک سیکھ رہی ہے۔ جل بھرنے چلی ری گوئیاں آں آں گاتی پھر رہی ہے۔ یہ بھی کنول کماری کی قوم سے ہے۔

"اری او باولی — بتا تو کیا کرنے والی ہے —" وہ سوال کرتے —

"پتا نہیں ماما —" وہ معصومیت سے جواب دیتی۔

"پتا نہیں کی بچی —" وہ دل میں کہتے۔

چھت کی منڈیر پر ٹہلتے ٹہلتے آفتاب رائے نیم کی ڈالیوں کے نیچے آگئے۔ سامنے بہت دور، سول لائنز کے درختوں میں چھپی ہوئی حاکم ضلع کی کوٹھی میں گیس کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ پروائی ہوا بہے جا رہی تھی۔ یہ چاند رات تھی اور مسلمانوں کے محلّوں کی طرف سے محرّم کے نقّاروں کی آوازیں بلند ہونا شروع ہوگئی تھیں۔

محرّم آگیا — آفتاب رائے کو خیال آیا — شاید اب کے سے پھر سر پھٹول ہو۔ بہت دنوں سے نہیں ہوئی تھی۔ انھوں نے سوچا۔

ویسے انگریز کی پالیسی یہ تھی کہ جن ضلعوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی وہاں ہندو افسروں کو تعینات کیا جاتا تھا اور جہاں ہندو زیادہ ہوتے تھے وہاں مسلمان حاکموں کو بھیجا جاتا تھا تاکہ توازن قائم رہے۔ یہ دوسری بات تھی کہ صوبے کی چھے کروڑ آبادی کا صرف ۱۳ فی صدی حصہ مسلمان تھے لیکن اتنی شدید اقلیت میں ہونے کے باوجود تہذیبی اور سماجی طور پر مسلمان ہی سارے صوبے پر چھائے ہوئے تھے۔ جون پور، لکھنؤ، آگرہ، علی گڑھ، بریلی، مُرادآباد

شاہجہاں پور وغیرہ جیسے ضلعوں میں تو مسلمانوں کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی اور باقی کے سارے خطّوں میں بھی ان کا بول بالا تھا۔ صوبے کی تہذیب سے مراد وہ کلچر تھا جس پر مسلمانوں کا رنگ غالب تھا۔ گلی گلی، محلے محلے، گانو گانو سیکڑوں ہزاروں مسجدیں اور امام باڑے تھے۔ مکتب، مدرسے، درگاہیں، قلعے، حویلیاں چپے چپے سے مسلمانوں کی آٹھ سو سال پرانی روایات وابستہ تھیں۔

ہندو مسلمانوں میں سماجی سطح پر کوئی واضح فرق نہ تھا۔ خصوصاً دیہات اور قصبہ جات میں عورتیں زیادہ تر ساریاں اور ڈھیلے پاجامے پہنتیں۔ اودھ کے بہت سے پرانے خاندانوں میں بیگمات اب تک لہنگا بھی پہنتیں۔ بن بیاہی لڑکیاں ہندو اور مسلمان دونوں ساری کے بجائے کھڑے پائنچوں کا پاجامہ پہنتیں۔ ہندوؤں کے یہاں اسے "اجار" کہا جاتا۔ مشغلوں کی تقسیم بڑی دل چسپ تھی۔ پولیس کا عملہ اسی فی صدی مسلمان تھا، محکمۂ تعلیم میں ان کی اتنی ہی کمی تھی۔ تجارت تو خیر کبھی مسلمان بھائی نے ڈھنگ سے کرکے نہ دی۔ چند پیشے مگر خاص مسلمانوں کے تھے جن کے دم سے صوبے کی مشہور صنعتیں قائم تھیں لیکن خدا کے فضل وکرم سے کچھ ایسا مضبوط نظام تھا کہ سارا منافع تو بازار تک پہنچاتے پہنچاتے مڈل مین ہی مارے جاتا تھا اور جو بھائی کے پاس بچتا تھا اس میں قرضے چکانے تھے، بٹیا کا جہیز بنانا تھا اور ہزاروں قصے تھے آپ جانیے۔

زبان اور محاورے ایک ہی تھے۔ مسلمان بچے برسات کی دعا مانگنے کے لیے منہ نیلا پیلا کیے گلی گلی ٹین بجاتے پھرتے اور چلاتے — برسو رام دھڑا کے سے۔ بڑھیا مر گئی فاقے سے۔ گڑیوں کی برات نکلتی تو وظیفہ کیا جاتا — ہاتھی، گھوڑا، پالکی — جے کنہیا لال کی۔ مسلمان پردے دار عورتیں جنھوں نے ساری عمر

کسی ہندو سے بات نہ کی تھی۔ رات کو جب ڈھولک لے کر بیٹھتیں تو لہک لہک کر الاپتیں ــــ بھری گگری موری ڈھرکائی شام ــــ کرشن کنھیا کے اس تصور سے ان لوگوں کے اسلام پر کوئی حرف نہ آتا تھا۔ یہ گیت اور کجریاں اور خیال، یہ محاورے، یہ زبان، ان سب کی بڑی پیاری اور دلآویز مشترکہ میراث تھی۔ یہ معاشرہ جس کا دائرہ مرزا پور اور جون پور سے لے کر لکھنؤ اور دلّی تک پھیلا ہوا تھا۔ ایک مکمل اور واضح تصویر تھا، جس میں آٹھ سو سال کے تہذیبی ارتقا نے بڑے گمبھیر اور بڑے خوبصورت رنگ بھرے تھے۔

ڈاکٹر آفتاب رائے نے (کہ ان کا نام ہی اس مشترکہ تمدن کی لطافت کا ایک مظہر تھا) ایک بار سوچا تھا کہ وہ کبھی ایک کتاب لکھیں گے کہ کس طرح پندرھویں صدی میں بھگتی تحریک کے ذریعے ــــ لیکن ذہن ہی کو مکمل سکون کہاں میسر تھا۔ پہلے یہ کنول کماری کود پڑی۔ پھر ان کی معاشی مجبوریاں آڑے آئیں اور ان کو ولایت سے لوٹ کر بنارس میں لیکچرر شپ سنبھالنی پڑی، جہاں دن رات ہندی اُفقواہندستانی کے گن گائے جاتے ــــ یہ میں تم سے کہتا ہوں ــــ کہ شدھ ہندی اور گؤ رکھشا، اور رام راجیہ یہ سب سے بڑا خطرہ ہے۔ اس خطرے سے بچو۔ انھوں نے ایک دفعہ ایک کانفرنس کے پنڈال میں چلّا کر کہا تھا ــــ

آفتاب رائے کے ساتھی مذاق میں انھیں جون پور کا قاضی کہا کرتے تھے "یہ جو کتاب تم لکھنے والے ہو اس کا نام رکھنا ــــ "جون پور کا قاضی ــــ عرف "میں شہر کے اندیشے میں دُبلا کیوں ہوا ــــ!"

رات کی ہوا میں خنکی بڑھ چکی تھی، نیم کے پتّے بڑے پُراسرار طریقے سے

سائیں سائیں کر رہے تھے، اِس زندگی میں بے پایاں اُداسی تھی۔

محلّے کے مکانوں میں مدّھم روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ نیچے بڑی بھاوج کے مکان کے بڑے آنگن میں مجلس کے لیے جو گیس کا ہنڈا نصب کیا گیا تھا۔ اس کی روشنی رات کے ویرانے میں بڑی لرزہ خیز معلوم ہوتی تھی جیسے مہوے کے جنگل میں اگیا بھتال اور مسان چپکے چپکے روتے ہوں۔

مجلسوں کے گریہ و بکا کی مدھم آوازیں پُروائی کے جھونکوں میں رل مل کر وقفے وقفے کے بعد یک لخت بلند ہو جاتی تھیں۔ نکڑ پر کنور نرنجن داس کے ہاں کی مُحرّم کی سبیل کے پاس رکھی ہوئی نوبت یکسانیت سے بجے جا رہی تھی۔

۴

"عاشور کی شب بیبیؔ ارے سرہانے شمع رکھ کر —" بُوا مدّن نے تکیے پر کرم خوردہ کتاب رکھ کر پڑھنا شروع کیا۔

"— اے تکتی رہیں چہرہ علی اکبر کا —" بگّن نے باریک تیز آواز میں ساتھ دینا شروع کیا

"اے لو دونوں کی دونوں سٹھیا گئی ہیں — اے بیوی چاند رات کو نویں تاریخ کے مرثیے نکال کر بیٹھ گئیں — !؟" بڑی بھاوج نے باورچی خانے میں سے پکارا۔

"توبہ توبہ، اکم بخت ایسی سادستی پڑی ہے کہ اب تو کچھ بھی یاد نہیں رہتا — اے لو میں تو عینک لانا ہی بھول گئی۔ اب مجھے کچھ سُجھائی تھوڑی دے رہا تھا — میں نے تو اٹکل سے پڑھنا شروع کر دیا — اے بہن — اے نیازی بیگم — ذری اپنی عینک تو دینا —" بُوا مدّن نے طویل سانس بھر کے کہا۔

نیازی بیگم نے اپنی عینک اتار کے دی جو بُوا مُدّن نے ناک کی پھننگ پر رکھ کر پھر سے بیاض کی ورق گردانی شروع کی۔

"اے بُوا مُدّن نجم الملّت کی بیاض بھی لائی ہو کہ نہیں ــــ؟" بڑی بھاوج نے تخت کے پایے کے قریب آکر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔

"لڑکیوں سے پوچھیے ــــ بڑی بھاوج ــــ نجم الملّت کے نوحے تو یہی لوگ پڑھتی ہیں ــــ" بگّن نے جواب دیا۔

"ہاں بٹیا ہم تو پُرانے فیشن کے آدمی ہیں۔ اب تو نوحوں میں بھی نئے راگ رنگ نکلے ہیں ــــ" بُوا مُدّن نے قدرے بے نیازی سے اضافہ کیا۔

یہ لڑکیوں پر صفا چوٹ تھی۔ بُوا مُدّن نے لڑکیوں کی نوحہ خوانی کو کبھی بھی اچھی نظروں سے نہ دیکھا۔

کنبے اور محلّے کی ساری لڑکیاں دیوار کے سہارے بڑے اسٹائل سے سیاہ جارجٹ کے دوپٹوں سے سر ڈھانپے خاموش بیٹھی تھیں۔ بُوا مُدّن کے اس طعنے کا انھوں نے قطعی نوٹس نہیں لیا۔

"ڈولی اُتروالو ــــ" باہر سے رام بھروسے کی آواز آئی۔

"پردہ کرلو لوگو ــــ کہار اندر آتے ہیں ــــ"

نیرنجن کی سینی دھم سے گھڑونچی پر ٹکا کر مولہ تیز آواز میں چلائی ــــ "چھمّو بیگم آگئیں"۔

چھمّو بیگم ڈولی میں سے اُتریں اور پائنچے سمیٹ کے پانی سے بھری نالی کو لانگنے کے ارادے سے آگے بڑھیں "اللہ رکھے بڑی بھاوج کے ہاں تو ہر وقت بس بھیّا سی آئی رہتی ہے"۔ انھوں نے ذرا بیزاری سے کہا۔

کہیں مولہ نے یہ سُن لیا "ارے چھمّو بیگم ــــ ذری زبان سنبھال کے

بات کیا کیجیے۔ بڑی بھاوج کے دُشمنوں کے گھر بہتیا آوے۔ شیطان کے کان بہرے — ایسا تو میں نے آنگن کا سارا پانی سونتا ہے۔ اپنے ہاں نہیں دیکھتیں ساری گلی کوٹے کے نوبت رائے کا تلاو بنا رکھا ہے۔ اِتنا اِتنا پانی آپ کے گھر میں کھڑا رہتا ہے۔ ہاں"! اس نے مُنہ در مُنہ جواب دیا۔

"اے بی مولہ — ذری آپے میں رہنا — میں خود سے نہیں آگئی بڑی بھاوج نے سو دفعہ بُلایا کہ آ کر مجلس پڑھ جاؤ — مجلس پڑھ جاؤ — میں اپنے گھر سے فالتو نہیں ہوں کہ ماری ماری پھروں اور ٹکے کی ڈومنیوں کی باتیں سُنوں۔ ہاں۔ لو بھائی ڈولی واپس کرو — "چھمّو بیگم نے بیچ آنگن میں کھڑے ہو کر رجز پڑھا۔

بڑی بھاوج جلدی سے اُٹھ کر باہر آئیں —"اے ہے — یہ کیا کوا نوچن مچی ہے — اماوس پر مصیبت کی گھڑی آن پہنچی اور تم ہو کہ کھڑی جھگڑ رہی ہو — چل نکل مولہ یہاں سے — ڈربی جب دیکھو تب یہی فضیحتا شروع کرتی ہے — آؤ چھمّو بیگم جم جم آؤ —"

ڈیوڑھی میں کہاروں نے زور سے ڈنڈا بجایا۔ اجی پیسے تو بھجوا دیئے بیگم صاحب —

(ارے دیا رے — ساری دیہہ دُکھن لاگت ہے — رام بھروسے نے دیوار سے لگ کر ماتا دین کی بیڑی سلگاتے ہوئے اظہارِ خیال کیا۔ ویسے محرّم کی وجہ سے اب پیسے خوب ملیں گے۔ جہلم تک دس دس پھیرے ایک ایک گلی کے ہوتے تھے اور ہر پھیرا تین تین پیسے، دور کے محلّوں تک آنے جانے کے تو دو دو آنے تک ہو جاتے تھے۔ بس چاندی تھی آج کل بھائی رام بھروسے اور ان کی برادری کی، اور ریڑھے جو چل رہے تھے وہ الگ، ریڑھا ایک طرح

کا لکڑی کا کرسی نما ٹھیلا ہوتا تھا جس میں چاروں طرف پردہ باندھ دیا جاتا تھا۔ اندر دو دو تین تین 'سواریاں' گھس پٹ کر بیٹھ جاتی تھیں اور بچوں کی انگریزی پرام کی طرح پیچھے سے ڈھکیلا جاتا تھا اور چرخ چوں کرتا زیڑوا گلیوں کے پتھریلے فرش پر بڑے ٹھاٹ سے چلتا۔ پالکی کا کرایہ بہت زیادہ تھا یعنی چھ آنے فی پھیرا۔ پرائیویٹ پالکی جو پہلے صدر اعلا کے یہاں تھا۔

چھمّو بیگم اس معرکے کے بعد ٹھمک ٹھمک چلتی آن کر چاندنی پر بیٹھ گئیں اور عینک لگا کر بڑے ٹھسّے سے چاروں طرف نظر ڈالی۔ بُوا مُدّن خود بڑی ہائی برو سوز خواں تھیں، انھوں نے کبھی چھمّو بیگم کی پروا نہ کی۔

سوز ختم ہو چکا تھا گوٹے کے پھبکے لگائی بُوا مُدّن طمانیت سے جا کر ایک کونے میں بیٹھ گئیں۔ چنا پٹی کی گوٹ کا اودا پا یجامہ اور توتے کے پروں ایسے ہرے رنگ کا دوپٹا اوڑھے وہ اس شان سے دیوار سے لگ کر بیٹھتی تھیں کہ دور سے معلوم ہو جاتا تھا کہ ہاں یہ رام پور کی میراثن ہیں، مذاق نہیں ہے۔

چھمّو بیگم ایک تو یہ کہ سیدانی تھیں دوسرے یہ کہ بگّن سلما کے بیاہ کے سلسلے میں ان سے جنگ ہو چکی تھی، لہٰذا وہ بُوا مُدّن کو ہرگز خاطر میں نہ لاتیں۔ بُوا مُدّن کو اگر یہ زعم تھا کہ مالکوس اور سوہنی اور بہاگ میں سوز ایسے پڑھتی ہیں کہ مجلس میں پٹس پڑ جاتی ہے تو چھمّو بیگم کو بھی اپنے اوپر ناز بے جا نہ تھا کہ آٹھویں تاریخ والا میر انیس کا مرثیہ پوری راگ داری کے ساتھ ان جیسا کوئی اور نہ پڑھ سکتا تھا۔

چھمّو بیگم نے تہ در تہ ریشمی غلافوں میں سے چاندرات کا بیان نکالا اور مجمع کو نہایت گھور کر دیکھا۔

لڑکیوں کا گروہ اپنی جگہ پر ذرا چوکنّا ہو گیا۔ ان لڑکیوں پر فرض تھا کہ

جب چھمّو بیگم حدیث پڑھیں یا وعظ کریں تو یہ لوگ بڑے بڑے منہ میں ٹھونس کر کھل کھل کر ہنسیں پر بظاہر یہی معلوم ہوتا کہ زار و قطار رو رہی ہیں اور چھمّو بیگم کس قیامت کی حدیث پڑھتی تھیں کہ کہرام بپا ہو جاتا تھا۔

چھمّو بیگم کے وعظ بہت موڈرن ہوتے تھے۔ کیا جناب کبن صاحب بلکہ خود قبلہ جار چوئی صاحب ایسے ایسے رموز و نکات، انگریزی فلسفے کے واقعۂ شہادت میں سے نہ نکال سکتے جو چھمّو بیگم پل کی پل میں دریا کو کوزے میں بند کر کے رکھ دیتی تھیں۔

"اے صاحبانِ مجلس —— جب باری تعالیٰ نے اپنے نور کے دو حصے کیے" والی تمہید سے لے کر جب وہ اس کلائمکس تک پہنچتی تھیں کہ "اے بیبیو —— جناب عبّاس نے رو کر کہا بالی سکینہ اُٹھو ——" تو اُس وقت مجلس میں نالہ و شیون سے قیامت بپا ہو چکی ہوتی تھی۔ اندر باہر سب کہتے تھے کہ ماشاءاللہ سے چھمّو بیگم نے سماں باندھ دیا' ان کے زورِ خطابت کا یہ عالم تھا کہ منٹوں میں بات کہیں سے کہیں پہنچتی تھی۔ ابھی حضرت جبرئیل علیہ السلام کا بیان ہو رہا ہے، ابھی یزید ملعون کے خاندان کا ذکر آ گیا۔ جنگ جمل کا واقعہ سُنا رہی ہیں۔ ساتھ ساتھ اُس کا موازنہ جرمن اور انگریز کی لڑائی سے بھی ہوتا جاتا ہے۔ رسالت مآبؐ کے بیان پر جب آتیں تو کہتیں —— "بیبیو —— میں کوئی مورّخ کوئی تاریخ داں کوئی فلاسفہ نہیں ہوں، مگر اتنا جانتی ہوں اور کہے دیتی ہوں کہ ایک طرف عیسائیوں اور رومیوں کی دس لاکھ فوج تھی ایک طرف جناب رسالت مآبؐ کے ساتھ صرف پندرہ آدمی تھے مگر وہ گھمسان کا رن پڑا تھا کہ سارے فرشتے چرخِ اوّل پر اُتر آئے تھے اور نور کی جھاڑو سے رسالت مآب کے لیے راستہ صاف کرتے جاتے تھے۔" خداوند تعالیٰ کے مسئلے پر فرماتیں —— "اے بیبیو —— یہ جو انگریزی دا

دہریے خدا کے منکر ہیں، ان کا احوال مجھ سے سُنو اور کان کھول کر سنو ـــــ کہ خداوندکریم ان سب شیطانی وسوسوں اور چالوں سے واقف ہے جو فرنگیوں کے علم کے ذریعے ابلیس ملعون نے تم مسلمانوں کے دلوں میں ڈال دی ہیں، بلکہ میں تم کو آج یہ بتانا چاہتی ہوں اے مومنہ بیبیو ـــــ کہ قرآن حکیم کے اندر اللہ تعالیٰ نے خود انگریزی میں اپنی توحید کا ثبوت دیا ہے۔ فرماتا ہے وہ رب ذوالجلال کہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ـــــ یہ ون کیا ہے ـــــ؟ ون انگریزی میں ایک کو کہتے ہیں ـــــ مسئلہ توحید سے سلسلہ کھینچ کر پھر واقعۂ کربلا اور شہادت علی اکبرؓ سے ملا دیا جاتا۔ یہ چھمّو بیگم کے آرٹ کا کمال تھا۔

بڑی بھاوج کیا سارے محلّے کو معلوم تھا کہ چھمّو بیگم خاصی فراڈ ہیں لیکن ان کی شمولیت کے بغیر مجلس میں جان ہی نہ پڑ سکتی تھی، لہٰذا ان کی بدمزاجی کو بھی برداشت کیا جاتا۔

برسوں سے، جب سے بڑی بھاوج پیدا ہوئیں، بڑی ہوئیں، رخصت ہوکر بارہ بنکی سے جون پور آئیں۔ زندگی کا ایک چلن قائم تھا جس میں شادی بیاہ، تیج تہوار، لڑائی جھگڑے، محرم، کونڈے، جوگی رم پورے کی سالانہ زیارت، غرض کہ ہر چیز کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم تھی۔ ڈپٹی جعفر عبّاس سے بڑی دھوم دھام سے ان کا بیاہ رچایا گیا تھا، جب وہ پندرہ سال کی تھیں۔ کیا زمانے تھے۔ دو فرلانگ لمبا توما ہی مراتب ہی تھا۔ براتیوں کو چاندی کی تشتریوں میں سندیلے کے لڈو بانٹے گئے تھے اور جناتیوں یعنی لڑکی کے گانو والوں کے یہاں ہفتوں مہینوں پہلے سے ڈھولک رکھ دی گئی تھی۔ ان کا میکہ وسسرال دونوں طرف سے ماشاء اللہ سے بھرا پُرا کنبہ تھا۔ بس ایک چھوٹی اماں ہی سے ان

کی نہ بنی۔ دیورانی جیٹھانی کا دیوار بیچ گھر تھا لیکن مدتوں کھڑکی میں تالا پڑا رہا۔ مقدمے کا قصہ دراصل امام باڑے والے آموں کے باغ سے چلا تھا۔ بعد میں رفتہ رفتہ دونوں بھائیوں کے گھرانوں میں بول چال تک بند ہوگئی۔ سچ کہا ہے بُوا کہ زر، زمین، زن تین چیزیں گھر کا گھروا کر دیتی ہیں۔ سگے بھائی غیر ہو جاتے ہیں پر جب چھوٹی اماں بیمار پڑیں تو بڑی بھاوج نے وضعداری پر حرف نہ آنے دیا اور مرنے سے پہلے دیورانی سے ساری اگلی پچھلی شکایتوں کو بھول کر کہا سنا معاف کروالیا۔ اس پر بھی کہنے والوں کا بھن منہ کس نے بند کیا ہے، محلّے میں اُڑ گئی کہ یہ چھوٹی اماں اپنے غلے کی کوٹھری میں سونے کی مہریں دفن کیے بیٹھی تھیں۔ یہ ان کو حاصل کرنے کی ترکیبیں تھیں۔ پوچھو بڑی بھاوج کے پاس خدا کا دیا خود کیا کچھ نہیں، جو وہ ایسے کمینے خیالات دل میں لاتیں اور اصلیت یہ ہے کہ چھوٹی اماں کی وہ سونے کی مہروں والی جھجھری جس پر عمر بھر وہ مایا کا سانپ بنی بیٹھی رہیں۔ اُدت کے مال سے بھی بدتر ثابت ہوئی۔ لڑکوں نے لے کر سارا پیسا دو سال کے اندر اڑا دیا بلکہ بُوا مُدن تو یقین محکم کے ساتھ کہتی تھیں کہ چھوٹی اماں اور بڑی بھاوج کی لڑائی کروانے میں زیادہ ہاتھ پھپھو بیگم کا ہے۔ حرافہ اِدھر کی اُدھر لگاتی تھی اور پھر سال کے سال منبر پر مولون بن کر چڑھ بیٹھتی ہے چڑیل۔

رونا بہرحال فرض تھا، خواہ پھپھو بیگم جیسی کُٹنی ہی بیان کیوں نہ پڑھے۔ لہٰذا بوا مُدن دیوار کے سہارے بیٹھی بڑے مشہدی رومال سے مُنہ ڈھانپے شایستگی سے سسکیاں بھرتی رہیں۔ لڑکیاں دہلیز پر بیٹھی بیٹھی اونگھ رہی تھیں اور منتظر تھیں کہ کب حدیث ختم ہو اور نوحہ خوانی کی باری آئے۔

نوحے پڑھنے میں بڑی بھاوج کی لڑکی کستوری کو ملکہ حاصل تھا۔ ہاتھ

آئے تھے کیا کیا گل زہرا کو فدائی ـــــ نواؤں نے دیکھی در خیمہ سے لڑائی ـــــ ارے لڑتے ہوئے گرتے ہوئے مرتے ہوئے دیکھا ـــــ اور جانے کون کون سے سارے جدید نوحے 'جی ہاں' ایسی پاٹ دار آواز میں آخری بند اٹھاتی کہ کھیم کے گھر تک آواز پہنچ جاتی تھی۔

نوحوں کی طرزیں نکالنا لڑکیوں کا خاص مشغلہ تھا۔ جہاں کوئی چلتا چلتا لیکن غمگین سی دُھن کا گیت ریکارڈ پر سُنا جھٹ ذرا سی تبدیلی کر کے نجم الملّت کے کسی نوحے پر اس دُھن کا چپکا دیا۔ طلعت آرا اس معاملے میں بڑی رجعت پسند واقع ہوئی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ بھئی یہ غلط بات ہے۔ یہ کیا ساتویں کی رات کو معلوم ہو کہ کانن بالا کا ریکارڈ بج رہا ہے۔ توبہ توبہ۔ مگر کشوری کس کی سنتی تھی۔ ویسے بھی وہ بڑی آزاد خیال روشن دماغ انسان تھی۔ ہائی اسکول تو اس نے پاس کر لیا تھا۔ وہ تو لکھنؤ جا کر لگے ہاتھوں انٹر اور بی۔اے بھی کر لے لیکن چھوٹی اماں جب مرتے وقت۔ بڑی بھاوج سے صلح صفائی کرنے پر تلیں تو یہاں تک طے کر گئیں کہ ان کے بڑے لڑکے میاں اعزاز سے اس کا بیاہ بھی کر دیا جائے۔

اب یہاں سے مسلم سوشل کلچر بننا شروع ہوئی۔ کشوری کہاں ایک تیز لڑکی۔ سارے نٹنگ کے نمونے اس کو آویں۔ جہاں پردہ باغ میں کوئی نیا نمونہ سوئٹر کا کسی کو پہنے دیکھ پاوے گھر آکر فوراً تیار ـــــ افسانے پڑھنے کی وہ شوقین۔ فیاض علی کی انور و شمیم سے لے کر کرشن چندر کی "نظارے" اور حجاب امتیاز علی کی "ظالم محبت" تک اس کی الماری میں موجود۔ سینما بھی جب موقع ملتا ضرور دیکھ لیتی۔ میاں اعزاز ایک تو یہ کہ خاصے مولوی آدمی تھے۔ پی۔سی۔ایس میں آگئے تھے۔ کیننگ کالج سے ایم۔اے۔ ایل۔ایل۔بی کر رکھا تھا لیکن اس کے روادار نہیں تھے کہ گھر کی لڑکیاں ذرا کی ذرا نمائش ہی میں ہو آئیں۔ خود بڑی دو دن

کی لیتے تھے کہ مس سکینہ سے یونین میں یوں بحث چلی اور مس صدیقی کے یہاں یوں چائے پر گیا لیکن اپنے کنبے کی لڑکیوں کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ لڑکیاں جہاں گھر سے باہر نکلیں، میاں زمانہ خراب ہے، کسی کو بدنام ہوتے کیا دیر لگتی ہے۔

بڑی بھاوج نے، لطیفہ یہ تھا کہ کشوری کے لیے بڑی منتیں مُرادیں مان رکھی تھیں۔ عاشورہ کے روز جب ذوالجناح اندر لایا جاتا تو جلیبی کھلانے کے بعد اس کے کان سے مُنہ لگا کر ساری بیبیاں اور ساری لونڈیاں دُعا مانگتیں کہ یا مولا کشوری بٹیا کا نصیبا اب کے سال کھلے ــــ

اب یہ پوچھو کہ یہ میاں اعزاز کے پلّے باندھنا نصیبے کا کھُلنا سمجھا جا رہا تھا لیکن کشوری نے بھی طے کر لیا تھا کہ عین بیاہ کے موقع پر وہ انکار کر دے گی۔ برات میں ایک ہڑبونگ مچ جائے گی۔ وہ جیسا کہ سوشل فلموں میں ہوتا ہے کہ عین وقت پر جب پھیرے پڑنے والے ہوں تو اصل ہیرو ہسپتال یا جیل سے چھُٹ کر پہنچ جاتا ہے اور گرج کر کہتا ہے "ٹھہر جاؤ یہ شادی نہیں ہو سکتی"ــــ

۵

کشوری کے بابا سیّد جعفر عباس ڈپٹی کلکٹر تھے لیکن دل کے بڑے پکّے قوم پرست مسلمان تھے۔ جب کانگریسی وزارت قائم ہوئی تو آپ نے بھی خوب خوب خوشیاں منائیں۔ حافظ ابراہیم ضلع میں آئے تو آپ مارے محبت کے جا کے ان سے لپٹ گئے۔ جب جنگ چھڑی اور کانگریسی وزارت نے استعفا دیا اور مسلم لیگ نے یوم نجات منایا تو کشوری کے بابا کو بڑا دُکھ ہوا۔ اب وہ ریٹائر ہو چکے تھے اور چبوترے پر بیٹھے پیچوان لگائے سوچا کرتے کہ دُنیا ہی بدلتی جا رہی ہے۔ لڑکے جن کو نوکری نہ ملتی تھی، اب فوج میں چلے جا رہے تھے۔ اپنا اصغر عبّاس ہی

اب لفٹیننٹ تھا۔ مہنگائی شدید تھی، لیڈر جیل میں تھے لیکن زندگی میں یک بیک ایک نیا رنگ آگیا تھا۔ حافظ ابراہیم کے آنے پر ضلع کے اُردو اخباروں نے لکھا تھا: ـــ کہاں گئی موٹر سرکاری، بیچا کر سبزی ترکاری، وہ بھی دیکھا، یہ بھی دیکھ ـــ کشوری کے بابا کو یہ سب پڑھ اور سن کر صدمہ ہوتا۔ وہ بڑے پکے مسلمان تھے۔ دراصل مسلمانوں کے معاشرے کا استحکام انھیں پرانے مدرسۂ فکر کے ڈپٹی کلکٹروں کے دم قدم سے قائم تھا۔ پردے کے بڑے پابند، کیا مجال جو لڑکیاں بغیر تناتوں چادروں کے گھر سے قدم نکالیں (صوبے کے مشرقی ضلعوں میں بُرقع کا رواج نہ تھا۔ "باعزت متوسط طبقے" کی مسلمان اور ہندو عورتیں چادریں اور دُلائیاں اوڑھ کر باہر نکلتی تھیں۔ ہندو عورتیں تو خیر گھونگھٹ کاڑھ کر سڑک پر سے گزر جاتی تھیں لیکن مسلمان بیبیوں کا دن دہاڑے باہر نکلنا سخت معیوب خیال کیا جاتا تھا۔

اصغر عباس فوج میں رہ کر بالکل انگریز بنتا جا رہا تھا۔ اب کے سے جب وہ چھٹی پر گھر آیا تو چند شرائط بابا کے سامنے رکھیں۔

(الف) وہ خود کنبے میں بیاہ نہ کرے گا۔

(ب) کشوری جب اس کے ساتھ رہنے کے لیے جبل پور جائے گی تو پردہ نہ کرے گی۔

(ج) اعزاز میاں سے بیاہ کا پروگرام منسوخ۔

(د) کشوری کو ایف۔اے کے لیے مسلم گرلز کالج لکھنؤ بھیجا جائے گا۔

بڑے بحث ومباحثے کے بعد بابا اور بڑی بھاوج دونوں نے ان شرائط کے کے بیشتر نکات منظور کر لیے۔

ہندستان کے مسلمان متوسط طبقے کا کوئی ہی خاندان ایسا ہوگا جس کی لڑکیوں نے کبھی نہ کبھی علی گڑھ گرلز کالج یا مسلم اسکول میں نہ پڑھا ہو۔ بیشتر لڑکیوں

کو اس بات پر فخر ہوتا ہے کہ انھوں نے چاہے چند روز ہی کے لیے کیوں نہیں، لیکن پڑھا مسلم اسکول میں ہے۔

بعینہٖ یہی احوال مہیلا ودّیالہ لکھنؤ کا تھا۔ صوبے کے سارے ٹھوس ہندو متوسط طبقے کی بیتریاں اس رِشی ودّیالے کی ودّیارتھی رہ چکی تھیں۔ سرکاری اور عیسائی اداروں کا ماحول مختلف تھا۔ وہاں انگریز کے اقبال کی وجہ سے شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے۔

اب کی جولائی میں کھیم اور کشوری اکٹھی ہی جون پور سے ٹرین میں سوار ہوئیں اور لکھنؤ آن پہنچیں۔ چار باغ پر ماما کھیم کو اُتروانے کے لیے آگئے تھے اور کشوری کو پہنچانے کے لیے تو ماجد بھائی بیچارے مردانہ ڈبّے میں موجود ہی تھے۔ اسٹیشن کی برساتی میں پہنچ کر کھیم اور کشوری نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا اور روئیں اور کبھی کبھی ملنے کی کوشش کرنے کا وعدہ کیا اور تانگوں میں بیٹھ کر اپنی اپنی راہ چلی گئیں۔

۶

"کھیم دتی رائے زادہ سے میری ملاقات اتنے برسوں بعد بینٹ ہال کی سیڑھیوں پر ہوئی ـــــ وہ چودھری سلطان کا لیکچر سننے جا رہی تھی۔ میں احتشام صاحب کی کلاس کے بعد پرشین تھیٹر سے اُتر رہی تھی ـــــ" کشوری نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ـــــ اور پھر وہ خاموش ہو گئی ـــــ اور کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی جہاں برف کے گالے چپکے چپکے نیچے گر رہے تھے ـــــ

"کیا تم نے کبھی سوچا ہے" اس نے ساتھیوں کو مخاطب کیا ـــــ "کہ ہم جو پچھلے سو سال تک ایک دیوار کے سایے میں رہے، ایک مٹی سے ہماری

اور اس کی تخلیق ہوئی تھی۔ اس کے اور ہمارے گھر والوں کو اپنے مشترکہ کلچر پر ناز تھا ـــــ چار سال بعد جب اس وقت کھیم نے مجھے دیکھا تو ایک لحظے کے لیے ذرا جھجکی پھر "ہلو کشوری" کہتی ہوئی آگے چلی گئی۔

"اور میں نے سوچا ٹھیک ہے، میں نے اور اس نے اسی دن کے لیے ساری تیاریاں کی تھیں۔ وہ مہیلا ودیالہ کی لڑکی ہے۔ کانگریس میں یقین رکھتی ہے، میرے بابا بڑے نیشنلسٹ بنتے تھے لیکن میں کٹر مسلم لیگی ہوں۔ یوم پاکستان کے جلسے کے موقع پر کھیم کے ساتھیوں نے ہمارے اوپر اینٹیں پھینکی تھیں۔ 'اکھنڈ ہندستان ویک' کے دنوں میں ہمارے رفقا نے ان کے پنڈال پر پکٹنگ کی تھی۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے یہی ٹھیک ہے اور بھائی زندگی نہ ہوئی شانتا رام کی فلم ہو گئی۔ بنو اچھے پڑوسی کرو بھائی چارہ، نہیں کرتے بھائی چارہ، میاں زبردستی ہے تمھاری۔ یہی ایک مثال میری اور کھیم کی دیکھ لو۔ جنم جنم کے پڑوسی تھے اور کیا دوستی اور یگانگت کا عالم تھا، پر تھے ہم ان کے لیے ملیچھ۔ ان کے چوکے کے قریب نہ پھٹک سکتے تھے اور ہماری اماں کا یہ سلسلہ تھا کہ اگر ہندو کی دکان سے کوئی چیز آئی تو اسے فوراً حوض میں غوطہ دے کر پاک کیا جاتا تھا۔ ایک قوم اس طرح بنتی ہے؟ تقسیم کا مطالبہ ہند کی ساری تاریخ کا نہایت فطری اور نہایت منطقی نتیجہ ہے ـــــ" کشوری چپ ہو گئی۔

آتش دان میں آگ لہک رہی تھی۔ کسی نے آہستہ سے ایک انگارا الاؤ میں سے نکال کر باہر گرا دیا، جہاں وہ چند لمحوں تک سلگتا رہا۔ اور پھر بجھ گیا۔ نیچے سڑک پر کوئی بھکاری اکارڈین پر "موجوں کے اوپر" کا والز بجاتا ہوا گزر رہا تھا۔

"آج میں کنول کماری کے ہاں چائے پر گئی تھی" ارملا نے کہا "وہاں بہت سے لوگ آئے ہوئے تھے۔ ان سب سے میں نے کہا کہ ہمارے "مجلس میلے

کو کامیاب بنانے کی کوشش کریں۔"

"کنول کماری؟" — کشوری نے کچھ یاد کرتے ہوئے سوال کیا۔

"ہاں، ہمارے نئے فرسٹ سکریٹری کی بیوی، اور میں نے سوچا کہ قابل عورت ہے اس سے میلے کے موقع پر ہندستانی آرٹ پر لگے ہاتھوں ایک تقریر بھی کروالیں۔ پام دت وغیرہ سب ہی ہوں گے۔ بچاری نے وعدہ کر لیا —"

"سوریہ است ہوگیا — سوریہ است ہوگیا" — دوسرے کمرے میں "میلے" کے پروگرام کی ریہرسل کرتے ہوئے چند لڑکیوں نے ہریندر ناتھ چٹو پادھیا کا کورس یک لخت زور زور سے الاپنا شروع کر دیا۔

" — میں نے بہت کوشش کر کے سوچا کہ میں جب یونی ورسٹی میں اور لوگوں سے ملتی ہوں — اٹلی کے لوگ ہیں، برازیل کے، عراق اور مصر کے۔ میں ان سے اس طرح کیوں نہیں باتیں کرنا چاہتی۔ پھر ہمارے پروفیسر ہیں "ہم عصر فنون" کی انجمن کے اراکین ہیں، انھوں نے ہمارے مسائل پر بڑی بڑی کتابیں لکھی ہیں، ہمارا دقیق مطالعہ کیا ہے، اخباروں میں وہ ہمارے متعلق اڈیٹوریل لکھتے ہیں، دارالعوام میں اور ریڈیو پر بحثیں کرتے ہیں —" کشوری نے کہا۔

"چاروں اور آگ لگی — دل میں بھوک پیاس جگی — یگ یگ ہم گاتے — ہم گاتے ہم گاتے —" لڑکیاں چلا رہی تھیں۔

"میرا جی چاہتا ہے، میں تم سے یہ سب باتیں کہوں، تم کو یہ سارا قصہ یہ سارا گورکھ دھندا سمجھاؤں —" اس نے ساتھیوں کو اداس آواز میں مخاطب کیا — "تاکہ تم لوگ مجھے بھی ایک اور مضحکہ خیز کردار نہ سمجھو اور اس سارے

پس منظر اس ساری کہانی کو اس فاصلے سے دیکھ کر اپنی راہ کا تعین کرو۔

سڑک پر کیرل گانے والوں کی ٹولیاں گزرنی شروع ہو گئی تھیں۔

"کرسمس کا زمانہ بھی اختتام پر ہے۔" روز ماری نے اظہارِ خیال کیا۔

ہاں، جون پور میں، میرے محلے میں، بچے کھچے سوگوار جہلم کے تعزیوں کے سائے میں بیٹھے اپنی قسمت کو روتے ہوں گے۔ نہیں شاید محرم کا زمانہ گزر گیا ہوگا، پرانے کیلنڈر بے کار ہو چکے ہیں، مجھے کچھ پتا نہیں — کشوری نے دل میں کہا۔

"برف باری شدید ہو گئی ہے۔ پھر بہار آئے گی، کیا سارے زمانے، سارے موسم اتنے بے مصرف ہیں —؟" روز ماری نے اپنے آپ سے بات کی۔

نہیں —" کشوری نے کہا۔

"یگ یگ ہم گاتے چلیں —" لڑکیوں کی آواز نے تکرار کی۔

۷

چار باغ اسٹیشن پر کھیم کو آخری بار خدا حافظ کہنے کے بعد اب کشوری کو دم لینے کی فرصت بھی کہاں تھی۔ پہلے مسلم اسکول، پھر چاند باغ، پھر کینگ کالج۔ زمانہ کہاں سے کہاں نکل گیا تھا۔ ہر ہنگامے میں کشوری موجود۔ مباحثے ہو رہے ہیں، بیڈ منٹن ٹورنامنٹ ہیں، مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی کی مصروفیات ہیں۔ ادھر ہندو اسٹوڈنٹس فیڈریشن تھا۔ مہا سبھائی طالبات کے جلسے جلوس تھے، جن میں کبھی کبھی کھیم رائے زادہ دور سے نظر آ جاتی۔ طالب علموں کی دنیا اچھی خاصی سیاسی اکھاڑہ بن گئی تھی۔ گھر پر واپس جاؤ تو وہی سیاست، کل کی تشویش، مستقبل کی فکر، ملک کی تقسیم ہوگی، نہیں

ہوگی، ہوگی، نہیں ہوگی۔

یونیورسٹی میں لیکچرز کے دوران میں پروفیسروں سے جھڑپ ہو جاتی۔ سطحی طور پر ابھی دوستی اور بھائی چارہ قائم تھا لیکن آخری "شوڈاؤن" کے لیے اسٹیج بالکل تیار تھا۔

ڈاکٹر آفتاب رائے ابھی تک ہسٹری ڈپارٹمنٹ میں موجود تھے۔ ایک روز ایک لیکچر کے دوران میں ان سے بھی کچھ تکرار ہوگئی۔ ایک ہندو طالب علم نے کہا: "آزادی کا مطلب ڈاکٹر صاحب مکمل سوراج ہے، ہند کی دھرتی کو پھر سے شدھ کرنا ہے۔ ساری ان قوموں کے اثر سے آزاد ہونا ہے جنھوں نے باہر سے آکر حملہ کیا۔ یہی تلک جی نے کہا تھا، جی ہاں۔"

اس پیریڈ میں شیواجی کے اوپر گفتگو ہو رہی تھی۔ لہٰذا خانہ جنگی ناگزیر تھی۔ شام تک ساری یونیورسٹی میں خبر پھیل گئی کہ ڈاکٹر آفتاب رائے کی کلاس میں ہندو مسلم فساد ہو گیا۔

اگلی صبح کشوری پورا جلوس بنا کر ڈاکٹر آفتاب رائے کے دفتر میں پہنچی۔

"ڈاکٹر صاحب ــــ" اس نے نہایت رعب داب سے کہنا شروع کیا ــــ "کل جس طرح آپ نے حضرت اورنگ زیب علیہ الرحمتہ کے متعلق اظہارِ خیال کیا اس کے لیے معافی مانگیے، ورنہ ہم اسٹرائک کر دیں گے، بلکہ کر دیا ہے اسٹرائک ہم نے ــــ آپ نے ہماری سخت دل آزاری کی ہے۔"

آفتاب رائے اچنبھے سے کشوری کو دیکھتے رہے ــــ ارے تو تو ڈپٹی جعفر عباس کی بٹیا ہے نا۔ اری باولی سی ــــ وہ بے ساختہ کہنا چاہتے تھے لیکن کشوری کے تیور دیکھ کر رک گئے اور پہلو بدل کر سنجیدگی سے کھنکارے "بات یہ ہے مس عباس ــــ" انھوں نے کہنا شروع کیا، "سیاست اور

حصولِ تعلیم کے درمیان جو —"
"اجی ڈاکٹر صاحب بس اب رہنے دیجیے —" کسی نے آگے بڑھ کر کہا
"ہم خوب اس ڈھونگ کو جانتے ہیں، معافی مانگیے قبلہ —"
"ڈاکٹر صاحب میں نے کہا بنارس کیوں نہیں واپس چلے جاتے —؟"
دوسری آواز آئی۔
"دیکھو میاں صاحبزادے —" آفتاب رائے نے رسان سے کہا۔
"معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تاریخ کے متعلق میرے چند نظریے اور اصول ہیں۔ میں اور تمھاری دل آزاری کروں گا؟ کیا باتیں کرتے ہو —؟"
"ہم کچھ نہیں جانتے —" انھوں نے شور مچایا —"معافی مانگیے، ورنہ ہم کل اورنگ زیب ڈے منائیں گے۔"
"ضرور مناؤ —" آفتاب رائے نے یک لخت بے حد اُکتا کر کہا۔
"اور مکمل اسٹرائک کریں گے۔"
"ضرور کرو — خدا مبارک کرے —" انھوں نے آہستہ سے کہا اور چق اُٹھا کر اندر چلے گئے۔
"کٹر مہا سبھائی نکلا یہ بھی —" لڑکوں اور لڑکیوں نے آپس میں کہا اور برساتی سے باہر نکل آئے۔

وہ رات آفتاب رائے نے شدید بے چینی سے کاٹی۔ حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ مسلمان طالب علموں کو اچھے نمبر نہ ملتے۔ ہندوؤں کو یوں ہی پاس کر دیا جاتا۔ ہوسٹلوں میں ہندو مسلمان اکٹھے رہتے تھے لیکن جس ہوسٹل میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اس پر سبز پرچم لہرانے لگا تھا۔ اس کے جواب میں عین مغرب کی نماز کے وقت ہندو اکثریت والے ہوسٹلوں میں لاؤڈ اسپیکر

نصب کر کے گراموفون بجایا جاتا۔

چند روز بعد آفتاب رائے کے سر میں جانے کیا سمائی کہ استعفا دے دیا اور غائب ہو گئے۔ سارے میں ڈھنڈیا مچ گئی۔ مگر آفتاب نہ اب ملتے ہیں نہ تب۔ لوگوں نے کہا ایک چول ہمیشہ سے ڈھیلی تھی، سنیاس لے لیا ہوگا۔ پھر تقسیم کا زمانہ آیا۔ اب کسے ہوش تھا کہ آفتاب رائے کی فکر کرتا۔ اپنی ہی جانوں کے لالے پڑے تھے۔

ملک آزاد ہو گیا۔ کھیم وتی کی شادی ہو گئی۔ کشوری کے گھر والے آدھے پاکستان چلے گئے۔ اس کے بابا اب بہت بوڑھے ہو گئے تھے۔ آنکھوں سے کم سجھائی دیتا تھا۔ ایک ٹانگ پر فالج کا اثر تھا۔ دن بھر وہ جون پور میں اپنے گھر کی بیٹھک میں پلنگڑی پر لیٹے نادِ علی کا ورد کیا کرتے اور پولیس ہر وقت ان کو تنگ کرتی۔ آپ کے بیٹے کا پاکستان سے آپ کے پاس کب خط آیا تھا؟ آپ نے کراچی میں کتنی جایداد خریدی ہے؟ آپ خود کب جا رہے ہیں؟ اصغر عباس ان کا اکلوتا لڑکا تھا اور اب پاکستانی فوج میں میجر تھا۔ نہ وہ ان کو خط لکھ سکتا تھا اور اگر مر جائیں تو مرتے وقت وہ اس کو دیکھ بھی نہ سکتے تھے۔ وہ تو کشوری کے لیے مصر تھا کہ وہ اس کے پاس راولپنڈی چلی آئے لیکن ڈپٹی صاحب ہی نہ راضی ہوئے کہ آخری وقت بٹیا کو بھی نظروں سے اوجھل کر دیں۔ وہی کشوری تھی جس کی ایسے بسم اللہ کے گنبد میں پرورش ہوئی تھی۔ اور اب وقت نے ایسا پلٹا کھایا تھا کہ وہ جون پور کے گھر کی چار دیواری سے باہر مدتوں سے لکھنؤ کے کیلاش ہوسٹل میں رہ رہی تھی۔ ایم۔ اے میں پڑھتی تھی اور اس فکر میں تھی کہ بس ایم۔ اے کرتے ہی پاکستان پہنچ جائے گی اور ملازمت کرے گی۔ ارے صاحب آزاد قوم کی لڑکیوں کے لیے ہزاروں باعزت

راہیں کھلی ہیں. کالج میں پڑھا یئے، نیشنل گارڈ میں بھرتی ہو جیے۔ اخباروں میں مضمون لکھیے، ریڈیو پر بولیے۔ کوئی ایک چیز ہے؟ جی ہاں، وہ دن گن رہی تھی کہ کب دو سال ختم ہوں اور کب وہ پاکستان اڑنچھو ہو ــــ لیکن پھر بابا کی محبت آڑے آجاتی۔ دُکھیا اتنے بوڑھے ہوگئے ہیں، آنکھوں سے سُجھائی بھی نہیں دیتا۔ کہتے ہیں بٹیا کچھ دن اور باپ کا ساتھ دے دو، جب میں مرجاؤں تو جہاں چاہنا جانا۔ چاہے پاکستان چاہے انگلینڈ اور امریکہ ــــ میں اب تمھیں کسی بات سے روکتا تھوڑا ہی ہوں۔ بٹیا تم بھی چلی گئیں تو میں کیا کروں گا۔ محرّم میں میرے لیے سوز خوانی کون کرے گا۔ میرے لیے لوکی کا حلوا کون بنائے گا۔ پوت پہلے ہی مجھے چھوڑ کر چل دیا پھر ان کی آنکھیں بھر آتیں اور وہ اپنی سفید داڑھی کو جلدی جلدی پونچھتے ہوئے یا علی کہہ کر دیوار کی طرف کروٹ کر لیتے۔

بڑی بھاوج ان سے کہتیں ــــ دیوانے ہوئے ہو، بٹیا کو کب تلک اپنے پاس بٹھلاؤ گے، آج نہ گئی کل گئی۔ جانا تو اسے ہے ہی ایک دن۔ یہاں اس کے لیے اب کون سے رشتے رکھے ہیں ــــ سارے اچھے اچھے لڑکے ایکو ایک پاکستان چلے گئے اور وہاں ان کی شادیاں بھی دھیا دھپ ہو رہی ہیں یہ اصغر عباس کے پاس پہنچ جاتی تو وہ اسے بھی کوئی ڈھنگ کا لڑکا دیکھ کر ٹھکانے لگا دیتا ــــ بڑی بھاوج کی اس شدید حقیقت پسندی سے کستوری کو اور زیادہ کوفت ہوتی اور یہ ایک واقعہ تھا کہ اس نے پاکستان کے مسئلے پر اس زاویے سے کبھی غور ہی نہ کیا تھا۔ ویسے وہ سوچتی کہ بابا ہندستان میں ایسا کیا کھونٹا گاڑ کر بیٹھے ہیں۔ اچھے خاصے ہوائی جہاز سے چلے چلتے مگر نہیں اور یہ جو بابا کی قوم پرستی تھی۔ سارا جون پور عمر بھر سے واقف ہے کہ بابا کتنے بڑے نیشنلسٹ تھے، تب بھی پولیس پیچھا نہیں چھوڑتی۔ سارے حکام اور پولیس والے

جن کے سنگ جنم بھر کا ساتھ کا اُٹھنا بیٹھنا تھا' وہی اب جان کے لاگو ہیں۔ کل ہی عجائب سنگھ چوہان نے جو عمر بھر سے روزانہ بابا کے پاس بیٹھ کر شعر و شاعری کرتا تھا دوبار دوڑ بھجوا کر خانہ تلاشی لی' گویا ہم نے بندوقوں اور ہتھیاروں کا پورا میگزین دفن کر رکھا ہے۔ پھر اسے بابا پر ترس آجاتا۔ بچارے بابا۔

اب ڈپٹی صاحب کی مالی حالت بھی ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ اصغر عباس پاکستان سے روپیا نہ بھیج سکتا تھا۔ جو تھوڑی بہت زمینیں تھیں ان پر ہندو کاشتکار قابض ہو گئے تھے اور دیوانی کی عدالت میں ڈپٹی صاحب کی فریاد کی شنوائی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ چھوٹی اماں مرحومہ کی مقدمے بازیوں کے بعد جو کچھ زیور بچ رہا تھا وہ بڑی بھاوج نے سمیٹ کر بہو کے حوالے کر دیا تھا' جو وہ پاکستان لے گئی تھی۔ باقی روپیا ڈپٹی صاحب کی پنشن کا کشوری کی تعلیم پر خرچ ہو رہا تھا۔ ان کے علاج کے لیے کہاں سے آتا اور فالج تو ایسا روگ ہے کہ جان لے کر پیچھا چھوڑتا ہے۔ چنانچہ نوبت یہ پہنچی کہ چپکے چپکے بڑی بھاوج نے چھمو بیگم کے ذریعے چند ایک گہنے جو بچ رہے تھے فروخت کروا دیے۔ ویسے اس میں ایسی شرم کی تو کوئی وجہ نہ تھی۔ وہ جو مثل ہے کہ مرگِ انبوہ جشنے دارد' ان گنت مسلمان گھرانے ایسے تھے جو اپنے گہنے اور چاندی کے برتن بیچ بیچ کر گزارا کر رہے تھے لیکن بڑی بھاوج ناک والی آدمی تھیں اور ابھی ان کے بھلے وقتوں کو گزرے عرصہ ہی کتنا ہوا تھا۔ کشوری کو جب یہ معلوم ہوا تو اس کی سٹی گم ہو گئی۔ اس نے پاکستان جانے کا خیال ترک کر دیا اور سرگرمی سے ملازمت کی تلاش میں جٹ گئی۔

لیکن ایک جگہ تو اس سے صاف صاف کہہ دیا گیا کہ صاحب بات یہ ہے کہ جگہ تو خالی ہے لیکن ہم شرنارتھی لڑکیوں کو ترجیح دے رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ آپ کسی خانگی مجبوری کی وجہ سے ہندستان میں رکی ہوئی ہیں۔ پہلا موقع

ملتے ہی آپ بھی پاکستان چلی جایئے گا۔

اور وہ گھوم پھر کر جون پور لوٹ آئی۔ بڑی بھاوج نے اس سے کہا —— وہ تمھاری گوئیاں کلیم کے ماموں آفتاب بہادر تھے۔ ان کو ہی جا پکڑو۔ وہ تو بڑے بااثر آدمی ہیں اور بڑے شریف، ضرور مدد کریں گے اور کشوری کو خیال آیا کس طرح وہ جلوس بنا کر ان کے پاس پہنچی تھی اور ان کو سخت سُست سنائی تھیں، اس کے اگلے ہفتے ہی وہ غائب ہو گئے تھے۔

آفتاب رائے —— اب پتا نہیں وہ کہاں ہوں گے۔ اُڑتی اُڑتی سُنی تھی کہ بمبئی میں حکومت کے خلاف تقریر کرنے کے جرم میں ان کو احمد آباد جیل میں بند کر دیا گیا تھا۔ جیل سے چھوٹے تو کچھ اور گڑبڑ ہوئی اور اب شاید وہ روس میں ہیں اور سمرقند ریڈیو سے اُردو میں خبریں سُناتے ہیں۔ دوسری روایت تھی کہ نہیں صاحب ڈاکٹر آفتاب رائے تو آج کل پنڈت جی کی بالکل مونچھ کا بال بنے ہوئے ہیں اور ان کو ری پبلک یا ڈورا میں ہند کا سفیر بنا کر بھیجا جا رہا ہے۔ بہرحال، ڈاکٹر صاحب تو عرصے سے گویا مستقل "زیرِ زمین" تھے۔

بچارے آفتاب رائے۔

آج چاند رات تھی۔ محلّے میں نقّارہ رکھا جا چکا تھا۔ مجلسیں اب بھی ہوتیں لیکن وہ چہل پہل، رونق اور بے فکری تو کب کی خواب و خیال ہو چکی تھی۔ ڈیوڑھی میں ڈولیاں اُترنی شروع ہوئیں اور بیبیاں آ آ کر امام باڑے کے دالان میں بیٹھنے لگیں۔ کشوری بیدلی سے دہلیز پر اپنی پُرانی جگہ پر بیٹھی رہی۔ دالان کی چاندنی جس پر تل دھرنے کو جگہ نہ ہوتی تھی اب چھدری چھدری نظر آتی تھی۔ سارے خاندانوں میں سے دو دو تین تین افراد تو ضرور ہی ہجرت کر گئے تھے۔ بڑی بھاوج بہت مشکل سے پانو گھسیٹتی اِدھر اُدھر چل رہی تھیں۔ اب وہ اللّے تللّے کہاں۔

ساری مہریاں اور کہاریں اور ماما ئیں ایک ایک کر کے چھوڑ کر چل دیں۔ بس نگوڑی مولا رہ گئی تھی۔ سو اس کی آواز کو بھی پالا مار گیا تھا لیکن چھمّو بیگم کو آتا دیکھ کر وہ پھر للکاری ـــ آگئیں چھمّو بیگم ـــ آؤ جم جم آؤ۔

چھمّو بیگم چُپ چاپ آکر منبر کے پاس کھڑی ہوگئیں۔ زیارت پڑھ کے تعزیوں کو جھک کر سلام کرنے اور کنپٹیوں پر انگلیاں چٹخا کر جناب علی اصغر کے سبز جارجٹ کے گہوارے کی بلائیں لینے کے بعد انھوں نے علموں کو مخاطب کر کے آہستہ سے کہا ـــ "مولا یہ میرا آخری محرم ہے۔ ارے اب تمھاری مجلسیں یہاں کیسے کروں گی" ـــ اور یہ کہہ کر انھوں نے زور شور سے رونا شروع کر دیا۔

بوا مُدّن اپنی پُرانی "دشمناگی" فراموش کر کے سرک کر اُن کے قریب آبیٹھیں اور بولیں ـــ "لو بوا غم حسینؑ کو یاد کرو، اپنا غم ہلکا ہو جائے گا ـــ مولا تو ہر جگہ ہیں۔ کیا پاکستان میں نہیں ہیں ـــ"

"ہاں ـــ ہاں ـــ" باقی بیبیوں نے آنسو خشک کرتے ہوئے تائید کی ـــ "مولا کیا پاکستان میں نہیں ـــ تم وہاں مولا کی مجلسیں قائم کرنا۔"

"لو بوا ـــ ہم بھی چل دیے پاکستان ـــ" جب محفل کی رقّت ذرا کم ہوئی اور چھمّو بیگم چاند رات کا بیان ختم کر چکیں تو بُوا مُدّن نے اپنا اناؤنسمنٹ بھی کر ڈالا۔

"سچ کہو بوا مُدّن ـــ" بڑی بھاوج نے گوٹا پھانکتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں بیوی، چل دیے ہم بھی ـــ" بوا مُدّن نے اعتراف کیا۔

"کیسے چل دیں ـــ؟" بڑی بھاوج کو ایک طرح سے تو رشک ہی آیا۔ اچھے خاصے لوگ نکلتے چلے جا رہے ہیں، سب فضیحتوں سے الگ، سارے دلدّر دور ہو جاویں گے وہاں پہنچ کر۔

"بس بڑی بھاوج لڑکا نہیں مانتا — وہاں سے ہر بار خط میں لکھتا ہے کہ بس امّاں آجاؤ — کوئی بگوڑی جگہ سکھر ہے، وہاں اس نے راشن کی ڈپو کھول لی ہے۔"
"اچھا — ؟ شکر ہے، مولا سب کی بگڑی بنائیں —" بڑی بھاوج نے کہا۔
"عاشور کی شب لیلیٰ —" بوا مدّن نے جو حسب معمول عینک گھر بھول آئی تھیں دوبارہ غلط مرثیہ شروع کیا۔ لیکن سب پر ایسی اُداسی اور اُکتاہٹ طاری تھی کہ کسی نے ان کی تصحیح کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ بگّن نے آواز ملائی — چراغوں کی روشنی دالان میں مدھم سا زرد اُجالا بکھیرتی رہی۔ آنگن کا گیس کا ہنڈا پیلا پڑتا جا رہا تھا۔

اس تاریکی میں کشوری سیاہ دوپٹے سے سر ڈھانپے اپنی جگہ پر اکڑوں بیٹھی سامنے رات کے آسمان کو دیکھتی رہی۔

۸

کنول کماری جین نے مہمانوں کے جانے کے بعد نشست کے کمرے میں واپس آ کر دریچوں کے پردے گرائے اور چائے کا سامان میزوں پر سے سمیٹنے لگی۔ مدراسی آیا ایک ہی تھی جسے وہ ہمراہ لیتی آئی تھی اور پردیس میں ملازموں کے نقدان پر اس نے ملٹری اڈوائزر بریگیڈیر کھنّہ کی بیوی سے بڑا رقت انگیز تبادلۂ خیالات کیا تھا۔ گھر کی صفائی اور بچّے کی دیکھ بھال کے بعد جو اُسے وقت ملتا اس میں وہ رائل اکیڈمی آف ڈریمیٹک آرٹ جا کر کریوگرفی سیکھتی تھی۔ سر لارنس اور لیڈی اولیویر، انتھنی ایسکویتھ کرسٹفر فرائی ان سب سے اس کی بڑی گہری دوستی تھی۔ یہ سب مل کر گھنٹوں فن اداکاری، جدید آرٹ اور ہندستانی بیلے پر گفتگو کرتے۔ جین کے پاس ان سب بکھیڑوں کا

وقت نہ تھا۔ ساڑھے آٹھ بجے رات کو تو وہ دفتر سے نیٹ کرانڈیا ہاؤس سے لوٹتا۔ اور وہ تو صاف صاف کہتا تھا۔ کہ بھائی میں انٹلکچویل ونٹلکچویل نہیں ہوں، سیدھا سادا آدمی ہوں اور جس ڈھرّے پر سن پینتیس سے چل رہا ہوں وہی میرے لیے ٹھیک ہے۔ انگریز کے زمانے میں وہ ملک کے طبقاتی قطب مینار کی سب سے اونچی سیڑھی پر پہنچ چکا تھا اور اب تو وہ اتنا اونچا تھا کہ بالکل بادلوں پر براجمان تھا۔ انگریز کے زمانے میں ڈریس سوٹ پہنتا۔ اب سفید چوڑی دار پاجامے اور سیاہ شیروانی میں ملبوس سفارتی ضیافتوں میں کیا ہلکی پھلکی نپی تلی باتیں کرتا۔ خود کنول کیا کم معرکے کی خاتون تھی۔ جہاں جاتی محفل جگمگا اٹھتی۔ واہ واہ، مثلاً آج ہی کی پارٹی میں اس نے کوریا کی کرشنا مینن والی تجویز کے سلسلے میں "نیو اسٹیٹس مین اینڈ نیشن" کے اڈیٹر کنگرلے مارٹن اور جدید شاعر لوئی مک نیس دونوں کے چھکّے چھڑا دیے، سب کو قائل ہونا پڑا چاند باغ کے اچھے پرانے سنہرے دنوں میں تو خیر وہ یوں ہی جھیسٹ میں انٹلکچویل بن گئی تھی کہ یونی ورسٹی کی زندگی کا یہ ایک لازمی جزو تھا۔ پر یہ تو ان دنوں اس کے سان دگمان میں بھی نہ تھا کہ ایک روز وہ اُن ساری جید بین الاقوامی گلیمرس ہستیوں سے یوں بھائی چارے کے ساتھ ملا کرے گی، جیسے وہ سب گاجر مولی ہیں۔

"سوریہ است ہو گیا —— سوریہ است ہو گیا ——" ارملا گنگناتی ہوئی اندر آئی۔

"کنول دیدی — جاتے جاتے مجھے خیال آیا کہ ایک بار آپ کو پھر یاد دلا دوں کہ آپ کو مجلس میلے میں آنا ہے —"

"ہاں ہاں بھئی —" کنول نے جواب دیا "اور وہ میری کتاب لیتی جاؤ —"

"ارے ہاں — " ارملا نے رک کر کہا "وہ تو ڈاکٹر آفتاب رائے نے مجھ سے لے لی۔ وہ مجھے انڈیا آفس لائبریری سے نکلتے ہوئے مل گئے، چھین کر لے گئے، کہنے لگے کل دے دیں گے"

"ڈاکٹر — آفتاب — رائے — ؟" کنول نے دہرایا۔

"ہاں کنول دیدی — " ارملا نے اسی طرح لاپروائی سے بات جاری رکھی "وہ تو دن بھر یوں ہی لائبریریوں میں گھسے رہتے ہیں۔ آج کل ایک نئی کتاب لکھ رہے ہیں۔ آج مہینوں کے بعد اتفاقاً نظر آ گئے۔ ان کا کوئی بھروسا تھوڑا ہی ہے لیکن کل وہ براڈکاسٹنگ ہاؤس آ رہے ہیں، وہاں کتاب مجھے لوٹا دیں گے۔ اچھا گڈ نائٹ کنول دیدی —"

"گڈ نائٹ ارملا —"

"ارے ہاں" اس نے جاتے جاتے رک کر پھر کہا "کل آپ رائل کمانڈ پرفورمنس میں جاری رہی ہیں — ؟ آپ کو تو سر رالف رچرڈسن نے خود ہی بلایا ہوگا"

"ارے نہیں بھئی —" کنول نے پیشانی پر سے بال ہٹا کر تھکی تھکی ہوئی آواز میں کہا (یہ بھی اس کا ایک پوز ہے" ایک دل جلی مسز اچاریہ نے جو سکنڈ سکریٹری کی بیوی تھی، مارے حسد کے اپنی ایک سہیلی سے کہا تھا "جانتی ہے کہ بکھرے ہوئے بال اس کے اوپر زیادہ اچھے لگتے ہیں، چڑیل کہیں کی") نہیں بھئی ارملا مجھے یہ پارٹیوں اور سفارتی مصروفیتوں کا سلسلہ بعض دفعہ بالکل بور کر دیتا ہے۔ اس سے کہیں پناہ نہیں —"

"اچھا گڈ نائٹ —"

"اچھی طرح سوؤ —" کنول نے کہا۔ ارملا ہریندر ناتھ چٹوپادھیا کا کورس

گنگناتی ہوئی نچلی منزل میں اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔
انڈیا آفس لائبریری سے نکلتے ہوئے مل گئے ــــ ڈاکٹر آفتاب رائے مل گئے۔ ابھی ان کا کوئی بھر دسا تھوڑا ہی ہے، چھین کرلے گئے ــــ کہنے لگے کل دے دیں گے ــــ وہ صوفے پر بیٹھ گئی ــــ "واسنتھی"ــــ اس نے چلّا کر آواز دی "کھانا گرم کر لگا دو ــــ" اس نے ٹیلی وژن کھولا۔ بکواس ہے۔ بند کر دیا۔ پھر اس نے ریڈیو لگایا۔ بکواس تھا۔ اسے بھی بند کر دیا۔ کیا پتا اس سمے لکھنؤ ریڈیو پر ارچنا بنرجی گاتی ہو پوہوڑی چھورنا ــــ نکر بوجوئے ہو ــــ اور چاند باغ کی خاموش سڑکوں پر سے لڑکیاں لینٹرن سروس کے بعد لوٹتی ہوں گی۔
میں نے کیا کیا تھا ــــ؟ اس نے سوال کیا۔ کچھ نہیں۔ میں اب دس سال سے کنول کماری جین ہوں۔ یہ تو کچھ بات نہ بنی۔ بات کس طرح بنتی ہے۔ کیوں نہیں بنتی ــــ سال گزرتے جا رہے ہیں۔ میں کنول کماری جس نے یہ سب دیکھا ایک روز یوں ہی ختم ہو جاؤں گی اور تب بہت اچھا ہوگا۔
ایسا نہ ہونا چاہیے تھا۔ پر ہو گیا۔
کنول ڈارلنگ ــــ ثروت نے انگلی اٹھا کر سخت صوفیانہ انداز میں اس سے کہا تھا ــــ جن ڈھونڈھا تن پائیاں گہرے پانی بیٹھ ــــ
ــــ میں برہن ڈوبت ڈری رہی کنارے بیٹھ ــــ؟ کنول نے سوچا تھا۔
کنارہ بھی تو نہیں ہے ــــ
پانے کے کیا معنی ہیں؟ کیا ملتا ہے؟
باہر اندھیرا تھا اور سردی، اور بیکراں خاموشی۔ میں زندہ ہوں۔
ارے بھئی آفتاب بہادر ــــ اس نے غصّے سے سر ہلا کر دل میں سوال کیا ــــ تم کیوں چلے گئے تھے۔ میں نے تمھارا کچھ بگاڑا تھوڑا ہی تھا۔ تم اپنے

آپ میں مگن رہتے ہیں وہیں کہیں تمھاری زندگی کے تانے بانے کسی کونے میں آکر چپکی بیٹھ جاتی اور بس تمھارے لیے پوریاں بنایا کرتی۔ تم اسی طرح رہتے۔ اس میں تمھاری شکست نہ تھی، تمھاری تکمیل تھی میاں آفتاب بہادر —؟

نیچے کیرل گانے والے ہیتھ کی طرف نکل گئے تھے۔

آفتاب بہادر — اب جو میں ہوں اور جو تم ہو — کیا یہی بہت ٹھیک ہے؟

بہت زمانہ ہوا اس نے چاند باغ میں ایک لڑکی کو دیکھ کر جو آفتاب رائے کو بہت پہلے سے جانتی تھی، سوچا تھا کہ جنے آفتاب کی بیوی کیسی ہوگی (ایک بار خود اس کے لیے اس کی دوست ثروت نے ایک بورسے آدمی کی تصویر سامنے لاکر کہا تھا۔ آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ — ! اور کمال یہ کہ عین مین اسی طرح کا آدمی جین نکلا —) آفتاب کی بیوی۔ یہ فقرہ کتنا عجیب لگتا تھا۔ کوئی ہوگی چڑیل۔ آخر میں یہ سب کرکری کھاتے ہیں — ثروت نے اضافہ کیا تھا جو خوبصورت تو ضرور ہوگی اور ٹینس کھیلتی ہوگی، جس کا آفتاب کو اتنا شوق ہے۔ لیکن فراٹے بھرنے اور ہوا میں اُڑنے والی لڑکیاں تو وہ سخت ناپسند کرتا تھا۔ جس کو وہ پسند کرے گا وہ تو بہت ہی عمدہ ہوگی بس بالکل مجموعۂ خوبی۔ چندے آفتاب چندے مہتاب، جی ہاں، اور مجھ میں کیا بُرائی تھی؟ اُس نے طے کرنا چاہا کہ آفتاب کا رویہ یہ تھا کہ اس پر کنول کماری پر یہ وحی اُترنی چاہیے تھی کہ یہ مہاپُرش، آسمان پر سے خاص اس کے لیے بھیجا گیا ہے۔ لیکن یہ اس کی اپنی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ اس کنول کماری سے یا روزانہ آکر ملے یا کبھی نہ ملے۔ اُس سے طبلہ اور بجے بجے دنتی سُنے۔ پوریاں بنوا کر کھائے۔ پھر ایک روز اطمینان سے آگے چلا جائے اور یہ کنول کماری بعد

میں بیٹھ کر جھک مارتی رہے اور کیا وہ اس کے پیچھے پیچھے ڈنڈا لے کر دوڑتی کہ اے میاں آفتاب بہادر ایک بات سنتے جاؤ ــــ ان دنوں ثروت نے ایک اور لطیفہ ایجاد کیا۔ جیپل کے بعد ایک روز اس نے "گینگ" کے باقی افراد سے کہا: ــــ بھئی نمبر ۲۹۔۱ اے پی سین روڈ پر آج کل یہ سلسلہ ہے، اگر بھائی آفتاب چائے پیتے پیتے رک کے، دفعتاً کنولا رانی سے کہتے ہیں بھئی کنول مجھے تم سے ایک بات کہنی ہے تو ہماری کنولا رانی کو فوراً یہ دھیان ہوتا ہے کہ اب شاید یہ پرپوز کرنے والا ہے۔ پر وہ بات محض اتنی ہوتی ہے کہ بھئی ذرا میں بال کو فون کر دو کہ آم خریدتا لائے یا اسی قسم کی کوئی اور شدید اینٹی کلائمیکس۔ ثروت اس قدر کمینی تھی ــــ وہ سارے مسخرے پن کے قصے یاد کرکے اب اس نے دل میں ہنسنا چاہا لیکن سردی بڑھتی گئی اور بیکراں تنہائی اور زندگی کے ازلی اور ابدی بچھتاووں کا ویرانہ! آفتاب بہادر تم کو پتا ہے کہ میری کیسی جلاوطنی کی زندگی ہے۔ ذہنی طمانیت اور مکمل مسرت کی دنیا جو ہو سکتی تھی۔ اس سے دیس نکالا جو مجھے ملا ہے اسے بھی اتنا عرصہ ہو گیا کہ اب میں اپنے متعلق کچھ سوچ بھی نہیں سکتی۔ اب میرے سامنے صرف رائل کمانڈ پرفورمینس اور جین کے صبح کے ناشتے کی دیکھ بھال ہے! یہ ہر دلعزیزی جو مجھ پر ٹھونس دی گئی ہے لیکن تم بھلا کیا سوچو گے (اس نے کہا تھا، ارے تم لوگ اسی کو پسند کرتی ہو جو ایک مخصوص معیار پر پورا اترتا ہے) کیا الٹی منطق تھی، یعنی چت بھی تمھاری پٹ بھی۔ آخر اس ساری لفاظی، اس ذہنی اور تصوراتی گورکھ دھندے سے تمھارا مطلب کیا نکلا۔ واہ وا، چند آدمی کہیں کے۔

ثروت نے اس کی شادی کے بعد ایک اور سہیلی کے سامنے نہایت جامع و مانع اختصار کے ساتھ اس طرح تشریح کر دی تھی کہ قصے کو یوں مختصر

کرتی ہوں اے عزیزہ، کنول کی ٹریجڈی یہ ہوئی کہ ساری عمر تو کوئی ان کی سمجھ میں نہ آیا۔ سب میں مین میکھ نکالتی رہیں اور مارے بد دماغی کے کسی کو خاطر ہی میں نہ لادیں۔ اور جن بزرگوار کو آپ نے نہایت صدق دل سے پسند فرمایا، وہ خود ہی ہری جھنڈی دکھا گئے ___ بس اب کیا ہے پیاری بہن، جب آنکھ کھلی تو گاڑی نکل چکی تھی پٹری چمک رہی تھی ___ جی ہاں۔

اری ثروت ___ کرُوک کہیں کی۔

مگر سوال یہ تھا کہ ہر چیز کے متعلق اس مذاق اور خوش دلی کا رویہ کہاں تک گھسیٹا جا سکتا تھا (لیکن اس کے علاوہ تم اور کر بھی کیا سکتی ہو، ثروت نے کہا تھا) زندگی نہ ہوئی اسٹیفن لیکاک کا مسخرہ پن ہو گئی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تمھارا مذاق کہاں ہوتا ہے۔ اور سنجیدگی کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ یا VICE VERSA

ڈاکٹر صاحب تو دن بھر لائبریریوں میں گھسے رہتے ہیں اور آج کل ایک اور کتاب لکھ رہے ہیں، اسے ارملا نے مطلع کیا ہے۔ اب وہ کیا کر رہا ہے۔ ڈاکٹر ڈی۔ پی۔ مکرجی کی طرح مہا گرد بن چکا ہے۔ غالباً اس نے شادی کر لی ہو گی۔ یہاں پہنچ کر اسے عجیب وغریب اور انتہائی شدید تکلیف کا احساس ہوا ___ (وہ کون ہو گی ___ کیسی ہو گی ___ آفتاب کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی کیسی نظر آتی ہو گی۔ آفتاب اس سے کہاں ملا ہو گا) یا اب تک وہ کنفرمڈ بیچلر بن چکا ہو گا (بہت سے لوگوں کے لیے اس میں بھی سخت گلیمر تھا) ___ کیا بات ہے صاحب ___ ان ساری حماقتوں سے علاحدہ اور برگزیدہ ___ اپنی نہایت تخصی دنیا، اپنے مشغلے، کتابیں، موسیقی، بیتھووِن کے کونسرٹ، چند دل چسپ سے گنے چنے دوست، اتوار کے روز دن بھر کسی کنٹری کلب کی لاؤنج میں بیٹھے ٹائمز پڑھ رہے ہیں۔ تیسرے

پھر کو رائیڈنگ کو چلے گئے اور ٹینس کھیلا، اِدھر اُدھر خواتین سے بھی مل لیے لیکن لڑکیوں کو ہمیشہ بڑے ترحّم کی نگاہوں سے دیکھا، گویا — بیچاریاں —! اور اپنا بے نیازی اور سرپرستی کا رویہ قائم رکھا — (یہ سب ثروت نے ایک دفعہ ارشاد کیا تھا) اچھا بھئی آفتاب بہادر — تم کتابیں لکھتے رہو میں ان پر تھرڈ پروگرام میں ریویو کروں گی، راستہ اسی طرح طے ہوتا رہے گا۔

صبح ہوئی شام ہوئی — زندگی تمام ہوئی — زندگی تمام ہوئی —

نچلی منزل میں ارملا ہریندر ناتھ چٹوپادھیا کا وہ کم بخت کورس آہستہ آہستہ الاپے جا رہی تھی۔

وہ دروازہ کھول کر باہر آگئی۔ کہرا اب کم ہوگیا تھا اور آسمان کا رنگ قرمزی تھا جس کے مقابل میں کیتھولک چرچ کے ہولناک گنبد کا سہلٹ نحوست سے اپنی جگہ پر قائم تھا۔

اونی لبادوں میں ملفوف، مشرقی یورپ سے بھاگے ہوئے لوگ، بھاری بھاری قدم اٹھاتے ہاتھوں میں شمعیں لیے مڈنائٹ ماس کے لیے گرجا کی سمت بڑھ رہے تھے۔

صبح ہوئی شام ہوئی
زندگی تمام ہوئی
زندگی تمام ہوئی
زندگی تمام ہوئی

۹

"جب مجھے ملازمت نہ ملی تو میں نے سمندر پار کے ذطیفوں کے لیے ہاتھ پاؤں مارے۔ برٹش کونسل نے مجھے یہاں آنے کا ذطیفہ دے دیا اور جب میں نے روانہ ہونے کی خبر بابا کو سُنائی تو وہ بالکل چپ ہوگئے اور اس کے بعد ایک لفظ منہ سے نہ بولے اور ابھی میں راستے ہی میں تھی، جب مجھے اطلاع ملی کہ بابا مر گئے ــــــ" کشوری نے مدھم آواز میں بات ختم کی اور چمٹے سے آتش دان میں لکڑی کے کندوں کو ٹھیک کرنے میں منہمک ہوگئی۔

"آج مڈنائٹ ماس منانے جائیں گے" روز ماری نے اپنے برش اور کینوس سمیٹتے ہوئے کہا "چلو ہم بروملٹن اور ریٹری چلیں، جہاں ایک شام میں نے پیلے بالوں اور اداس چہرے والی ایک ہنگرین پناہ گزین لڑکی کو دیکھا تھا۔ وہ سر پہ سیاہ اسکارف باندھے تسبیح ہاتھ میں لیے گھٹنوں سے ساکت اور منجمد بیٹھی تھی۔ اس کا یہ انداز کتنا قابلِ رحم تھا۔ میں نے قربان گاہ کے ستونوں کے پیچھے چھپ کر اس کی تصویر بنائی، میں نے اس تصویر کا نام "آزادی سے فرار" رکھا تھا لیکن جب اسے نمائش میں رکھا جانے لگا تو ہم عصر فنون کی انجمن نے اس کا نام بدل کر "آزادی کا شکرانہ" کردیا ــــ آج کی رات میں وہاں اُمید اور نا اُمیدی کی ان کربناک کیفیتوں کے چند اور اسکیچ تیار کروں گی۔

کتنی کیفیتیں ہیں جنھیں الفاظ اور رنگوں کے روپ میں ڈھالا ہی نہیں جا سکتا، جن کے اظہار سے ان کی بے دقعتی اور توہین ہوتی ہے۔ کشوری نے سوچا (یہی بات اپنے لیے کتنی بار کنول نے محسوس کی تھی لیکن کوئی کچھ نہ جانتا تھا)

کیسی بے بسی ہے کہ سب اپنے اپنے دماغوں میں محصور رہے جانے پر مجبور ہیں۔

"تم کو معلوم ہے کہ میں یکلخت اس طرح تم سب سے یہ باتیں کیوں کر رہی ہوں" کشوری نے کہا۔

"سنتے ہیں کہ جب مدتوں کے بچھڑے ہوئے — دوبارہ ملتے ہیں تو ساری پرانی یگانگت یاد آجاتی ہے۔ پرانے دوستوں سے مل کر بھی کو خوشی ہوتی ہے"۔ اس نے بات آہستہ آہستہ جاری رکھی — "لیکن پرانے دشمن سے مل کر مجھے کیسی مسرت ہوئی — آج صبح مجھے بالکل اتفاقیہ کھیم وتی پھر سے نظر آگئی۔ مجھے پتا نہ تھا کہ وہ یہاں پر ہے وہ ایک دکان سے نکل رہی تھی ارے کھیم — کھیما — میں چلا کر اس کی اور دوڑی — اس نے واقعی مجھے نہ پہچانا۔ وہ بہت موٹی ہو گئی تھی اور اس کے ساتھ غالباً اس کا شوہر تھا کھیم رانی تم ہم کا نا ہیں چینہیں؟" میں نے بالکل بے ساختگی سے اپنی زبان میں اس سے کہا جو اس کی اور میری مادری زبان تھی "— ہلو کشوری — اس نے مطلق کسی گرم جوشی کا اظہار نہ کیا نمستے۔ اس کے شوہر نے مسکرا کر سلام کیا یہ میرے پتی ہیں کھیم نے اسی سرد مہری کے انداز میں بات کی نمستے بھائی صاحب —" میں نے بے حد خوش دلی سے کہا۔

"تم تو پاکستانی ہو تمھیں نمستے نہ کہنا چاہیے کھیم نے بڑی طنز کے ساتھ کہا۔ میرے اوپر جانو کسی نے برف ڈال دی۔ میں نے کھسیانی ہنسی ہنس کر دوسری طرف دیکھا۔ اس کے شوہر نے جو بہت سمجھ دار معلوم ہوتا تھا۔ فوراً بات سنبھالی اور کہنے لگا —" اچھا بہن جی — اس سمے تو ہم بہت جلدی میں ہیں۔ آپ کسی روز ہمارے یہاں آیئے، ہم یہیں ساؤتھ کینزنگٹن میں رہتے ہیں — اچھا، ضرور آؤں گی۔ بائی بائی کھیم — میں نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا اور آگے چلی گئی میں نے اسے یہ بھی نہ بتانا چاہا کہ میں پاکستانی نہیں ہوں۔ اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔

"میں اس وقت کوئی رقت انگیز تقریر نہ کروں گی، میں یہ نہ کہوں گی کہ رفیقو انسان نے خودکشی کرلی۔ پرانی اقدار تباہ ہوگئیں۔ اپنے پرائے ہوگئے۔ یہ سب پچھلے پانچ سال سے دُہراتے دُہراتے تم لوگ اُکتا نہیں گئے۔ یہ جو کچھ ہوا یہی ہونا تھا اور آپ تھیں کہ ایک نہایت رومینٹک تصور لیے بیٹھی تھیں، گویا زندگی نہ ہوئی شانتا رام کی فلم ہوگئی۔ میں نے اور کھیم نے جو کچھ کیا وہ ان سب باتوں کا نہایت منطقی نتیجہ تھا اور باقی تم جو کہنا چاہتی ہو وہ جھک مارتی ہو، سمجھیں۔

"اس انداز سے میں نے اپنے آپ کو سمجھانا چاہا لیکن چلو روزماری، اب ہم نئی تصویریں بنائیں گے!" اس نے روزماری کو مخاطب کیا "تم اگر ہمارے اسکیچ تیار کرو تو تمھاری آرٹ کونسل اور ہم عصر فنون کی انجمن ان کے لیے کون سے عنوان منتخب کرے گی؟

"ہم اپنے بدقسمت ملک کی وہ نوجوان نسل ہیں جو یورپ کی جنگ اور اپنے سیاسی انتشار کے زمانے میں پروان چڑھی، اپنی خانہ جنگی کے دور نے اس کی ذہنی تربیت کی اور اب اس ہولناک "سرد لڑائی" کے محاذ پر اسے اپنے اور دنیا کے مستقبل کا تعین کرنا ہے۔

"ہم لوگ یونیورسٹی کی اونچی اونچی ڈگریاں حاصل کر رہے ہیں۔ تہذیبی میلے اور تہوار منعقد کرنے میں مصروف ہیں۔ ہے مارکیٹ کے مخصوص تھیٹروں میں اپنے میلے کے پروگرام پیش کرتے ہیں۔ امن کانفرنسوں اور یوتھ فیسٹولز میں شامل ہوتے ہیں لیکن یہاں سے واپس لوٹ کر کیا ہوگا۔

"تم نے کبھی خیال کیا ہے کہ میں کہاں جاؤں گی ۔۔۔؟ میرا گھر اب کہاں ہے؟ کیا میں اور میری طرح دوسرے ہندستانی مسلمان ایسے مضحکہ خیز اور قابلِ رحم کردار بننے کے مستحق تھے ۔۔۔؟!"

وہ خاموش ہوگئی۔ سب لوگ چُپ چاپ بیٹھے آگ کے شعلے کو دیکھتے رہے۔ سڑک کے دوسری طرف ایک مکان میں "وائٹ کرسمس" گائی جارہی تھی۔

"شاید میں نے تمھیں بتایا تھا ——" ارملا نے نیچی آواز میں کہا "کہ آج دفتر سے واپسی میں ڈاکٹر آفتاب رائے مل گئے، میں نے ان سے پوچھا: ڈاکٹر صاحب میں نے سُنا تھا کہ آپ ری پبلک لیبی ڈورا میں سفیر ہیں۔ تم نے غلط سنا تھا۔ انھوں نے رسان سے مسکرا کر کہا۔ میں نے گھبرا کر ان کو دیکھا۔ تو کیا آپ بھی —— میں نے سوال کرنا چاہا۔ ہاں —— میں بھی —— اتنا کہہ کر وہ جلدی سے خدا حافظ کہتے ہوئے مجمع میں غائب ہوگئے اور دوسرے لمحے اسٹیشن کی مہیب انڈر گراونڈ نے ان کو نگل لیا۔ ان کے ہاتھوں میں کتابیں تھیں اور وہ کسی سے بات کرنا نہ چاہتے تھے —— نہ جانے وہ کہاں رہتے ہیں، کیا کرتے ہیں، اتنا عرصہ انھوں نے کیسے گزارا، وطن جانے کی اجازت انھیں کب ملے گی —— کیا ہوگا ——"

دور گرجاؤں کے گھنٹے بجنے شروع ہوگئے تھے۔ وہ سب باہر سڑک پر آگئے۔

ہماری غلطیوں کا سایہ ہمارے آگے آگے چلتا ہے اور رات ہمارے تعاقب میں ہے۔ انھوں نے سوچا —— لیکن ہم رات کی وادی کو تیزی سے عبور کررہے ہیں۔ ہمارے چاروں طرف یہ لاکھوں کروڑوں انسانوں کا ہجوم یہ لوگ جو اپنی قسمتوں کو روتے ہیں، لیکن دیکھو یہ راستے، یہ جھیلیں، یہ باغات ہمارے منتظر ہیں۔ سناٹے میں صرف موت کے قدموں کی چاپ تھی۔ اجنبی موت جو یک لخت ہمارے سامنے آگئی، لیکن ہم اسے پیچھے چھوڑ کر ہنستے ہوئے آگے نکل جائیں گے۔ سنو ہمارے پاس یقین ہے اور کامل اعتماد جسے اس محبت نے تخلیق کیا ہے جو غداری کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ یہ غداری محض یاسمین کے پھولوں کی آرزو ہے۔ وہ

گرجا کی سمت بڑھتے رہے۔

سامنے راستے کی نیم تاریکی میں ایک الزبتھن وضع کے مکان میں دُھندلی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ یہ ہندستانی ہائی کمیشن کے فرسٹ سکریٹری کا مکان تھا۔ اس کے آگے پھر اندھیرا تھا۔ یہ کون دیوانی روح اپنی تنہائی سے گھبرا کر باہر نکل آئی ہے۔ انھوں نے سوال کیا: اس سے کہو یہ یہاں کیوں کھڑی ہے۔ ان لیمپوں کے نیچے گھاس کے ان راستوں پر۔ زمین کے ان پھولوں کے درمیان اسے کچھ نہ ملے گا۔ سنسان سیڑھیوں پر یہ کون لوگ نظر آرہے ہیں' ان سے کہو کہ واپس جائیں اور صبح کا انتظار کریں۔

ہمارے اور ان کے خیالوں کے بُھتنے ——؟

لیکن پھر گھنٹوں نے پکارا —— آؤ —— آج کی رات تمھارے وجود کے گناہ کا کفارہ ادا کیا جائے گا۔ میں تمھارے خدا کی آواز ہوں اور تمھاری ہر تباہی میں شریک ہوں اور ہر موت کا محافظ ہوں اور اب پادریوں اور راہبوں کا جلوس آگے بڑھا جو اپنے اپنے ملکوں سے جلاوطن ہو کر اس وقت خداوند قدوس کی تقدیس کرتے تھے اور گرجا کی مرمریں سیڑھیوں پر سیاہ اسکارف سے سر ڈھانپے عورتیں اور بوڑھے اور جوان بڑے صبر سے بیٹھے تسبیحیں پھیر رہے تھے اور ہولی کیمونین کے منتظر تھے۔

ایک راستہ یہیں پر آکر ختم ہو جاتا ہے۔ پھر ایک دیوار ہے لیکن ریشمی پردوں میں سے چھن چھن کر روشنی ادھر بھی پہنچ رہی ہے۔ گو بہت سے سیاہ پوش مریض دیوانے فلسفی اور بیمار سیاست دان راستہ روکے کھڑے ہیں۔

ہمیں تمھاری موت عزیز ہے' کیونکہ تمھاری موت میں نجات ہے۔ ماس کے گھنٹوں نے کہا۔

ہماری ماں' چٹانوں کی بہن' سمندر کے روشن ستارے ہمیں چپکا بیٹھنا سکھا۔

یہ ہمارا عہد نامہ ہے۔

یہ ہمارا پرانا عہد نامہ تھا۔ ان کے خیالات تباہ ہو چکے۔ اب ان کے پاس کیا باقی رہا ہے — آرگن کے مدھم اور لرزہ خیز سُروں کے ساتھ قدم اُٹھاتے ہوئے وہ سب آہستہ آہستہ اپنے راستے پر واپس آئے۔

کنول رانی — کسی نے اندھیرے میں یکلخت پہچان کر چپکے سے پکارا — یہاں آجاؤ۔

اور ہمارے ساتھ کھڑے ہو کر اس خوبصورت روشنی کو دیکھو جو آسمان پر پھیل رہی ہے۔ اب کسی پچھتاوے، کسی افسوس کا وقت نہیں ہے۔

"پرانے عہد نامے منسوخ ہوئے" کثوری نے آہستہ سے دُہرایا "ہم اس طرح زندہ نہ رہیں گے۔ ہم یوں اپنے آپ کو نہ مرنے دیں گے، ہماری حلا طتی ختم ہوگی — ہمارے سامنے آج کی صبح ہے، مستقبل ہے، ساری دنیا کی نئی تخلیق ہے۔"

لیکن کنول کماری — تم اب بھی رو رہی ہو — ؟

لندن ۱۹۵۲ء

یاد کی اِک دھنک جلے

جب کبھی میں آگ بجھانے والا انجن شہر کی سڑکوں پر سے گزرتا دیکھتی ہوں تو مجھے ناصر چچا یاد آجاتے ہیں۔ فائر بریگیڈ اور ناصر چچا بچپن سے میرے ذہن میں لازم وملزوم ہیں۔

ناصر چچا مٹیا برج کلکتہ کے ایک ماضی پرست، قدامت پسند اور وضعدار خاندان کے ..... فرد تھے۔ وہ ابّا جان کے بہت پُرانے دوست تھے اور بے حد شگفتہ طبیعت اور پڑھے لکھے انسان تھے۔ اُردو، فارسی اور انگریزی ادبیات کا اعلا ذوق رکھتے تھے اور فائر بریگیڈ کے محکمے میں ملازمت کرتے تھے۔

بمبئی میں سمندر کے کنارے ان کا بہت لمبا چوڑا فلیٹ تھا۔ جس طرح کے پرانی وضع کے فلیٹ گرا کر اب سمینٹ کے جگمگاتے ہوئے دس منزلہ رہائشی بلاک تعمیر کیے جا رہے ہیں۔

اس فلیٹ میں سیاہ و سفید چینی کے ٹکڑوں کی پچی کاری کا فرش تھا۔ اونچی

چھتوں والے لق و دق کمرے اور لمبے لمبے برآمدے، جن کے چوبی جنگلے سبز روغن کے تھے۔ سامنے کے رُخ پر سمندر تھا، جس میں پانی سے اُبھری ہوئی اکّا دکّا بھوری چٹانیں اور پہاڑیاں نظر آتی تھیں جن میں ایک زمانے میں پرتگال کے بحری قزاقوں کے اڈے تھے۔

ناصر چچا کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کے اکلوتے بچّے علی اصغر کی پرورش ایک گوانی آیا کے سپرد تھی۔ سعیدہ چچی بچّے کو تین سال کا چھوڑ کر اللہ میاں کے گھر سدھاری تھیں اور مرتے وقت اسے گریسی کو سونپ گئی تھیں، اور اس سے کہا تھا کہ اگر تم اسے چھوڑ کر چلی گئیں اور کہیں اور نوکری کر لی تو قیامت کے روز تم سے پوچھوں گی۔

گریسی گہری سانولی رنگت اور مضبوط کاٹھی کی اڑتیس سالہ محنتی اور وفادار عورت تھی۔ وہ بیس برس کی عمر میں بیوہ ہو گئی تھی، اور دس برس تک اِدھر اُدھر ٹھوکریں کھانے کے بعد ناصر چچا کے یہاں نوکر ہو گئی تھی، اور آٹھ سال قبل جب سعیدہ چچی کلکتے سے بمبئی آئی تھیں تب سے وہ ان کے پاس ملازم تھی۔ ان کی آخری بیماری میں گریسی نے دن رات ایک کر کے ان کی خدمت کی تھی اور ان کے انتقال کے بعد سے علی اصغر کو بے حد دلسوزی سے پال رہی تھی اور اس پر جان چھڑکتی تھی۔

میرے اسکول میں گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں تو اس مرتبہ ابّا جان چند ہفتے کے لیے مجھے اپنے ساتھ بمبئی لے آئے اور جب ہم لوگ اسٹیشن سے ناصر چچا کے گھر پہنچے تو گریسی نے انتہائی جوش و خروش سے لپک کر ہمارا استقبال کیا اور سوٹ کیس اور ہولڈال خود اُٹھا اُٹھا کر اندر لے گئی۔ اس کے موٹے موٹے ہونٹ خوشی کے مارے کھلے ہوئے تھے۔ اس کے بے انتہا چمکیلے دانت تھے اور چمکیلی

آنکھیں، اُس نے سبز کنارے والی اودے رنگ کی سوتی ساری پہن رکھی تھی، اور بڑے سے جوڑے میں بمبئی کے رواج کے مطابق سفید پھولوں کا گجرا لپیٹا ہوا تھا۔ اپنی طرف کی سفید لہنگے پہننے والی مرگلی اور بدمزاج آیاؤں کے مقابلے میں وہ مجھے بڑی شان دار اور ہنس مکھ معلوم ہوئی۔

ابا جان اور ناصر چچا برآمدے کی آرام کرسیوں پر بیٹھ کر باتوں میں مصروف ہو چکے تھے اور میں جنگلے پر سے اچک کر سمندر کو دیکھ رہی تھی کہ وہ جھاڑن سے ہاتھ پونچھتی دروازے میں نمودار ہوئی "صاحب، کھانا کیا بنانے کا؟" اس نے مستعدی استفسار کیا۔

"بھئی بتا دو کیا کھاؤ گے؟ گریس کھانا ایسا خوش ذائقہ پکاتی ہے کہ بامن کی بیٹی کلمہ بھرے"۔ ناصر چچا نے ابا جان سے کہا۔

"آرڈر" لے کر وہ باورچی خانے کی سمت چلی گئی۔

چچا کا آٹھ سالہ لڑکا اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلنے کے لیے جا چکا تھا۔ میں سارے گھر میں گھومتی پھری اور باورچی خانے میں جھانکا جہاں گریسی ساری کا پلو کمر میں ٹھونسے کھانا تیار کرنے میں لگی تھی اور دوسرے نوکروں پر حکم چلاتی جا رہی تھی۔

تیسرے پہر کو فراغت پا کر وہ پچھلے برآمدے میں اپنے کمرے کے سامنے چٹائی بچھا کر بیٹھ گئی اور مجھ سے باتیں کرنے لگی۔

وہ عجیب اوٹ پٹانگ قسم کی کھچڑی زبان میں بات کرتی تھی جس سے میرے کان اب تک نا آشنا تھے اور تب وہ مجھے اپنی طرف کی کھڑکھڑاتے لٹھے کے بڑے گھیر والے لہنگوں اور سفید براق ململ کے دوپٹوں میں ملبوس مرگلی اور بدمزاج مگر نستعلیق آیاؤں سے اور بھی مختلف معلوم ہوئی جو اتنی شستہ گفتگو کرتی تھیں۔

گریسی دراصل بمبئی کے بیشتر عوام کی مانند ایک ہفت زبان خاتون تھی۔ وہ کوکنی کے علاوہ مرہٹی اور گجراتی بھی بولتی تھی اور اُردو اور انگریزی کا قتلِ عام بھی کرتی رہتی تھی۔ اس کا شوہر جس سے اس نے بنجم ہیں "لو میرج بنایا تھا" بمبئی کے ایک ہوٹل آرکسٹرا میں ڈرم بجاتا تھا اور شادی کے تیسرے سال ہی ایک حادثے میں مرگیا تھا۔ اس کے والدین بھی عرصہ ہوا مرچکے تھے۔ اس کا اکلوتا بھائی پی اینڈ او کے اسٹریتھ مور جہاز پر کیبن اسٹیورڈ تھا اور وہ بھی مرچکا تھا۔ بمبئی میں اس کی صرف ایک "سگی والی" تھی جو اس کی خالہ زاد بہن تھی اور کبھی کبھی اس سے ملنے آجاتی تھی۔ شوہر کے انتقال کے بعد گریسی نے بمبئی میں مختلف جگہوں پر آیاگیری کرتی تھی۔ ایک اسکول بس پر بچّوں کو لانے لے جانے پر مامور رہی تھی اور تاج محل ہوٹل میں لیڈیز کلوک روم کی اٹنڈنٹ کے فرائض انجام دیے تھے۔ "جب ہم اِدھر اپنی میم صاحب کے پاس نوکری کیا تو ہم کو لگا جیسے ہم جنت میں آگیا ہے ـــ ہمارا میم صاحب بالکل اینجل کی موافق تھا۔ اسی لیے جلدی سے ہیون HEAVEN کو چلا گیا۔" اس نے ساری کے کونے سے آنسو خشک کیے اور چٹائی پر اکڑوں بیٹھ کر کہتی رہی ـــ "ہم، صاحب میم صاحب کے پاس نوکری کیا تو جوزف کی ڈیتھ کے بعد ہم کو زندگی میں پہلی بار عزت ملا اور ہم کو لگا کہ ہمارے سر پر بھی چھت ہے ـــ صاحب ہمارا اب بھی بہت کھیال کرتا ہے ـــ صاحب تمھارے ڈیڈی کا بہت ذکر کرتا تھا، جس روز اس کے پاس تمھارا ڈیڈی کا تار آیا کہ تم لوگ ادھر آتا ہے تو ہمارا صاحب خوشی کے مارے رات کو بہت دیر تک اِدھر سے اُدھر ٹہلتا رہا ـــ اور اپنے سامنے سارا فلیٹ ہم سے ٹھیک کروایا ـــ اب تم کو جس چیز کو دل چاہے ہم کو بول دینا۔ ادھر تمھارا آنٹی زندہ نہیں ہے مگر ہم ان کا سرونٹ تو ابھی زندہ ہے ـــ"

ہم لوگ ناصر چچا کے ہاں کئی مقیم رہے۔ صبح سویرے ابا جان اور ناصر چچا سمندر کے رُخ والے برآمدے میں بیٹھ کر باتیں کیا کرتے، جو زیادہ تر میری سمجھ میں نہ آتیں، مگر میں بڑے ذوق و شوق سے ان دونوں کی گفتگو سنتی۔ پٹنہ اسکول کی شاعری، غالب کا فارسی کلام، عرفی اور نظیری، ملکی سیاست، نازی جرمنی کے مسائل، واردھا آشرم اور نہ جانے کیا کیا۔

ناصر چچا کے گھر کا بڑا باقاعدہ نظام تھا جسے گریسی کسی ماہر ایڈمنسٹریٹر کی مانند خاموشی اور ضابطے سے ڈائریکٹ کرتی تھی۔ صبح صبح کمروں کے گلدانوں میں تازہ پھول لگ جاتے۔ چچا کے سارے پائپ صاف کر کے مختلف میزوں پر راکھ دانیوں کے پاس رکھ دیے جاتے۔ پالش کے بعد ان کے بوٹ پچھلے برآمدے میں ایک قطار میں موجود ہوتے۔ ناشتے کی میز پر تازہ اخبار رکھے ہوئے ملتے۔ کمروں کا فرش صابن سے دھلتا۔ دروازوں اور دریچوں کی چٹخنیاں براسو سے صاف کی جاتیں۔ سارا گھر آئینے کی طرح پڑا چمکتا رہتا۔ کھانے کے کمرے کے وکٹورین سائڈ بورڈ پر رنگ برنگے اچار، مربوں اور چٹنیوں کے مرتبان موجود رہتے۔ گھر کا خرچ گریسی کے ہاتھ میں تھا۔ وہ بڑی جزرسی سے کام لیتی اور پچھلے زینے پر کھڑے ہو کر سودے والوں سے اُلجھا کرتی اور کسی گہرے رنگ کی سوتی ساری اور کہنیوں تک تنگ سی ہوئی آستینوں والے کھن بلاوز میں ملبوس، جوڑے میں بینی سجائے، ننگے پیر، غلط سلط انگریزی یا بمبئی کی مخصوص اُردو بولتی، تندہی اور جانفشانی سے گھر سنبھالنے میں مصروف رہتی۔

وہ چچا کی آنکھیں دیکھتی تھی، اگر چچا کسی کو ناپسند کرتے تھے تو وہ بھی اُس کو مُنہ نہ لگاتی — اور فوراً روکھا سوکھا اور بعض اوقات تحقیر آمیز رویہ اختیار کر لیتی۔ چچا جن لوگوں کو پسند کرتے تھے ان کے لیے گریسی کی جان بھی

حاضر تھی۔

اتوار کے دن میری عید ہوتی تھی کیوں کہ اس دن ڈھیروں باتصویر اخبار اور رسالے آتے تھے۔ برآمدے میں ایک لمبی میز پر اخبار اور رسالوں کے انبار سلیقے سے چُنے ہوئے تھے۔ بمبئی کرانیکل اور اسٹیٹسمین اور ٹائمز آف انڈیا اور السٹریٹیڈ ویکلی، ساقی کے سالنامے اور افسانہ نمبر، ان ہی دنوں ٹائمز آف انڈیا کی صد سالہ سال گرہ کا خاص نمبر آیا تھا جس میں سو سال قبل کے برج گیٹ کی بڑی سی رنگین تصویر تھی کہ انگریز لوگ گھوڑا گاڑیوں اور پالکیوں سے اتر رہے ہیں، اور مقامی باشندے ہاتھ باندھے چاروں طرف کھڑے ہیں۔ میں ان رسالوں کی ورق گردانی کرتی یا پھر سمندر کی لہریں گنا کرتی۔ ناصر چچا کا لڑکا مجھ سے دو تین سال چھوٹا تھا اور میری اس سے دوستی بالکل نہ ہو سکی۔ یوں بھی اپنی عمر سے بڑے لوگوں سے میری زیادہ نبھتی تھی۔ اصغر بہت بدتمیز اور شریر تھا۔ وہ دن بھر گریسی کو تنگ کیا کرتا تھا۔ پڑھائی میں اس کا جی بالکل نہیں لگتا تھا۔ گریسی اسے ڈانٹتی رہتی — "اسگر جاؤ اپنا لیسن سیکھو۔" اور جواباً وہ اسے طرح طرح سے دق کرنے میں لگا رہتا۔ شاید وہ غیر شعوری طور پر گریسی کو پسند بھی نہ کرتا تھا اور اس کی وجہ غالباً یہی رہی ہوگی کہ گریسی کے دل میں اس کے لیے جو شدید جذبۂ ملکیت تھا۔ اصغر کا ننھا سا دماغ اس سے بغاوت پر آمادہ رہتا تھا۔

"اصغر کی تربیت بے حد غلط ہو رہی ہے۔" ناصر چچا افسوس سے اظہارِ خیال کرتے۔ "گریسی کے بے جا لاڈ پیار نے اسے بالکل برباد کر دیا ہے۔ مگر میں گریسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا۔ بیگم مرحومہ اس سے اپنی چھوٹی بہن کی طرح محبت کرتی تھیں۔ اب میں اس کے ساتھ کس دل سے سختی کروں؟"

جب اصغر ہم جائیں گا۔ ہم کھائیں گا ہم تم کو بولا — قسم کی زبان میں باتیں

کرتا تو ابّا جان بھی بڑے صدمے سے کہتے "یہ مٹیا برج اور عظیم آباد کے اُس خاندان کا فرزند ہے جو اُردو ادب کی تاریخ میں اپنا مقام رکھتا ہے۔"

فلیٹ کے پچھواڑے کی عمارت میں فایئرمین کے کوارٹرز تھے۔ فائرمین زیادہ تر مرہٹے تھے اور ان میں سے ایک کی بڑی خوش شکل بیوی نوگزی ساری پہنے بالوں میں تازہ بینی سجائے نل کے پاس بیٹھی برتن مانجھا کرتی۔

دوپہر کو میں چپکے سے نیچے اُتر جاتی جہاں نچلی منزل پر ناصر چچا کے اسسٹنٹ مسٹر جیکب ابراہام کا فلیٹ تھا۔ مسٹر ابراہام بنی اسرائیل یعنی ہندی نژاد یہودی تھے اور ان لوگوں کی مادری زبان مرہٹی تھی۔ جمعہ کے روز مسز ربیکا ابراہام پیتل کی زنجیر میں چھت سے لٹکتے ہوئے خوب صورت لیمپ کو روشن کرکے تین نصف دائروں کے سروں پر لگی ہوئی چھے موم بتیوں کا مخصوص عبرانی شمعدان جلاتیں، اور توریت و زبور کی تلاوت کرتیں۔ ان کے ڈرائنگ روم کی دیوار پر حضرت موسیٰؑ کی ایک بڑی سی رنگین تصویر لگی تھی کہ وہ اپنی قوم کو دریائے نیل کے پار لیے جارہے ہیں۔ میں اوپر واپس آکر ابّا جان یا ناصر چچا سے یہودیوں کے متعلق سوالات کرتی۔ ایک روز میں نے ایک انگریزی کتاب میں پڑھا۔ "موسیٰ کی مانند تم نے مجھے قید و بند سے نکالا اور فرعون کی مانند میں تمھارا شکر گزار ہونے سے منکر رہا اور لہٰذا صحرا میں نیست و نابود ہو گیا"۔ "اس کا کیا مطلب ہے؟" میں نے ابّا جان سے پوچھا۔

"اس کا مطلب آپ ابھی نہیں سمجھ سکتیں۔ جب بڑی ہو جائیں گی تو سمجھیں گی۔" انھوں نے جواب دیا۔

شام کو میں ابّا جان اور ناصر چچا کے ساتھ ساحل پر ٹہلتی ہوئی تاج محل ہوٹل اور گیٹ وے آف انڈیا تک جاتی اور منڈیر پر کھڑے ہو کر سامنے

سے گزرنے والے پُر وقار سفید جہازوں کو دیکھا کرتی۔

سڑک پر سے گزرتے ہوئے پارسیوں کے آتش کدے کے آدھے شیر اور آدھے انسان والے ہیبت ستون نظر آتے اور برستی بارش میں موٹر یا بس کے شیشوں میں سے مجھے وہ بہت پُر اسرار معلوم ہوتے۔ جوہو کے کنارے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں ایک عقاب نما بوڑھا پارسی کاؤنٹر پر آئس کریم بیچتا تھا وہ بھی بے حد پُر اسرار معلوم ہوتا۔ دنیا مجموعی طور پر بے حد پُر اسرار تھی۔

صبح کو اخبار پڑھتے پڑھتے ناصر چچا سر اُٹھا کر مجھ سے کہتے ——"اچھا صاحب! یہ بھی ہو گیا— !!"

کچھ بزرگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ بچّوں سے ایک بے معنی سا فقرہ دہرا دیتے ہیں جو دوسروں کے لیے بے معنی ہوتا ہے مگر بزرگ اور بچّے کے درمیان ایک خفیہ کوڈ کا درجہ رکھتا ہے۔ جن لوگوں کو بچّوں سے بہت محبت ہوتی ہے، ان کے اور بچّوں کے درمیان دوستی کا ایک اَن کہا رابطہ موجود رہتا ہے۔ "اچھا صاحب —— یہ بھی ہو گیا —— وہ بھی ہو گیا —" میرا اور ناصر چچا کا خفیہ کوڈ تھا۔

جب چچا میرے لیے کوئی پروگرام بناتے تو چپکے سے کہتے —"آج تمھیں جوہو لے جائیں گے، وہاں سمندر میں خوب مزے سے اپنے نہانا — کیوں صاحب؟"

یا —"آج سینما چلیں گے۔"

یا —"آج ہم اور تم تاج چلیں گے۔ خوب مزے سے اپنے ڈٹ کر آئس کریم کھانا — سمجھے صاحب؟"

ناصر چچا سے میری دوستی دو سال پُرانی تھی۔ دو سال قبل، سردیوں

کے زمانے میں ناصر چچا ہمارے ہاں دہرہ دون آئے تھے اور ابا جان کے دوسرے دوستوں کی مانند میری ان سے فوراً دوستی ہوگئی تھی۔ ابا جان کے ان گنت دوستوں میں سے علی گڑھ والے چچا ظفر عمر، چچا عبدالغفار[1]، چچا مشتاق زاہدی، چچا رضا علی[2] اور چچا عنایت اللہ[3] سے میری بہت گاڑھی چھنتی تھی اور اب ان شفیق چچاؤں میں ناصر چچا کا بھی اضافہ ہوگیا تھا جن کو اتنی دور بمبئی میں رہنے کی وجہ سے میں نے پہلے نہ دیکھا تھا۔

شام کو میں ناصر چچا کو ڈالن والا کی خاموش اور معطر سڑکوں پر چہل قدمی کے لیے لے جاتی اور مستعد گائڈ کی طرح اپنے نزدیک سارے اہم لینڈ مارک ان کو دکھلاتی جاتی۔ اپنے واقف کار کتوں، بلیوں اور پرندوں سے ان کا تعارف کراتی اور آس پاس کے مکانوں کے متعلق بے حد اہم اطلاعات انھیں فراہم کرتی: "دیکھیے چچا وہ یوکلپٹس کے پیڑ ہیں نا، ان کے پیچھے ہماری دوست وملا رہتی ہے اور وہ سامنے عطیہ کا گھر ہے اور چچا وہ پلیا پر انگریز کھڑا ہے نا وہ سخت سنکی ہے اور وہ سامنے مسز مکرجی رہتی ہیں۔ چچا معلوم ہے آپ کو یہ مسز مکرجی جو ہیں ان کے میاں پادری مکرجی کہتے ہیں کہ یہ پاگل ہیں اور یہ تو رات رات بھر باغوں میں گھوما کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ان کو نیند بالکل نہیں آتی اور وہ سارے ڈالن والا میں گھوم کر بروک بانڈ کے خالی ڈبے جمع کیا کرتی ہیں۔"

---

[1] قاضی عبدالغفار مرحوم۔
[2] سید رضا علی مرحوم، مصنف اعمال نامہ۔
[3] مولوی عنایت اللہ دہلوی مرحوم۔

اور فرنچ کٹ داڑھی والے پادری مکرجی اپنے السیشین کتے کے ساتھ سر جھکائے سامنے سے ٹہلتے ہوئے آتے۔ دو منٹ رک کر ہم لوگوں سے بات کرتے اور آگے چلے جاتے۔ ناصر چچا پھر اپنی ہوا خوری شروع کر دیتے اور میں اچھلتی کودتی ان کے آگے آگے چلتی رہتی۔

چچا کو میں نے بڑے جوش و خروش سے اپنی خفیہ جائے پناہ دکھلائی تھی۔ یہ ہمارے گھر کے عقب میں سرخ رنگ کی ایک دو منزلہ عمارت تھی، جس میں ان گنت برجیاں، شہ نشین اور مینارے بنے تھے۔ یہ دراصل مشرقی پنجاب کی کسی چھوٹی سی ریاست کے حکمراں کی کوٹھی تھی اور اس کا نام پری محل تھا۔ یہ بالکل سنسان پڑی تھی اور عجیب بات تھی کہ اس کے کمروں کے دروازے کھلے رہتے تھے اور ایسا لگتا تھا جیسے عمر عیار کے طلسم والے کسی ساحر نے چھو منتر کہہ کر اک رہتی بستی محلسرا کو پل کی پل میں اجاڑ دیا ہو اور اس کے دروازے اسی طرح کھلے کے کھلے رہ گئے ہوں۔ میں اکثر اس کے زینوں اور برجیوں پر چڑھ جاتی اور مجھے مطلق ڈر نہ لگتا، کیوں کہ ویران ہونے کے باوجود اس مکان میں وحشت نہ تھی۔ ناصر چچا جس روز دہرہ دون آئے میں نے اسی روز ان سے کہا "چلیے آپ کو پری محل دکھلائیں" اور ان کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی وہاں لے گئی۔ تیز سبز گھاس کے قطعے پر ایستادہ کرسمس کیک ایسا مکان سناٹے میں ڈوبا، ہمیشہ کی طرح خاموش کھڑا تھا۔ "یہاں ہم کھیلا کرتے ہیں۔" میں نے اطلاع دی۔ ناصر چچا نے چھڑی پر ٹیک لگا کر اس پر نظر ڈالی ــــ اور کہا ــــ "ہوں ــــ یہ بھی خوب ہے۔"

جب وہ چچا عنایت اللہ سے ملنے گئے تو میں مصر رہی کہ وہ چچا عنایت اللہ

کے نجی چڑیا خانے کو زیادہ تفصیل سے دیکھیں۔ اس چڑیا خانے کے سارے جانوروں اور پرندوں سے میرے پُرانے مراسم تھے۔ چچا عنایت اللہ حسب معمول بجری پر کرسی ڈالے دھوپ میں بیٹھے تھے اور ان کے سامنے میز پر بہت سارے کاغذات رکھے تھے اور انھوں نے ناصر چچا سے پوچھا تھا:

"تم آج کل کہاں رہتے ہو؟"

"بمبئی میں ۔۔۔"

"بمبئی میں کیا کرتے ہو؟"

"آگ سے کھیلتے ہیں" ۔۔۔ ناصر چچا نے جواب دیا تھا۔

اور بمبئی آ کر میں نے دیکھا تھا کہ چچا کا کام واقعی بہت خطرناک تھا۔ اکثر رات کو فون کی گھنٹی بجتی اور انھیں آتش زدگی کی کسی بڑی واردات پر معائنے کے لیے جانا پڑتا۔ ان کے کمرے میں برقی گھنٹی لگی تھی، جس کا تعلق فائر بریگیڈ کے دفتر سے تھا۔ وہ اکثر وقت بے وقت لگاتار بجے چلی جاتی اور چچا پل کی پل میں غائب ہو جاتے۔ رات کو چچا اپنا یونیفارم، فل بوٹ اور آہنی خود پلنگ کے برابر کرسی پر رکھ کر سوتے تھے تاکہ خطرے کی گھنٹی بجتے ہی تیار ہو کر فوراً موقعِ واردات پر پہنچ جائیں۔

ایک روز صبح ناصر چچا ناشتے کی میز پر آئے تو بہت اُداس تھے۔

"رات ایک سہ منزلہ عمارت میں آگ لگ گئی اور ایک مولوی صاحب مع اپنے خاندان کے جل کر ختم ہو گئے" انھوں نے ملول آواز میں کہا۔

"میں ان مرحوم کو جانتا تھا۔ بے حد خدا ترس اور نیک بُزرگ تھے اور بہت غریب۔ ساری زندگی فقر و فاقے میں، پیٹ کی آگ بجھانے

کی تنگ دستی میں کٹی اور رات اس قہرناک آگ نے خاتمہ کردیا ــــ یہ اللہ میاں کے ہاں کس قسم کا انصاف ہے سجاد ــــ" انھوں نے ابا جان سے کہا۔

"اسی عمارت میں ایک سیٹھ رہتا تھا، جو شہر کا مشہور بدمعاش ہے۔ اور سیکڑوں غریبوں اور مظلوموں کا خون چوس کر اس نے الغاروں دولت جمع کی ہے۔ وہ مع اپنے خاندان کے صحیح و سالم بچ گیا۔ اس پر ذرا آنچ نہ آئی۔ اور مولوی حمیدالدین اور ان کے افلاس زدہ بیوی بچے جل کر کوئلہ ہو گئے۔"

گریسی اس وقت میز کے سرے پر کھڑی تھی۔ اس نے فوراً زیرِ لب کچھ پڑھنا شروع کیا اور کمرے سے غائب ہو گئی۔

گریسی کی عادت تھی کہ ناصر چچا جب آگ بجھانے نکلتے تو وہ ان کی خیریت کی منت مان کر اپنے کمرے میں جناب مریمؑ کے چھوٹے سے مجسمے کے سامنے ایک موم بتی جلا دیتی اور جب وہ صحیح سلامت واپس آجاتے تو زیرِ لب جانے کیا کیا بڑبڑا کر دوسری موم بتی جلاتی۔ وہ عام رومن کیتھولک عورتوں کی مانند بے انتہا مذہبی اور خوش عقیدہ تھی۔ اتوار کو گرجا جاتی تھی لیکن اس کے علاوہ دن بھر جو چھوٹے چھوٹے معرکے اس کی روزمرہ کی زندگی میں ہوتے ان کے سلسلے میں شکایت کرنے یا فوری امداد طلب کرنے کے لیے وہ بھاگی بھاگی جناب مریمؑ کے پاس جاتی اور موم بتی روشن کرکے بآوازِ بلند کوکنی زبان میں ایک کیتھولک دعا دہراتی اور اپنی مخصوص انگریزی یا اُردو میں اس چینی کے مجسمے سے تیز تیز گفتگو کرنے کے بعد آکر اپنے کام میں دوبارہ منہمک ہو جاتی۔

ایک روز وہ صبح سارے میں نعمت خانے کی کنجی تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ میں بھی اس کے ساتھ ساتھ کنجی ڈھونڈنے میں لگ گئی۔ جب کنجی نہ ملی تو وہ فوراً اپنے کمرے میں پہنچی۔ موم بتی جلائی اور غصے سے کہنا شروع کیا:

"دیکھو ماں، اگر تم نے دس منٹ کے اندر اندر میری کنجی ڈھونڈ کر نہ دی تو آج سے میری تمھاری دوستی ختم — ہم تمھارے کو بولے دیتا ہے. صاحب کو لنچ میں دیری ہو جائے گا تو وہ ہماری جان نکال لے گا. تمھارا کیا بگڑے گا — تم نے تو کبھی آیا گیری نہیں کی."

اگر ناصر چچا کھانا کھاتے میں کسی روز گریسی کی پکائی ہوئی کسی چیز کی تعریف کر دیتے تو وہ فوراً مجسّمے کے سامنے جا کر شکرانے کی موم بتّی جلاتی.

ناصر چچا گریسی یا دوسرے نوکروں سے شاذ و نادر ہی کوئی غیر ضروری بات کرتے تھے. گھر کے معاملات کے سلسلے میں وہ کافی کم سخن تھے اور گریسی کو خانہ داری کے سیاہ و سفید کا مالک بنا چکے تھے. اور یوں بھی ان کی متاہلانہ زندگی ختم ہوئے اتنا عرصہ گزر گیا تھا کہ انھیں اپنی تنہائی کی عادت ہو گئی تھی اور شاید انھوں نے اپنے خیالوں اور اپنی یادوں کے ساتھ — خاموشی سے زندہ رہنا سیکھ لیا تھا.

ناصر چچا سُرخ و سفید بھاری بھرکم بلند قامت اور کافی رعب و داب والے انسان تھے. وہ مالی لحاظ سے بہت خوش حال تھے. سرکاری تنخواہ کے علاوہ کلکتے میں ان کی کافی جایداد بھی تھی اور گریسی برابر اس فکر میں گھلتی رہتی تھی کہ صاحب بڑا فضول خرچی کرتا ہے.

بمبئی کے مقتدر اور اہم مسلمانوں میں ان کا شمار کیا جاتا تھا. وہ متعدد اسلامی اداروں کے سرپرست اور اعزازی عہدے دار تھے اور اپنی نرم دلی، رکھ رکھاؤ اور وضعداری کے لیے مشہور تھے.

ایک روز تین بھاری بھرکم بیبیاں ذرا ہانپتی کانپتی زینہ چڑھ کر برآمدے میں آئیں اور بڑی تمکنت سے آن کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئیں. جب ناصر چچا

کمرے میں آئے تو وہ تینوں اُٹھیں اور اسی تمکنت سے ان کے قریب پہنچیں۔ ان کی قائد خاتون کے ہاتھ میں دو ڈبے تھے اور بھاری بھاری اطلسی غرارے پہنے، فرش پر ایک قطار میں چلتے ہوئے انھیں دیکھ کر مجھے "مشرق کے تین مجوسی بادشاہوں" کا خیال آگیا جو حضرت عیسیٰؑ کی ولادت سے متعلق تصاویر میں منقش لبادوں میں ملبوس ہاتھ میں تحائف اُٹھائے ایک قطار میں چلتے دکھائے جاتے ہیں۔ قائد خاتون نے ڈبا کھول کر ایک تصویر چچا کے ملاحظے کے لیے پیش کی۔ انھوں نے تصویر کو سرسری نظر سے دیکھا اور میز پر رکھ دیا۔ ان بیبیوں نے تقریباً ایک زبان ہو کر کورس کے سے انداز میں کہا کہ بات طے ہو گئی ہے اور کل شام کو وہ منگنی کی رسم ادا کرنے لڑکی والوں کے گھر جا رہی ہیں۔ پھر انھوں نے ڈبیا کھول کر ایک انگوٹھی نکالی، اور کہا کہ یہ نرد تم بھاو کے ہاں سے خریدی ہے اس کے بعد انھوں نے گریسی کو آواز دی اور جب وہ کمرے میں آئی تو اس سے کہا کہ گیارہ سیر مٹھائی، گیارہ سیر پھل اور گیارہ سیر خشک میوے خرید لائے اور کل شام کے پانچ بجے تیار رہے۔ یہ حکم دے کر تینوں بیبیاں اسی طرح سرسراتی ہوئی زینے سے نیچے اُتر گئیں۔

یہ تینوں بیبیاں ناصر چچا کے ایک لکھنوی دوست کی بیوی، بھاوج اور بہن تھیں اور ارجمند بھابی، سرفراز دلھن اور جمیلہ بہن کہلاتی تھیں اور کئی برس سے چچا سے مُصر تھیں کہ اب ان کو گھر بسا لینا چاہیے۔ یہ تینوں چچا کی بہن اور بھاوج بنی ہوئی تھیں اور ان کے خاندان والیوں کی حیثیت سے انھوں نے لڑکی پسند بھی کر لی تھی، اور ناصر چچا کو محض یہ اطلاع دینے آئی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر ہم نے اس طرح زبردستی سے کام نہ لیا، تو ناصر بھائی ساری عمر اسی طرح گزار دیں گے اور گھر کا گھر دا ہو جائے گا اور دُکھیا اصغری جو ریٹڑ

لیگی گی، وہ الگ۔

ناصر چچا بہت دنوں تک شدت سے انکار کرتے رہے تھے مگر غالباً اصغر کی تربیت کا خیال کر کے انھوں نے اب آن کے ہامی بھرلی تھی، کیوں کہ لڑکی خاص الخاص لکھنؤ کے ایک ایرانی نژاد خاندان کی تھی اور کم ازکم اس کی وجہ سے اصغر کی زبان اور لہجہ تو سُدھر جائے گا۔

شام کو انھوں نے ابا جان سے کہا:

"جمیلہ بہن تو نسبت ہی طے کر آئی ہیں مگر لڑکی والوں کی شرط یہ ہے کہ ساری رسمیں ادا کریں گے۔ یہ سخت چھچھورے پن کی بات ہے۔ لاحول ولاقوۃ ——" پھر انھوں نے مڑ کر مجھے دیکھا جو حسب معمول جنگلے پر لٹک رہی تھی —— اور کہا —— "کیوں صاحب —— یہ بھی ہو گیا۔"

دوسرے روز گریسی بازار سے سارا سامان خرید لائی اور گودام میں جا کر وہ بڑے صندوق کھولے جن میں سعیدہ چچی کا سامان مقفل تھا۔ میں سایے کی طرح گریسی کے ساتھ لگی ہوئی تھی اور بڑے اشتیاق سے ساری تیاریوں کو دیکھ رہی تھی۔ گریسی نے صندوق کھول کر گوٹے لچکے کے خوان پوش نکالے —— "یہ میم صاحب نے اپنے ہاتھ سے بناٹے تھے۔" اس نے کہا اور آنسو کا ایک قطرہ پٹ سے سُرخ پوتھ کے ایک خوان پوش پر گر گیا۔ پھر وہ اپنے کمرے میں جا کر تیار ہوئی۔ پھول دار جارجٹ کی ساری پہنی۔ بالوں میں مینی سجائی اور سانولے چہرے پر سفید پاوڈر لگا کر باہر نکلی۔

"بڑی پیاری ساری ہے گریسی ——" میں نے کہا۔

"یہ ہمارا میم صاحب دیا تھا" اُس نے نیچی آواز میں کہا "میم صاحب ہمیشہ غرارہ پہنتا تھا، اپنا ساری ہم کو دے دیتا تھا۔ ہم نے سب پیٹی میں رکھ

چھوڑا ہے۔۔۔

میں بھی ایک گلابی ارگنڈی کا 'پارٹی فراک' پہن بالوں میں ربن لگا موزے جوتے ڈانٹ چلنے کے لیے مستعد ہو چکی تھی اور دلہن کو دیکھنے کے اشتیاق میں مری جا رہی تھی۔

ارجمند بھابی کی بیوک میں سوار ہو کر قافلہ عمر پارک روانہ ہوا۔

لڑکی کے گھر پہنچ کر ہم لوگ ایک جلوس کی صورت میں زینے کی سمت بڑھے۔ جلوس کی قائد ارجمند بھابی تھیں پیچھے پیچھے گریسی نے مٹھائی کا خوان اُٹھا رکھا تھا اور جمیلہ بہن کی خادماؤں نے بقیہ کشتیاں اور سینیاں سنبھالے ہوئی تھیں۔ انگوٹھی کی سُرخ ڈبیا سرفراز دُلھن کے پرس میں محفوظ تھی ـــــ دروازے پر لکھنوا غرارے میں ملبوس بہت سی دُبلی موٹی بیبیوں نے ہمارا سواگت کیا اور اوپر لے گئیں۔

ان کے ذرا اندھیرے سے ڈرائنگ روم میں قسم قسم کا فرنیچر سجا ہوا تھا۔ شیشے کی ایک بڑی الماری میں چاندی اور ای پی این ایس کے ظروف اور سیلولائیڈ کے بوے اور دوسرے کھلونے اور سیپیاں اور گھونگے اور چھوٹا سا تاج محل اور خاندان کے سپوتوں کے جیتے ہوئے کپ اور ٹرافیاں اور دوسرا الم غلم اٹا ٹوٹ بھرا تھا۔ کارنس پر سگھڑ بیٹیوں کے ہاتھ کے سیاہ مخمل پر کاڑھے ہوئے سارس اور توتے فریموں میں مزین تھے۔ کرسیوں اور صوفوں کے ان گنت ساٹن کے کشنوں پر مزید سارس اور توتے اور بڑا سا سایہ پہنے چھتری اُٹھائے ہوئی ہوکس کے پودے کے پاس کھڑی ہوئی میمیں کڑھی تھیں۔

ہم لوگ صوفے پر بٹھا دیے گئے۔ گریسی دوسری آیاؤں کے ساتھ گیلری میں کھڑی رہی۔ دروازے میں سے اس نے اس کمرے کو ذرا ناقدانہ نگاہوں سے دیکھا کیوں کہ ناصر چچا کا جھل جھل کرتا ڈرائنگ روم بقول اس کے انگریز لوگ

کا گول کمرہ معلوم ہوتا تھا۔ سعیدہ چچی بے حد خوش ذوق تھیں اور اُن کے ہاتھ کی سجائی ہوئی چیزیں گرسی نے جوں کی توں اپنی اپنی جگہ پر رکھی رہنے دی تھیں۔ اور اگر کوئی ملازم جھاڑ پونچھ کرنے میں، کوئی چیز انچ بھر اس کی جگہ سے سرکا دیتا تو وہ اسے کھانے کو دوڑتی تھی۔

تیکھی مگر دزدیدہ نگاہوں سے کمرے کا معائنہ کرنے کے بعد گرسی کواڑ سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی۔

ڈرائنگ روم "سمدھیانے والیوں" سے بھرنا شروع ہوا اور ہجوم کی وجہ سے دم گھٹنے لگا۔ گرسی کھڑے کھڑے تھک گئی ہوگی۔ میں نے سوچا اور مجھے بڑی کوفت ہوئی۔ اجنبیوں کے اس مجمع میں (اور اجنبیوں میں تینوں مجوسی بادشاہ یعنی ارجمند بھابی، سرفراز دلھن اور جمیلہ بہن بھی شامل تھیں) مجھے گرسی اچانک بے صد اپنی معلوم ہوئی اور میرا جی چاہا کہ اس کی دوسراتھ کے لیے جا کر اس کے پاس گیلری میں کھڑی ہو جاؤں۔ آخر میں نے اس سے کہا —— "گرسی ادھر آکر بیٹھ جاؤ۔" وہ دروازے کے قریب ایک کرسی پر اس طرح ٹک گئی جیسے جلتی ہوئی انگیٹھی کے کنارے پر بیٹھی ہو اور اندر ہی اندر کھول رہی ہو۔

میری سمجھ میں نہ آیا کہ گرسی کو اتنا غصہ کیوں آرہا ہے۔ اتنے میں بجلی فیل ہوگئی اور برقی پنکھا بند ہو جانے کی وجہ سے حبس بڑھ گیا۔ خواتین اصغر علی محمد علی کے ہاں کی خوشبوؤں سے مہک رہی تھیں۔ ان کی گودیوں میں ٹھنسے ہوئے بچے گلا پھاڑ پھاڑ کر رو رہے تھے۔ شور و غل اور گرمی کی وجہ سے جی لٹا جا رہا تھا۔ مگر ابھی چھم چھم کرتی دُلھن آنے والی تھی اور اس کے بعد آئس کریم آئے گی۔ میں دونوں چیزوں کے انتظار میں صبر سے بیٹھی رہی۔ اتنے میں ایک دم ایک لمحہ کے لیے سناٹا سا ہو گیا اور "لڑکی" (جو در اصل بہت لمبی چوڑی، لحیم شحیم، گوری چٹی

پینتیس سالہ مجرد خاتون تھیں) سر ذرا سا خم کیے اطمینان سے پٹر پٹر چلتی آکر، دھم سے بیٹھ گئی اور صوفے کے اسپرنگ بج اٹھے۔

"ارے گریسی ادھر آ ۔۔۔" جمیلہ بہن نے آواز دی "ذرا مصری کی تھالی تو لانا۔۔۔"

گریسی نے خاموشی سے ایک گنگا جمنی تھالی پیش کی اور اس پر سے مصری کی ڈلی اُٹھا کر جمیلہ بہن نے مولا کا نام لیا اور پان اور ڈلی لڑکی کے مُنہ میں رکھی۔ امام ضامن باندھا اور انگوٹھی پہنائی۔ لڑکی ساری کارروائیاں ٹکر ٹکر دیکھا کی اور چند منٹ بعد اُٹھ کر اسی طرح پٹر پٹر کرتی کمرے سے چلی گئی۔

مجھے بڑی سخت مایوسی ہوئی کیوں کہ اپنے ہاں جتنی منگنیاں اور شادیاں میں نے دیکھی تھیں ان میں دُلھنیں شرم کے مارے بالکل دوہری ہوئی جاتی تھیں۔

میزبان خواتین چائے کے انتظامات میں مصروف ہوئیں اور تینوں مجوسی بادشاہ فوراً آپس میں کھسر پھسر میں منہمک ہوگئے۔

"رنگت تو اُجلی ہے مگر ہے پھیکی شلجم۔" ارجمند بھابی نے کہا۔

"اس غریب کی بیاہ کی عمر ہی نکل چکی ہے۔ میں کہے دیتی ہوں چالیس کے پیٹے میں ہے۔" سرفراز دُلھن نے کہا۔

"دُلہن کی باتیں، چوبیس سال کی ہوگی حد سے حد دُکھیا۔"

"چونڈہ تو سفید ہو چلا ہے، رکھی ہے چوبیس سال کی" سرفراز دُلھن نے کہا۔

"ارے نہیں، نگوڑی اچھی خاصی ہے۔ اے ہاں اور کیا ۔۔۔ شریف لوگ ہیں۔ شیعہ سید دیکھے بھالے۔" ارجمند بھابی نے کہا۔

"یہ تو ہئی ہے، اور پھر یہ کہ جو بندھ گیا سو موتی۔ راجا کے گھر آئے رانی

کھلائے۔" سرفراز دُلھن نے کہا۔

"دیکھ لینا ناصر بھائی پلکوں کی چھاؤں میں رکھیں گے۔" ارجمند بھابی نے کہا۔

"یہ تو ہئی ہے، جسے پیا چاہیں وہی سُہاگن۔" سرفراز دُلھن نے کہا۔

چائے آئی اور اب شرائط کا قضیہ شروع ہوا۔

"ہم نے نواب زادہ صاحب کو کہلوا دیا ہے، مہر ایک لاکھ سے کم نہیں بندھے گا۔" لڑکی کی ماں نے کہا۔

"اے بہن کیا غضب کرتی ہیں، ایک لاکھ —" ارجمند بھابی نے کہا۔

"ہمارے یہاں تو بہن شرعی مہر بندھتا ہے۔" سرفراز دُلھن نے کہا۔

"اور پاندان کا خرچ پچاس روپے مہینا —" لڑکی کی خالہ نے کہا۔

"ہمارے یہاں تو بہن شرطیں ہی نہیں ہوتیں —" ارجمند بھابی نے کہا۔

اب تمام حاضرینِ محفل نے ایک ساتھ بولنا شروع کر دیا اور بڑا غل مچا۔ بچے اور زور زور سے رونے لگے۔ حبس بڑھتا گیا اور مجھے اتنی گرمی اور حبس کی وجہ سے یکلخت چکّر سا آ گیا اور میں نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ میری سراسیمگی دیکھ کر گرسیی آگے بڑھی اور اس نے اونچی آواز میں مضبوطی سے اعلان کیا —

"میم صاحب — ہمارا بابا گھر جانا مانگتا ہے۔"

تینوں مجوسی بادشاہ پاندان کے خرچ اور مہروں کے جھگڑوں میں اس قدر پھنس چکے تھے کہ انھوں نے بھی فرار مناسب سمجھا۔

ارجمند بھابی دوپٹا سنبھالتی ہوئی اُٹھیں "اچھا تو میں ان کو — جمیلہ کے بھائی کو — میرا مطلب ہے اپنے ان کو — اپنے مسٹر کو بھیجوں گی، وہ آپ کے صاحب سے بات کریں گے — نواب زادہ صاحب نے — ہمارے ناصر بھائی نے تو سارا معاملہ ہم پر چھوڑ دیا ہے۔" ارجمند بھابی نے سمدھنوں سے کہا۔

جلوس زینہ اُتر کر نیچے پہنچا۔
"اچھا بہن خدا حافظ۔"
"اللہ نگہبان۔"
"ممبروں کا جو فیصلہ ہو اطلاع جلد بھجوا دیجیے گا — اور بھی بچی کے لیے بے شمار پیغام تھے، مگر ہم تو خاندان دیکھتے ہیں —"
"اللہ حافظ — اللہ حافظ —"

جلوس ناصر چچا کے گھر واپس پہنچا۔ ابا جان چند روز کے لیے کسی کام سے مدراس جا چکے تھے۔ چچا برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ اصغر ایک کونے میں بیٹھا مکینو سے کھیل رہا تھا۔
"اے مبارک ہو ناصر بھائی —" ارجمند بھابی نے زینے ہی پر سے آواز دی "ماشاء اللہ سے چاند سی دلھن ملی ہے۔"
برآمدے میں پہنچ کر تینوں بیبیوں نے تقریباً یک زبان کہنا شروع کیا:
"سگھڑ ایسی کہ دسوں اُنگلیاں دسوں چراغ — اس کی کشیدہ کاری دیکھی تم نے دلھن؟ میں کہتی ہوں اس اُجڑے گھر میں چار چاند لگا دے گی، کیوں دلھن؟" ارجمند بھابی نے کہا۔
"یہ تو ہئی ہے۔" سرفراز دلھن نے کہا۔
"اور لڑکی کے باپ جہیز میں موٹر دینے کو کہہ رہے ہیں —" جمیلہ بہن نے کہا۔
"بس اب وہ جم جم اس گھر میں آکر اُترے — ہم تو اپنے بھائی کی خوشی چاہتے ہیں۔" ارجمند بھابی نے کہا۔

"یہ تو ہوئی ہے ـــ" سرفراز دلھن نے کہا۔

ناصر چچا سگار کی راکھ جھاڑ کر مسکرائے، اور تینوں بیبیوں کی اس گفتگو سے بہت محظوظ نظر آئے۔ ناصر چچا شاید سنس آف ہیومر کے مالک تھے۔

گریسی خوان پوش اور سینیاں واپس رکھنے کے لیے گودام کی طرف جا چکی تھی۔

اس رات چچا کہیں ملنے ملانے چلے گئے۔ علی اصغر اپنے کمرے میں سو چکا تھا۔ میں سارے گھر میں اِدھر اُدھر گھومتی پھری۔ چچا کے البم کی ساری تصویریں دوبارہ دیکھ ڈالیں، جن میں سے ایک بہت پیاری سی شکل کی سعیدہ چچی نفیس غرارے میں ملبوس، گود میں علی اصغر کو اُٹھائے کھڑی تھیں یا گریسی، علی اصغر کو بچہ گاڑی میں بٹھا رہی تھی، اور سعیدہ چچی پاس کھڑی ہنس رہی تھیں۔ دارجلنگ، کلکتہ، مہابلیشور، پونا ہر جگہ ناصر چچا اور سعیدہ چچی اکٹھے اور کس قدر مسرور نظر آ رہے تھے۔

دفعتاً گریسی کے کمرے کی طرف سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی جانور غرا رہا ہو۔ عجیب غیر انسانی سی آواز۔ میں جلدی سے پچھلے برآمدے سے نکل کر ادھر گئی اور گریسی کے کمرے کی کھڑکی میں جھانکا ـــ جناب مریم کا مجسمہ گریسی کے پلنگ کے سرہانے ایک چھوٹی سی میز پر رکھا رہتا تھا۔ اس وقت گریسی اس کے سامنے آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی اور ہل ہل کر آگ برساتی آواز میں کہہ رہی تھی:

"یو سو اینڈ سو ـــ ہم تمھارے دیول میں اکھّا نو ہفتے کا نوینا بنایا۔ تمھارا

ل‍ے NOVENA

دیول کا چکر لگاتے لگاتے ہمارا پانو تھک گیا۔ تمھاری پہاڑیوں کی سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے ہمارا جان نکل گیا۔ روز پُرزی کرتے کرتے ہمارا عقل چکرا گیا۔ ہمارا کھوپڑی پلپلا ہوگیا۔ ہمارا مگج گھوم گیا۔ اور تم نے ہمارے ساتھ نورٹونیٹی کیا، تم ایک دم کنڈم ہے — تم اور تمھارا دلارا بیٹا دونوں کنڈم — ڈیم فراڈ — دیکھ لی تمھاری خدائی لو" اینڈ "بٹی" اینڈ "مرسی" اس نے زور سے پھونک مارکر شمع بجھادی اور بڑے استہزا اور حقارت سے منہ چڑا کر بولی — "بڑی ورجن میری بنتی ہے۔ ورجن میری۔ ورجن میری —" پھر اس نے اپنا سر میز کے کنارے پر رگڑنا شروع کردیا۔

اس کا چہرہ بدلا ہوا تھا، جیسے وہ شدید اندرونی جسمانی کرب میں مبتلا ہو۔ میں ڈری سی گئی۔ یہ کوئی دوسری گریسی تھی۔ یہ وہ گریسی نہیں تھی جو بڑے پیار سے میرے فراکوں پر استری کرتی تھی۔ مجھے اپنے ساتھ بازار لے جاتی تھی، اور میرے لیے چاکلیٹ خریدتی تھی، جو رات کو مجھے گوا کی لوک کہانیاں، کوکنی گانے اور پرتگالی دُھن میں گوا کے لوک گیت سُناتی تھی۔ یہ کوئی دیونی تھی یا کوئی ایسی بدروح جسے سخت ترین سزا دی گئی ہو اور جس کے جسم پر کوڑے لگائے جاتے ہوں مگر وہ کوڑے نظر نہ آتے ہوں۔

کوڑے مجھے بھی نظر نہ آئے لیکن اتنا احساس ضرور ہوا کہ اسے بہت شدید تکلیف ہے۔ درد قولنج یا اپنڈی سائیٹس کا دورہ پڑا ہے، کیوں کہ ایسا لُتا ہوا اور انتہائی اذیت میں مبتلا چہرہ میں نے لکھنؤ میں ایک مرتبہ اپنی ایک کزن کا دیکھا تھا، جنھیں اپنڈی سائیٹس ہوا تھا۔

جناب مریمؑ سے اس کے جس قسم کے بے تکلف تعلقات تھے، ان کو دیکھتے ہوئے اس کا یہ غصہ تو جائز تھا، مگر وہ جناب مریمؑ کو باقاعدہ گالیاں دے رہی تھی! — مجھے اور زیادہ ڈر لگا۔ اب گریسی کے سر پر چھت گر پڑے گی۔ وہ حضرت مریمؑ کی شان میں گستاخی کر رہی ہے۔

پھر مجھے فوراً خیال آیا کہ اس بے وقوف کو چاہیے کہ ڈاکٹر کو فون کرے۔ حضرت مریمؑ ڈاکٹر تو ہیں نہیں کہ میز پر گڑیا ایسی کھڑی کھڑی اسے نسخہ لکھ کر دے دیں گی۔

میں کھڑکی میں متحیر اور پریشان کھڑی رہی۔ دفعتاً مجھے نچلی منزل والی مسز ربیکا ابراہام کی بات یاد آئی، جنھوں نے کل ہی مجھ سے کہا تھا کہ عیسائیوں کا یہ عیسیٰ و مریم کا چکر بڑا سخت گناہ ہے۔ عیسائیوں نے سچے دینِ موسوی کو مسخ کرکے، خدائے واحد کو تین ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا جو شدید کفر کی بات ہے۔ اور شرک گناہِ عظیم ہے، اور اسی وجہ سے یہ سارے مشرکین سیدھے جہنم میں جائیں گے۔

"گریسی بھی جہنم میں جائے گی!" میں نے فکرمند ہو کر پوچھا تھا۔

"ہاں اگر وہ راہ راست پر نہ آئی، اور عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا اور خدا مانتی رہی تو دوزخ کے علاوہ اس کا ٹھکانہ اور کہیں نہیں ہے۔ خدا کے منتخب بندے صرف بنی اسرائیل ہیں۔"

میں گریسی کے اس خوف ناک مستقبل کے مسئلے پر ابا جان یا ناصر چچا سے سوالات کرنے ہی والی تھی کہ ابا جان مدراس چلے گئے، اور گھر میں منگنی کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔

میں دہشت زدہ سی دریچے کے باہر کھڑی رہی اور سمجھ میں نہ آیا کہ گریسی کی کس طرح مدد کروں۔

اب اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہہ رہا تھا اور وہ پُرسکون آواز میں آہستہ آہستہ انگریزی میں کہہ رہی تھی ۔"ماں ۔۔۔ تم مزے سے مسکرائے جا رہی ہو ۔۔۔ تم تو بیس برس کی عمر میں بیوہ نہیں ہوئیں ۔۔۔ تم تو جانتی ہی نہیں کہ آدمی کا پیار کیسا ہوتا ہے۔ تم نے تو دس برس تک در در کی ٹھوکریں نہیں کھائیں۔ تم تو فٹ پاتھ پر کبھی نہیں سوئیں تمھیں کیا پتا کہ سیکورٹی اور گھر اور پوزیشن کا کیا مطلب ہے؟

"تمھارے اکلوتے بیٹے پر تو کوئی سوتیلی ماں نہیں آئی۔ تم کو پتا بھی نہیں سوتیلی ماں کیسی ہوتی ہے ۔۔۔ مدر ۔۔۔ دیواچے مائے ۔۔۔ دیواچے مائے[1] ۔۔۔"

اس نے اپنے ہاتھ میز پر پھیلا کر مجسمہ باہوں کے حلقے میں لے لیا اور اس کے ننھے منے سفید پیروں پر سر رکھ کر چپ ہو گئی۔

میں کھڑکی میں سے ہٹ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اب میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔ دنیا واقعی حد سے زیادہ پُراسرار تھی۔ پھر میں نے رابعہ آپا اور رضوان بھائی کے متعلق سوچنا شروع کیا جو میرے بڑے محبت والے اور دلچسپ کزن تھے اور جن کے گھر میں صبح کو جانے والی تھی۔ خوش ہو ہو کر یہ سوچتے ہوئے کہ ماٹنگا میں کتنے مزے آئیں گے۔ تھوڑی دیر بعد میں سو گئی۔

دوسرے روز صبح سویرے رابعہ آپا اور رضوان بھائی مجھے اپنے ہاں ماٹنگا لے گئے۔ یہ ایک نوجوان جوڑا تھا اور ان کی حال ہی میں شادی ہوئی تھی۔ ان کے ہاں ہر وقت ان کے ہم عمر دوستوں کا مجمع رہتا اور خوب ہو حق ہوتی۔ ان کا چھوٹا سا فلیٹ ناصر چچا کے خاموش مکان کے مقابلے میں بہت پُر رونق تھا۔ پڑوس

---

[1] خدا کی ماں

میں ایک نامور فلمی اداکار کا گھر تھا جس کے دو موٹے موٹے لڑکے سامنے خاموش سڑک پر رولر اسکیٹنگ کیا کرتے، اور ان کا پشاوری ملازم گل زینے میں کھاٹ پر لیٹا حقہ گڑگڑایا کرتا، اور بچّوں کو ڈانٹتا رہتا۔ دوپہر کو سڑک کے آمنے سامنے ساری رہائشی عمارتوں میں ایک ساتھ ریڈیو پر فلمی ریکارڈ بجتے۔ اور کانن دیوی کی سُریلی آواز سارے میں گونجتی "من میرے آندھی بن جا" ــــ اور ــــ "تم من موہن ــــ تم سکھین سنگ ہنس ہنس کھیلو پھاگ ــــ میری دنیا سونی کرکے بستی نئی بسائی تونے ــــ اب میں جاکر کسے سناؤں، اپنے من کا راگ ــــ" اور برابر کے فلیٹ میں ایک سکھ لڑکی ان ریکارڈوں کے ساتھ ساتھ آواز ملا کر گایا کرتی۔

چند روز بعد ابّا جان مدراس سے لوٹ کر ماٹنگا آگئے، اور اس کے اگلے ہفتے جب ہم ناصر چچا کے گھر واپس پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہاں ایک کرائسس آکر گزر چکا ہے۔

اس وقت شام کے پانچ بجے تھے۔ برآمدے میں ارجمند بھابی، سرفراز دلھن اور جمیلہ بہن بید کی کرسیوں پر براجمان تھیں۔ گریسی ساری کا پلّو کمر میں کھونسے دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ ناصر چچا حسبِ عادت پائپ ہاتھ میں لیے اِدھر سے اُدھر ٹہل رہے تھے۔

ارجمند بھابی کہہ رہی تھیں ــــ "اے میں تو کہتی ہوں اللہ کا شکر ہے کہ ہزار پانچ سو ہی کے ماتھے گئی۔ اگر کہیں خدانخواستہ دو بول پڑھا لیے ہوتے اور پھر یہ معلوم ہوتا تو ناصر بھائی کیا کچہری چڑھتے، خدانخواستہ، اُلٹی آفتیں گلے پڑ جاتیں۔ شریفوں میں جھٹم جھٹا، فارغ خطی، خلع طلاق کے ٹنٹوں کا کسے دماغ ہے ــــ"

"جبھی تو میں کہوں کہ اس کی ماں ایک لاکھ مہر پہ کیوں اڑی ہوئی تھیں"۔ سرفراز دلھن نے کہا۔

ابا جان کو اپنے کمرے کی طرف جاتے دیکھ کر ناصر چچا نے آواز دی۔ "ارے بھائی ـــ وہ شادی ہماری ـــ القط ہوگئی"۔

"ارے ـــ کیوں ؟ خیریت ؟" ابا جان نے ٹھٹھک کر پوچھا۔

"لڑکی کو مالیخولیا ہے"۔ ناصر چچا نے مختصراً جواب دیا

"اوہو ـــ بڑا افسوس ہوا ـــ" ابا جان بولے۔

"لڑکی کو ہسٹریا کے دورے پڑتے ہیں بھائی صاحب"۔

ارجمند بھابی نے سر پہ دوپٹا سنوارتے ہوئے ابا جان سے وضاحت کی۔ "ان لوگوں نے چھپا رکھا تھا۔ میں نے جوڑ توڑ لگائی تو معتبر ذرائع سے پتا چل گیا۔ بڑی اللہ قسم خیریت ہوگئی۔ میں تو ناصر بھائی سے کہہ رہی ہوں کہ شکرانے کی مجلس کرائیں"۔

"میرا تو پہلے ہی شادی کا ارادہ نہیں تھا۔ یہی لوگ پیچھے پڑی تھیں۔ اب کہتی ہیں کہ لڑکی بالکل تیتا مرچ ہے اور ہسٹریا کی مریض بھی ہے۔ تو بھی ممکن ہے یہ اطلاع غلط ہی ہو مگر میں اس عمر میں آن کر یہ ـــ رِسک نہیں لے سکتا ـــ یہ میرے ساتھ بھی بے انصافی ہوگی اور اس لڑکی کے ساتھ بھی"۔

ابا جان ہاتھ منہ دھونے کے لیے اندر چلے گئے۔

ارجمند بھابی نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھا ـــ "میں بڑی چیز اٹھا کر آپ سے کہتی ہوں ناصر بھائی مجھے نہایت ہی معتبر ذرائع سے یہ معلوم ہوا ہے ـــ"

لہ قرآن شریف

"جبھی تو میں کہوں کہ اُس روز اُس کی شکل پر کیسی وحشت برس رہی تھی بلکہ وحشت کیا ایک قسم کی نحوست ـــ پھٹکار ایک دم ـــ" سرفراز دُلھن نے کہا۔

"اور شکل بھی کیا تھی ـــ بس رنگ ہی رنگ تھا۔ طباق ایسا منہ، بلّی ایسی بالکل ـــ" جمیلہ بہن نے کہا۔

"اور ڈیل دیکھا کیسا بے ہنگم تھا؟ پھاوڑا ایسے پانو۔ کھپڑا ایسے ہاتھ۔ بے حیائی دیکھو کہ گھونگھٹ تک نہ کاڑھا۔ بمبئی میں رہ کر بالکل میم بن گئیں ـــ لوکا لگاؤں ایسی عورت کو میں ـــ" سرفراز دلھن نے کہا۔

مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ اسی لڑکی کو یہ لوگ اُس روز چندے آفتاب چندے ماہتاب بتا رہی تھیں جس کی دسوں اُنگلیاں دسوں چراغ تھے۔ اور آج اس میں اتنے کیڑے کیسے پڑ گئے۔ میری کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

"مگر بھابی ـــ" جمیلہ بہن کہہ رہی تھیں ـــ "اُس وقت تو منگنی کے وقت تو وہ بالکل اچھی بھلی بیٹھی تھی۔"

"اے دُولی ـــ تو کیا سب کے سامنے رونے چلّانے لگتی؟ ہسٹریا کے مریضوں کے سر پر سینگ تھوڑا ہی ہوتے ہیں۔ کسی ایک ذری سی بات سے پتا چل جاتا ہے۔ اب جب اسے معلوم ہوگا کہ نسبت ٹوٹ گئی تو زمین آسمان ایک کر دے گی ـــ اللہ توبہ توبہ ـــ خدا بُری گھڑی سے بچائے، بہن میرے آگے بھی لڑکیاں ہیں۔" ارجمند بھابی نے جواب دیا۔

"یہ تو ہئی ہے ـــ اور اس کی امّاں خالہ بھی اسی لیے یہ بات چھپائے تھیں۔ اس کی خوش مزاجی ہی کی تعریفیں کر رہی تھیں۔ سچ ہے بہن کُنجڑن اپنے بیر کھٹّے نہیں بتاتی۔" سرفراز دُلھن نے کہا۔

"بھلا سا لگاؤں میں تو ـــــ"۔ جمیلہ بہن نے کہا۔

"جبھی تو میں کہوں کہ اتنے دن شادی کیوں نہ ہوئی"۔ سرفراز دلھن نے کہا۔

"اے میں تو جبھی کھٹک گئی تھی کہ چونتیس پینتیس برس کی عمر ہوگی اور کنواری بیٹھی ہے۔ کوئی تو نقص ہوگی لڑکی میں۔ لو اب عقدہ کھل گیا۔ ورنہ اتنا دولتمند باپ اور اچھی خاصی صورت، تو کوارکوٹلہ یونہی چُنا رہا؟" جمیلہ بہن نے کہا۔

"بڑا غضب ہو جاتا ـــــ اے بی آدمی گھر بساتا ہے اپنے سکھ چین کے لیے نہ یہ کہ لینے کے دینے پڑ جائیں۔ نیم خبطی بیوی پلّے پڑ جائے۔ موئی عمر بھر کا روگ ـــ" ارجمند بھابی نے کہا۔

"بال بال بچ گئے ناصر بھائی"۔ سرفراز دلھن نے کہا۔

"اچھا بھابی اب اس قصّے کو یہیں ختم کرنا چاہیے۔ اب اس کے متعلق زیادہ نبا دلۂ خیالات کرنے کی ضرورت نہیں"۔ ناصر چچا نے متانت سے کہا اور اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔

"اے بی گریسی" ارجمند بھابی نے ذرا پُراسرار انداز میں کھنکار کر آواز دی۔ "ذرا ایک گلاس پانی پلانا"۔

گریسی پانی کا جگ اور گلاس لے کر آئی۔ خواتین ناصر چچا کی منگنی اور متعلق مسائل پر بدستور زور و شور سے اظہارِ خیال کرتی رہیں۔ اب وہ تین موٹی تازی لیگ ہارن مرغیوں کی مانند بڑی طمانیت سے کلک کلک کر رہی تھیں۔

شام کو میں ابّا جان کے ساتھ گھومنے کے لیے چلی گئی۔ ایک بک اسٹال سے مکی ماؤس کے رسالے خریدے اور خوش خوش واپس لوٹی۔

رات کو ابّا جان اور ناصر چچا کہیں دعوت میں چلے گئے اور مجھ سے کہتے گئے کہ میں گریسی کو بُلا کر اپنے پاس بٹھا لوں۔ مون سون کی جھڑی کئی دن سے لگی

ہوئی تھی اور اس وقت بادو باراں کا شور زیادہ تیز ہو گیا تھا۔ علی اصغر چچا کے کمرے میں سوتا تھا اور گریسی اسے سُلا کر اپنے کمرے کی طرف جا چکی تھی۔ میں ملی ماؤس کے رسالے پڑھنے میں محو تھی اور باہر برستی ہوئی بارش کے مقابلے میں اونچی دیواروں اور عنابی پردوں والے اس وسیع اور آرام دہ کمرے میں چمڑے کے گدیلوں والی آرام کرسی پر بیٹھی ملی ماؤس پڑھتی خود کو بے حد محفوظ محسوس کر رہی تھی۔

لیکن کچھ دیر بعد طوفان کا زور بڑھ گیا تو کھڑکیاں بند کروانے کے لیے میں نے گریسی کو آواز دی۔

کوئی جواب نہ ملا تو پچھلے برآمدے سے گزرتی اس کے کمرے میں پہنچی۔ سمندر پر بجلی بار بار چمک رہی تھی۔

گریسی کے مختصر سے کمرے میں داخل ہو کر دفعتاً ایسا لگا جیسے طوفان میں گھرے ہوئے جہاز کے عرشے پر سے ہٹ کر پُر سکون بند کیبن میں آگئی ہوں — ہیل میری فل آف گریسؔ — کمرے میں گریس کی آواز گونجی۔ پھر اس نے کوکنی میں HAIL MARY شروع کیا۔

"نمن مورے کریں پھر لیلے سوامی دیو تجے سنگائی آسا —"؟

وہ موم بتیاں جلاتی گئی اور ہل ہل کر کہتی گئی — "ماں تم ایک دم فرسٹ کلاس ہو ماں — تم نے ہمارا نوڈنیا قبول کر لیا ماں — سنتا موریے دیواچے ماٹے آمی پاپیا کھاتر دِنتی کر — آمین — ان آنم باپا انی بٹرا اسپریتا سنتاچے — آمین —"

ؔ HAIL MARY FULL OF GRACE

میرے قدموں کی آہٹ پر وہ چونک کر پیچھے مڑی اور مجھے دیکھ کر ذرا گھبرا گئی اور غصّے سے کہا — "تم اس ٹائم اِدھر کیا کرنے آیا ہے۔ جاکر سو جاؤ —"

"سمندر میں طوفان آرہا ہے گریسی۔ میں تمھیں بلانے آئی تھی کہ چل کر میرے کمرے میں بیٹھو —" میں نے لجاجت سے کہا۔

دفعتاً شفقت اور محبت کا سیلاب اس کی آنکھوں سے اُمڈ پڑا۔

"کم ہیر ڈارلنگ —" اس نے خالص میموں والے لہجے میں کہا، اور مجھے پچکار کر میرے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ "ٹافی مانگتا —؟"

"یس پلیز گریسی۔"

وہ اُٹھی اور الماری میں سے "بلیک میجک" کا ڈبا نکالا۔

ٹافی کی ڈلی منہ میں ڈالتے ہوئے میں نے سوال کیا۔

"گریسی نوز نیا کیا ہوتا ہے —؟"

"اوہ یو ڈیم نوزی پارکر[1] —" اس نے مصنوعی خفگی سے کہا اور یکلخت بڑی پریشان نظر آئی۔

"نہیں — ہمیں ضرور بتاؤ گریسی — ہم بھی نوز نیا کریں گے۔"

"اچھا ہم تم کو بتائے گا۔ بٹ تم پرومس کرو کہ کسی کو نہیں بولے گا۔"

"پرومس گریسی۔"

"اچھا۔ ادھر باندرہ میں ماؤنٹ میری ہے نا — ادھر ہم لوگوں کا بہت بڑا دیول ہے۔ ادھر جاکر پریئر کرو تو ورجن دعا سُن لیتا ہے اور ماہم میں ایک اور دیول ہے چرچ آف سینٹ مائیکل — اس میں ورجن کا ایک فوٹو ہے۔ اینڈ وہ فوٹو

---

[1] NOSEY PARKER

مریکل کرتا ہے ۔"

"مریکل ۔ گریسی ۔ ؟"

"یس ۔ ادھر تم پورا نو بدھ وار تک جا کر دعا مانگے تو تمھارا وِش پورا ہو جائے گا۔ ہم نے نو وینا چالو کیا اور نائن ویڈنس ڈے پورا کیا۔ پچھلے دن ہم ورجن سے گستا ہو گیا تھا' مگر ورجن نے ہمارے لیے مریکل کر دیا۔"

"مریکل ۔ گریسی ۔ ؟"

"چلو ۔ چلو ۔" اس نے سُرعت سے کہا ۔"اپنے پلنگ میں جاؤ ۔ بہت لیٹ ہو گیا۔" پھر اس نے اپنی جناتی انگریزی شروع کر دی جب وہ بہت غصّے میں یا بہت خوش ہوتی تھی تو اپنی بے نقط کی اڑنگ بڑنگ انگریزی بولتی تھی ۔ اس وقت وہ بے انتہا مسرور اور مطمئن نظر آرہی تھی ۔

"اچھا ۔ مگر کل تم بتاؤ گی کہ مریکل کیسا ہوتا ہے؟" میں نے پوچھا ۔ اس نے میری بات کاٹ دی اور میرے ساتھ ساتھ بیڈ روم کی طرف چلنے لگی ۔ کمرے میں آکر اس نے دریچے بند کیے ۔ میرے صبح کے کپڑے نکال کر کرسی پر رکھے اور پلنگ کے پاس فرش پر بیٹھ گئی ۔

مجھے خیال آیا کہ اسے اس وقت اپنی ڈیوٹی بجالانے کے لیے میرے پاس بیٹھنا پڑ رہا ہے اور میں نے سوچا کہ ہم مسلمانوں کی نماز میں کوئی مخل نہیں ہو سکتا ۔ لیکن میں جا کر گریسی کی نماز میں مخل ہو گئی تھی اور یہ اس کی بے حد اہم نماز تھی ۔ کیوں کہ مجھے معلوم تھا کہ وہ اس رات کی گستاخی کے بعد آج حضرت مریمؑ سے معافی چاہ رہی تھی ۔

جوتے اور موزے اتارتے ہوئے میں نے کہا ۔" گریسی ۔ اب مجھے بالکل ڈر نہیں لگ رہا ۔ تم جا کر اپنی پریئر کرو ۔"

لے MIRACLE

"نو — نو —"

"گڈ نائٹ گریسی —" میں نے مسہری پر لیٹ کر آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

"آر یو شیور — ؟ کین آئی گو — ؟"

"گڈ نائٹ گریسی —"

اس رات ٹوٹ کر بارش ہوئی اور سمندر کسی مہیب جانور کی طرح چنگھاڑتا رہا۔ سمندر کی آواز خوف ناک تھی۔ میں نے چادر کو اچھی طرح اوڑھ لپیٹ لیا اور جب ابا جان دعوت سے واپس آئے میں گہری نیند سو چکی تھی۔

صبح کو ہر چیز دُھلی دُھلائی اور نکھری ہوئی نظر آ رہی تھی۔ سمندر پُر سکون تھا اور بے حد نیلا۔ دور پی اینڈ او کا ایک بے حد طویل اور بے حد سفید جہاز وقار سے تیرتا ہوا افق پر گزر رہا تھا۔ نیچے سڑک پر مچھلی والیوں نے آوازیں لگانی شروع کر دی تھیں۔ کوارٹروں میں فائرمین کی خوب صورت بیوی پانی کے نل کے پاس کھڑی آسمان پر پھیلی ہوئی مون سون کی گھٹاؤں کو دیکھ رہی تھی اور آپ سے آپ مسکرا رہی تھی۔ سامنے کے برآمدے میں تازہ اخبار آ گئے تھے۔ ابا جان اور ناصر چچا آرام کرسیوں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے اور گریسی حسب معمول اطمینان اور مصروفیت سے کھانے کے کمرے میں سٹر بٹر کر رہی تھی۔ اور ناصر چچا سے پوچھ رہی تھی کہ ٹرین میں ساتھ لے جانے کے لیے کیا ٹفن بنے گا — اگلے ہفتے میرا اسکول کھلنے والا تھا اور سہ پہر کی ٹرین سے ابا جان اور میں لکھنؤ واپس جا رہے تھے۔

ARE YOU SURE? CAN I GO?

میں تیار ہو کر برآمدے میں آئی تو ناصر چچا نے اخبار اپنے چہرے کے سامنے سے ہٹا لیا۔ عینک اتار کر میز پر رکھی اور شگفتگی سے پوچھا "کہیے صاحب، یہ بھی ہو گیا ——؟"

پاکستان بنے ڈیڑھ سال ہو گیا تھا۔ ۱۹۴۸ء کے آخیر میں لاہور گئی تو معلوم ہوا کہ ناصر چچا ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد بمبئی سے لاہور آ گئے ہیں۔ ایک روز میرے جائے قیام پر ان کا فون آیا کہ وہ علی اصغر کو کار لے کر بھیج دیں گے تاکہ وہ مجھے ان کے ہاں ماڈل ٹاؤن لے آئے۔

دوسرے روز صبح کو علی اصغر ایک لمبی چوڑی کار لے کر آ پہنچا۔ اب وہ اٹھارہ سالہ نوجوان تھا جو سینیر کیمبرج کے بعد اس نے پڑھنا لکھنا چھوڑ دیا تھا اور اب تفریح میں مصروف تھا۔

"اب تمہارا کیا ارادہ ہے علی اصغر ——" کار میں بیٹھتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا۔

"اب ہم بزنس کرے گا۔ یہ کار ہمارے جس فرینڈ کا ہے ہم اس کی پارٹنرشپ میں کام شروع کرنے والا ہے"۔ اس نے جواب دیا۔ اس کے بعد وہ راستے بھر خاموش رہا۔ اسے شاید اچھی طرح معلوم نہ تھا، اور نہ شاید جاننے کی پروا تھی کہ میں کون تھی اور میرا اس سے کیا رشتہ تھا۔

"چچا کیسے ہیں ——؟" میں نے کچھ دیر بعد دریافت کیا۔

"—— ؟" اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

"تمہارے والد" میں نے وضاحت کی۔

"اوہ —— ڈیڈی —— ہی از آل رائٹ آئی سپوز۔" اس نے جواب دیا

اور بڑے اسٹائل سے اور نہایت زنّاٹے کے ساتھ ڈرائیو کرنے اور آہستہ آہستہ سیٹی بجانے میں مصروف رہا۔

"تمھیں یاد ہے علی اصغر — ایک مرتبہ لوگ تمھارے ہاں بمبئی آئے تھے، یاد ہے؟" میں نے ایک بار پھر بات کرنے کی سعی کی۔

"اوہ — ؟ یا — یا — یا — یاد آیا — آئی ریمیمبر ناؤ وٹ یوئیل می — تھوڑا سا یاد ہے —" اس نے جواب دیا اور انگریزی دھن کی سیٹی بجانے میں مشغول ہو گیا۔

ماڈل ٹاؤن کی ایک کچی سڑک پر پہنچ کر اس نے جھونک کے ساتھ اسٹرنگ وہیل گھمائی اور دھچکے کے ساتھ کار ایک پھاٹک کے سامنے روک لی اور مجھے اُتار کر آگے چلا گیا۔

ایک چھوٹی سی کوٹھی کے احاطے میں آم اور پپیتے کے چند درخت کھڑے تھے۔ اور برآمدے کے سامنے گھاس کے ذرا سے قطعے پر ناصر چچا کرسی بچھائے دسمبر کی مدھم دھوپ میں بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ گھٹنے پر ایک ہاتھ رکھ کر ذرا دقت کے ساتھ کرسی سے اُٹھے اور میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ میں دوسری کرسی پر چپ چاپ بیٹھ گئی۔

بمبئی کے اس قیام کے بعد میں ناصر چچا سے اب ملی تھی اور اس طویل وقفے میں دنیا بدل چکی تھی اور کیسی بدلی تھی

ناصر چچا چند منٹ تک بالکل خاموش رہے اور پھر آہستہ سے بولے — "سجاد ہمارا دوست ہمیں چوٹ دے گیا۔ اس دغابازی کی ہمیں اس سے امید نہیں تھی —" چند لمحوں بعد انھوں نے کہا — "مگر وہ اچھا ہی رہا۔ انقلاب اور شکستہ دلی کا سامنا کرنے سے بچ گیا۔ جنت میں مزے سے بیٹھا ہوگا اپنے۔"

"جنت —" میرے حلق میں کوئی چیز اٹکی — "مرنے کے بعد روح یا جو کچھ

بھی وہ ہے ــــ وہ زندہ رہتی ہے چچا ــــ ؟" میں نے آہستہ سے پوچھا۔
ناصر چچا نے عینک ماتھے پر چڑھائی اور بھویں اُٹھا کر مجھے بغور دیکھا۔ "سوالات کی عادت تمھاری اب تک نہیں گئی۔ کیوں صاحب؟ سوال کرنے چھوڑ دو ــــ سمجھے صاحب ــــ ورنہ زندگی میں تمھیں بہت دُکھ ملیں گے ــــ اور خدا نہ کرے کہ تمھیں دُکھ ملیں ــــ" پھر وہ کلمے کی اُنگلی اُٹھا کر ہوا میں کچھ لکھتے رہے اور دفعتاً بولے ــــ "ارے بھائی ہم نے سُنا ہے کہ تم افسانہ نگار بن گئی ہو ــــ یہ تو ہمیں یاد ہی نہ رہا تھا" اور ایک دم تیوری پر بل ڈال کر خفگی سے کہا "تم تو وہ دلفگار مینڈک والا ادب تخلیق نہیں کرتیں؟"
"دلفگار مینڈک ــــ ؟" میں نے تعجب سے دُہرایا۔
"دیکھو ــــ دیکھو یہ کیا واہیات خرافات ہے جو ادب کے نام سے پیش کی جا رہی ہے"۔ انھوں نے میز پر سے ایک رسالہ اٹھایا جو غالباً "تازہ ادب لطیف یا ادبی دنیا تھا ــــ اور ایک جدید نظم نکال کر میرے سامنے رکھ دی۔ "میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہ کیا بکواس ہے ــــ ؟ ایں ــــ ؟ تم بھی یہی سب لکھتی ہو ــــ ؟ سجّاد کی بیٹی ــــ اگر یہ مہمل خرافات لکھ رہی ہے تو ــــ تو ــــ" غم و غصّے سے انھوں نے رسالہ میز پر پٹخ دیا۔ میں نے چونک کر انھیں دیکھا۔ ناصر چچا بوڑھے ہو گئے تھے۔ اور ہمیشہ کی طرح بہت پیارے تھے اور اس نئی دنیا اور اجنبی شہر کے اس اُداس اُجڑے ہوئے "ماڈل ٹاؤن" کی ایک کاٹیج کے ویران احاطے میں بہت بے بس، بے یار و مددگار سے بیٹھے، ترقی پسند ادب پر گرجتے ہوئے وہ مجھے بے حد پیارے لگے۔
"مگر چچا ــــ" میں نے دبی زبان سے کہا "اوّل تو میں دلفگار مینڈک نہیں لکھتی۔ دوسرے یہ کہ ابّا جان تو اُردو کے اوّلین ترقی پسندوں میں سے تھے۔

—— آپ نے ادب سے اتنا خفا کیوں ہیں ——؟"

"مگر سجاد دلفگار مینڈک نہیں لکھتا تھا" انھوں نے گرج کر کہا —— "اری گریسی" انھوں نے اسی رو میں آواز دی —— "ادھر آؤ۔ دیکھو کون آیا ہے"۔

دوسرے لمحے ایک کھچڑی بالوں والی بوڑھی سی عورت ساری کا پلّو کمر میں کھونسے، جھاڑن سے ہاتھ پونچھتی —— برآمدے میں نمودار ہوئی۔ ذرا ٹھٹھکی اور قریب آکر مجھے ذرا جھک کے اور آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔

"اری احمق الذین —— پہچانی نہیں یہ کون ہے؟" چچا نے کہا۔

"اوہ —— اوہ —— مائی ڈارلنگ ڈارلنگ لٹل سویٹ لٹل گرل ——" گریسی نے چلا کر کہا اور مجھ سے لپٹ گئی۔

"ابھی یہ سسکیوں سے رونا شروع کردے گی ——" ناصر چچا نے ذرا غصّے سے کہا "لاحول ولاقوۃ —— گریسی —— جاؤ —— بی بی کے لیے کھانے کا انتظام کرو —— خوب مزے دار چیزیں پکاؤ ——" انھوں نے ایک بہت پرانی آواز میں اضافہ کیا۔

"کم اِن —— کم اِن —— ہاؤ آر یو مائی چائلڈ —— کم الونگ ——" گریسی نے حسب عادت مارے خوشی کے اپنی بے نقط کی انگریزی شروع کی اور مجھے کاٹج کے اندر لے گئی۔

یہ ایک بہت بڑی کوٹھی کے احاطے کے اندر بنا ہوا کاٹج تھا جو غالباً تقسیم سے قبل ہندو مالک مکان کا مہمان خانہ رہا ہوگا اور ناصر چچا نے بھاگ دوڑ کرواکے اسے اپنے نام الاٹ کروالیا تھا۔ انھیں یہاں آئے تقریباً ایک سال ہوگیا تھا مگر گھر کے انداز سے ایسا لگتا تھا جیسے مسافروں کی طرح بیٹھے ہوں۔ میں نے بمبئی کے فلیٹ کی مانوس چیزوں کی تلاش میں نظریں دوڑائیں مگر سعیدہ چچی کی بڑی روغنی

تصویر کے علاوہ اور کوئی چیز اس جگہ پر ماضی سے منسلک نہ تھی۔ پچا پرانی زندگی سے سارے رشتے منقطع کر چکے تھے۔ مجھے دفعتاً ایک بھیانک سا خیال آیا کہ شاید ناصر چچا اب زیادہ دن زندہ نہ رہیں گے۔ دوسرے لمحے مجھے اپنے اس خیال پر بڑا غصہ آیا کہ میں نے ایسی بدشگونی کی بات کیوں سوچی۔

گریسی تیز تیز بولتی ہوئی مجھے باورچی خانے میں لے گئی جو اس نے حسب معمول بہت صاف ستھرا رکھا ہوا تھا۔ کھڑکی میں تازہ پھولوں سے بھرا گلدان تک دھرا تھا۔ اس نے فوراً پکانے ریندھنے کا انتظام شروع کر دیا۔ میں ایک مونڈھے پر بیٹھ کر اسے دیکھتی رہی۔

"گریسی — تم تو بوڑھی ہو گئیں —" میں نے تاسف سے کہا۔

وہ انگیٹھی دہکاتے ہوئے میری طرف مڑی اور آہستہ سے بولی —" میرا نام مت لو — مجھے گریسی چچی کہو۔"

"اوہ — اچھا —" میں نے جواب دیا۔ انگیٹھی کا دھواں میری آنکھوں میں گھسا تو میں نے آنکھیں میچ لیں اور مجھے دفعتاً بمبئی کی وہ طوفانی رات یاد آگئی جب گریسی نے جناب مریم سے جھگڑا کرنے کے بعد صلح کر لی تھی اور مجھے مریکل کے متعلق بتانے سے منکر رہی تھی —" مبارک ہو گریسی چچی، تم اس عزت کی مستحق تھیں —" میں نے آنکھیں کھولتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

گریسی چچی نے سرعت سے پیڑے کاٹنے شروع کیے۔

"گریسی چچی! تم نے ملازم نہیں رکھا۔ سارا کام خود کرتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"تمھارا انکل کا پنشن ادھر بہت دیری میں ملتا ہے۔ ہم لوگ کا سارا روپیا ادھر انڈیا میں پھنسا ہے۔ ہم لوگ کا بہت مشکل سے گزر ہوتا ہے اور نوکر

کا کیا ضرورت ہے، تمھارا انکل کی خدمت کے لیے کیا ہم نہیں ہے؟" بالوں کی ایک کھچڑی لٹ پیشانی پر سے ہٹا کر انھوں نے کہا۔

"ادھر ہمارا بچّہ ضد کیا کہ پاکستان جائے گا۔ بزنس کرے گا۔ بمبئی میں اس نے کچھ اسٹڈی نہیں کیا۔ اسکول چھوڑ دیا۔ پھر ادھر اس کو سروس کیسے ملتا؟ پنشن کے بعد صاحب کلکتہ جا کر رہنا مانگتا تھا۔ مگر ہم لوگ بچّے کے خیال سے ادھر آ گیا۔ ادھر بھی سب ٹھیک ہے۔ گاڈ از گڈ—"

"چچا کی طبیعت کیسی ہے گریسی چچی۔ ان کے پانو میں کچھ تکلیف ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"تمھارا انکل بہت بیمار رہتا ہے۔ بمبئی میں ہندو مسلمان کی مارا ماری کے زمانے میں موالی لوگ جگہ جگہ آگ لگاتا تھا۔ تمھارا انکل اسے بجھانے کے لیے سارے میں بھاگا بھاگا پھرتا تھا۔ ایک ہندو فیملی کو آگ سے بچاتے ہوا اپنی ٹانگ توڑ دیا۔ چھے مہینے بستر پر پڑا رہا۔ اس کے بعد سے اس کا ہیلتھ گر گیا۔ گاؤٹ کا تکلیف زیادہ ہو گیا۔ ہائی بلڈ پریشر ہو گیا۔ اب اس کا غصّہ بھی بہت تیز ہو گیا ہے۔ ہمارا اتنا شاندار صاحب ایک دم بوڑھا ہو گیا۔ ایک دم اولڈ مین بن گیا۔" پھر انھوں نے خالص بیویوں کے انداز میں شکایت کرتے ہوئے کہا "ہم کہتا ہے کہ پرہیزی کھانا کھائے مگر وہ اگڑم بگڑم کھانا مانگتا ہے اور ہم سے لڑتا ہے۔

"جب چھے سات برس ادھر ہم تمھارے انکل سے شادی بنایا تو اس کو بول دیا تھا کہ اگر تم ہمارے ساتھ کوئی نان سنس کرے گا تو ہم تمھیں چھوڑ کر چلا جائے گا" انھوں نے مصنوعی غصّے سے کہا۔

"اب بیماری سے وہ بہت چڑچڑا ہو گیا ہے۔ خالی ہم اس کی بات سمجھ سکتا ہے، خالی ہم اس کی خدمت کر سکتا ہے۔ دنیا میں اس کا اب اور کوئی ساتھی

نہیں ہے۔ اور ہم خدا سے اب صرف یہی مانگتا ہے کہ اپنے آخری سانس تک اس کی خدمت کرتا رہے —" شاید دھوئیں کی وجہ سے گریسی چچی کی آنکھ میں پانی آگیا تھا۔ انھوں نے پلّو سے آنکھیں پونچھیں اور توا چڑھا دیا۔

"چچا ڈاکٹر سے علاج باقاعدہ کروا رہے نا؟ علاج میں تو ضد نہیں کرتے؟" میں نے پوچھا۔

"بہت ضد کرتا ہے" گریسی چچی نے چپاتی بیلتے ہوئے کہا۔ "ابھی محرم میں ہم دھر نواب قزلباش کے امام باڑے میں جا کر چاندی کا بڑا ضریح سے کلاوہ باندھا۔ جب صاحب اچھا ہو جائے گا تو اگلے سال امام حسینؑ کو چاندی کا کینڈل چڑھائے گا — انشاء اللہ —"

مجھے بے اختیار ہنسی آگئی "گڈ اولڈ گریسی چچی، اب تم یہ سب بھی کرنے لگیں!"

"وائی ناٹ —؟" انھوں نے چپاتی توے پر ڈالتے ہوئے کہا۔ "جب ہم اُدھر بمبئی میں شادی بنایا تو مولوی صاحب نے ہمارا نام کنیز زہرا رکھا اور ہمارے کو کلمہ پڑھایا۔ سناؤں۔؟"

"ضرور —!"

"اشہداً لاالہ اللہ اشہداً محمدالرسول اللہ اشہداً امیرالمومنین امام المتقین علی ولی اللہ وصی رسول اللہ خلیفۃ الا بلافصل —"

"ہیر — ہیر — ونڈرفل — گریسی چچی کمال کر دیا۔ اتنا لمبا چوڑا کلمہ فر فر یاد ہے!"

اور اسی سانس میں انھوں نے پھکنی اٹھا کر دوسرے چولھے کی آگ تیز کرنا شروع کر دی۔ اور بڑبڑائیں —"دس ڈیم بلڈی کوئلہ —"

گریسی چچی نے اپنے بیٹے کا مزید تذکرہ نہیں کیا۔ بیٹے نے شاید دونوں ماں باپ کو بہت مایوس کیا تھا۔

میں کراچی واپس آ گئی۔ تین سال بعد اطلاع ملی کہ ناصر چچا کا انتقال ہو گیا اور علی اصغر بزنس کے لیے ڈھاکے چلا گیا اور مشرقی پاکستان روانہ ہونے سے قبل اس نے گریسی چچی سے کہا کہ بزنس کے سلسلے میں اسے جانے کہاں کہاں پھرنا ہوگا اور انھیں پردیس میں بہت زحمت ہوگی۔ اس لیے وہ اپنے وطن واپس چلی جائیں۔ شاید وہ اپنے دوستوں کو یہ بتاتے ہوئے جھینپتا تھا کہ گریسی چچی اس کی ماں ہیں۔

اگر علی اصغر گریسی چچی کا سگا بیٹا ہوتا اور اسے ان سے دلی، فطری محبت ہوتی، تب بھی ممکن تھا کہ وہ اپنی شادی کے بعد ان سے یہی برتاؤ کرتا۔ ماؤں کے ساتھ اکثر یہی کیا جاتا ہے اور گریسی چچی ماں تھیں۔

گریسی چچی جانے کہاں گئیں۔ بمبئی واپس آ گئیں یا گوا چلی گئیں، یا کہاں غائب ہو گئیں۔ دنیا بہت بڑی ہے۔ اور گریسی چچی ایک بہت بے بضاعت، گُم نام، غیر اہم بوڑھی عورت تھیں۔

بُدھ کی شام کو ماہیم کے چرچ آف سینٹ مائیکل میں کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ گرجا کا ہال، ہشت کونہ صحن اور سامنے کی فٹ پاتھ عبادت گزاروں سے کھچا کھچ بھری ہوتی ہے۔ دور دور تک دکانیں لگتی ہیں، جن میں موم کے بچّے اور ہاتھ پاؤں، ناک، کان بکتے ہیں۔ اولاد کی متمنی عورتیں، غرض مند لوگ، بیمار، روگی، اپاہج، اپنی اپنی مراد کے مطابق موم کے بچّے اور یہ اعضا خرید کر مریمؑ کے بڑے مجسّمے کے سامنے چڑھاتے ہیں اور منّت مانتے ہیں کہ مراد پوری ہونے پر یہی چیزیں چاندی

کی چڑھائیں گے۔ ماہیم کے بس اسٹاپ پر چھوٹے چھوٹے بچے بس کے مسافروں سے مصر رہتے ہیں کہ ان سے موم بتیاں اور پھول خریدے جائیں۔ گرجا کے اندر سنہرا تاج پہنے اور نیلے لبادے میں ملبوس بے حد پیاری شکل والی مریمؑ کا بلند و بالا مجسمہ ایستادہ ہے، اس کے نیچے ایک چھوٹی سی بازنطینی تصویر مقدس ماں اور بیٹے کی ہے۔ ان ساری منتوں، مرادوں، دعاؤں اور وظیفوں کا مرکز یہ چھوٹی سی تصویر ہے جس کے لیے کہا جاتا ہے کہ معجز نما ہے۔ ہر مذہب اور نسل کے لوگ آکر اس تصویر سے اپنا دکھ درد کہتے ہیں۔

ماہیم کا یہ چوراہا بہت مصروف جگہ ہے۔ اس کے ایک طرف بی۔ ای۔ ایس۔ ٹی بسوں کا اسٹیشن ہے۔ اس کے سامنے شیخ اسماعیل عمر اور رحمت اللہ حاجی اسماعیل پٹیل کے بانسوں کے ٹال کھڑے ہیں۔ اس سے ملحق ماہم کریک ہے جہاں پانی میں خالی ڈونگیاں تیرتی رہتی ہیں اور ماہی گیروں کی میلی میلی کشتیاں کھڑی رہتی ہیں۔ کریک میں سے گزرنے والی سڑک بمبئی کے جزیرے کو سیلسٹ کے جزیرے سے منسلک کرتی ہے۔ اس سڑک کے دونوں طرف مچھیروں کے سرخ کھپریل کے گھر اور ٹین کی جھگیاں سمندری بتوں میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ اس سڑک کے کنارے کنارے محرم کے زمانے میں سبیلیں لگائی جاتی ہیں، جن پر چاند تارے والے سبز اسلامی جھنڈے سمندری ہواؤں میں لہراتے رہتے ہیں۔

یہیں کچھ فاصلے پر پانی کے کنارے مخدوم شاہ باباؒ کا مزار ہے، جہاں ہر سال دھوم کا عرس ہوتا ہے اور جمعرات کے روز برقع پوش عورتوں کے انبوہ جمع ہوتے ہیں۔

باندرہ، جوہو اور اندھیری جانے والی بسوں اور موٹروں کی لامتناہی قطاریں اس راستے پر سے گزرتی رہتی ہیں۔ یہیں پر ماہیم ناکہ ہے اور پولیس کے

سپاہی مضافات سے آنے والی ٹیکسیوں اور کاروں کو روک کر اندر جھانکتے ہیں کہ خانہ ساز ناجائز شراب تو اسمگل کرکے شہر میں نہیں لائی جا رہی۔

اس سڑک کے دوسرے کنارے پر باندرہ کی خوبصورت اور سبک نقش و نگار والی سنگ سفید کی مسجد ہے جو ماہ رمضان میں برقی قمقموں کے چراغاں سے جگمگاتی رہتی ہے اور دن بھر ان کے شفاف فرش پر بیٹھے ہوئے نمازی اس کی نازک جالیوں کے اندر سے نظر آتے رہتے ہیں۔ اس مسجد کے آگے بڑھ کر تالاب ہے اور "اسلامی ہوٹل" اور "شانِ محمدی ریسٹوران" اور "سبحان اللہ کیفے"

کریک کی سڑک پر سے بہت دور افق پر گھاٹ کی بھوری پہاڑیاں نظر آتی ہیں، جن کے دامن میں ساحلی جھیلیں اور کھاری پانی کے قطعے ہیں اور گاتو جن میں مون سون کے دنوں میں ندی نالے بہتے پھرتے ہیں۔ اس سڑک کے بائیں جانب سطح آب کے اس پار ناریل کے جھرمٹوں اور گھنے درختوں سے ڈھکا ہوا باندرہ کا جزیرہ نما ہے۔ اور ان درختوں میں سے نکلے ہوئے ماؤنٹ میری کے دو مینارے دور سے نظر آتے ہیں۔ اسی جزیرہ نما پر پالی ہل ہے۔ جس کے اوپر محیرالعقول زندگیاں گزارنے والے فلمی ستارے رہتے ہیں جن کے محیرالعقول وجود کی بنا پر ملک کے بیشتر نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے ذہنوں نے "عروس البلاد بمبئی" کو جنت الفردوس کا درجہ عطا کر رکھا ہے اور جن فلمی ستاروں اور ان کے نگار خانوں تک رسائی کے لیے ان کے یہ نوجوان چست پرستار بقول شخصے اپنا داہنا ہاتھ تک دے سکتے ہیں۔

اور آگے جاکر جوہو کا ساحل ہے جہاں ناریل کے اونچے اونچے نظر فریب جھنڈ ہیں اور جہاں چوڑے پتوں اور بڑے بڑے سرخ پھولوں والے ٹرد پکل درختوں کے سایے میں بڑے رومینٹک اور افسانوی ناموں والے ہوٹل، تفریح گاہیں

اور کاٹج چھپے ہوئے ہیں۔

باندرہ کے جزیرہ نما پر ماؤنٹ میری ہے ۔۔۔ نوزا سینورا دو مونتے ۔۔۔ پہاڑی کی خاتون مریمؑ۔ ساڑھے تین سو برس قبل پرتگالیوں نے یہاں مریمؑ کا ایک معبد تعمیر کیا تھا اور پچھلی صدیوں میں باندرہ کے پرتگالی قلعہ داروں اور ماہیم کے انگریز قلعہ داروں کے مابین خونریز لڑائیاں اور گولہ باری ہوا کرتی تھی۔

اس خوبصورت پہاڑی کے تین طرف سمندر ہے اور کیلے اور تاڑ اور کھجور اور رنگ برنگے درختوں میں چھپی، بل کھاتی ہوئی سڑکیں پالی ہل کی طرف جاتی ہیں اور ان درختوں کے نیچے لکڑی کے جنگلوں اور چھجوں والے "اولڈ ورلڈ" دومنزلہ بنگلے کھڑے ہیں۔ قدیم پرتگالی گرجا کی جگہ پر ایک نیا شاندار چرچ ایستادہ ہے اور اس کے احاطے کی اسٹال پر بھی موم کے بچے اور انسانی اعضا بکتے ہیں اور ہر سال ۸ ستمبر کو یہاں بڑا بھاری میلا لگتا ہے۔ گرجا کے مقابل میں ورجن میری کی ایک اونچی شرائن ہے، جس پر وہ سمندر کی طرف پشت کیے کھڑی ہیں اور دونوں جانب سے سیڑھیاں مجسّمے کی سمت جاتی ہیں ۔۔۔ ان سیڑھیوں کے مختلف مقامات ہیں ۔۔۔ دُعا ۔۔۔ عقوبت نفس و کفارہ ۔۔۔ مراقبہ ۔۔۔ تسبیح و تمجید ۔۔۔ اصلاح نفس و بخشش ۔۔۔ قربانی ۔۔۔ سب سے اونچا مقام ۔۔۔ شانتی اور سکونِ قلب ۔۔۔ مقام مریمؑ ہے ۔۔۔ زائرین اپنے اپنے عذاب دل میں لیے گھٹنوں کے بل ان سیڑھیوں پر چڑھتے ہیں اور مریم کا دامن پکڑ کر رحم اور مدد کے طالب ہوتے ہیں اور مریم مسکراتی رہتی ہیں اور ان کے پیچھے افق سے افق تک پھیلا ہوا سرمئی سمندر لہریں مارتا رہتا ہے۔

اسی سمندر میں ساحل کے کنارے کنارے کئی میل دور جا کر دعاؤں کا ایک اور

مرکز ہے جو پانی میں ایک چھوٹے سے ٹاپو پر کھڑا ہے۔ یہ حاجی علی کی درگاہ اور مسجد ہے۔ اور ورلی کی سڑک سے اس درگاہ تک جانے والی پگڈنڈی جوار بھاٹا کے ساتھ ساتھ پانی میں ڈوبتی اور اُبھرتی رہتی ہے۔ جمعرات کے روز یہاں قوالیوں کا ہنگامہ رہتا ہے اور حاجی علی کے بس اسٹاپ پر بچے اور عورتیں اگربتی اور چڑھاوے کے پھول بیچتی ہیں اور برقع پوش عورتوں کے ہجوم درگاہ کی طرف جاتے دکھلائی دیتے ہیں اور رات کی سیّال تاریکی میں درگاہ ننھے سے لائٹ ہاؤس کی طرح جھلملاتی ہے حاجی علی سے چند فرلانگ کے فاصلے پر مہا لکشمی کا مندر ہے، جہاں منگل کی شام کو رنگ برنگی ساریوں کے پلّو آگے ڈالے، بالوں میں موگرے کے ہار سجائے، بڑی بڑی آنکھوں اور متین چہروں والی گجراتی عورتوں کی ٹولیاں آرتی کے لیے جمع ہوتی ہیں۔ اور جب سُرخ رنگ کا مدھم مدھم دہکتا ہوا آفتاب سُرعت سے پانی میں ڈوب جاتا ہے اور سمندر کی نیلاہٹ اور آسمان کا سیندور ایک دوسرے میں تحلیل ہو جاتے ہیں تو اس کاسنی سنّاٹے میں مندر کے گھنٹے کی آواز پانی کی لہروں کی طرح نرم روی سے پھیلتی چلی جاتی ہے۔

بُدھ کی شام کو ماہیم کے گرجا میں کھوے سے کھوا چھلتا ہے، کیوں کہ یہ نووینا کے وظیفے کا دن ہے۔

ایک دن میں سامنے سے گزرتی ہوئی گرجا کے اندر چلی گئی۔ ابھی نووینا کا مجمع آنا شروع نہیں ہوا تھا، ہال میں اکّا دکّا عورتیں بنچوں پر بیٹھی تھیں یا گھٹنوں کے بل جُھکی ہوئی تھیں۔ قربان گاہ پر للی کے سفید پھولوں کے انبار رکھے ہوئے تھے اور سُنہری موم بتیاں جل رہی تھیں۔ کتنے ان گنت بدنصیبوں کی آرزوئیں، مایوسیاں، مجبوریاں، پشیمانیاں ان جلتی ہوئی اونچی اونچی موم بتیوں کا دھواں بن کر اس مجسّمے کے قدموں میں منڈلاتی رہی ہیں اور میں نے سوچا کہ یہ کیا بات

ہے کہ ہر جگہ مندروں اور تیرتھ استھانوں میں، درگاہوں اور مزاروں کے سامنے، گرجا گھروں اور امام باڑوں اور گردواروں اور آتش کدوں کے اندر یہ عورتیں ہی ہیں جو رو رو کر خدا سے فریاد کرتی ہیں اور دعائیں مانگتی ہیں۔ ساری دنیا کے معبدوں کے سرد، بے حس پتھر عورتوں کے آنسوؤں سے دھلتے رہتے ہیں۔ عورتوں نے ہمیشہ اپنے اپنے دیوتاؤں کے چرنوں پر سر رکھا اور کبھی یہ نہ جاننا چاہا کہ اکثر یہ پاؤں مٹی کے بھی ہوتے ہیں۔

عورتیں اتنی پرستار، اتنی پجارنیں کیوں ہیں؟ اس لیے کہ وہ کمزور ہیں؟ اور سہارے کی حاجت مند ہیں؟ اس لیے کہ وہ اس مختصر سی زندگی میں بہت سے لوگوں سے بہت زیادہ محبت کرتی ہیں؟ باپ، بھائی، شوہر، اولاد، پوتے، نواسے، ان سب کے تحفظ اور ان کی سلامتی کے لیے فکر مند رہتی ہیں۔ شوہر یا محبوب کے پیار اور محبت کی ضمانت کسی ان دیکھی طاقت سے چاہتی ہیں؟ اپنے بچوں کے مستقبل کے لیے ہراساں رہتی ہیں؟ آخر عورتیں خدا کی اس قدر ضرورت مند کیوں ہیں؟ عورتیں کمزور ہیں؟ مگر ویلینٹینا بھی تو ہے جو عین اس وقت خلا کے سفر میں مشغول ہے... اور عورت کمزور بھی ہے؟

نمن سورے کرین بھر لیے سوامی دیو بنجے سنگائی آسا —— اگلی بنچ پر بیٹھی ہوئی ایک منگلورین لڑکی نے اپنا بچہ گود سے اتار کر پاس بٹھایا اور جھک کر دعا شروع کی۔

ذرا عورتوں کی ہمت دیکھیے یہ معاشرے کی تخلیق اور پرداخت کی ذمے داری سنبھالتی ہیں۔ جب یہ دلھن بنتی ہیں تو انھیں ہزار برس کی نیو کہا جاتا ہے۔ یہ موت کے منہ میں جا کر ایک نئی زندگی دنیا میں لاتی ہیں، یہ تکلیفیں اٹھاتی ہیں۔ افلاس اور زندگی کا مقابلہ کرتی ہیں۔ شوہر کی بے وفائی کا سامنا کرتی ہیں۔

سوت کا جلاپا سہتی ہیں پھر بھی نیک اُمید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتیں
"— استرام بتز تو سدیو فال تیجے کسی چے جیزس — آمین —"

سوسائٹی میں جگمگانے والی "میم صاحبیں" لاکھوں روپیا کمانے والی فلم ایکٹریسیں، بین الاقوامی شہرت کی رقاصائیں، گیمرس ماڈل لڑکیاں، یونیورسٹیوں کی ریسرچ اسکالرز، حکومت کی اعلا افسر، ایر کنڈیشنڈ بنگلوں میں رہنے والی سوشل ورکرز، غلیظ کھولیوں میں رہ کر شرابی شوہروں کی مار کھانے والی مزدورنیں، دفتروں میں چھوٹی چھوٹی نوکریاں کر کے بڑے بڑے کنبے پالنے والی کلرک لڑکیاں شاندار فلیٹوں میں رہنے والی، دولت مند تاجروں کی حسین داشتائیں، کولابہ کی سڑکوں پر ٹہلنے والی فیشن ایبل طوائفیں، سفید گلی میں دھندا کرنے والی ٹکہائیاں، بیویاں اور باندیاں، رانیاں اور داسیاں بھولی بھالی اور تریا چتر والی تعلیم یافتہ اور جاہل، معصوم اور دنیا دار ملحد اور اوہام پرست — ان سب پر اپنی اپنی جگہ کیا گزرتی ہے؟

•

"ان آنم باپا۔ انی پُترا، اسپرتیا — سنتا چے — آمین —" لڑکی نے بچے کو گود میں لے کر اپنے سے لپٹا لیا اور روتی رہی۔ شاید اس کے شوہر نے کسی دوسری عورت کے پیچھے اسے چھوڑ دیا تھا۔ شاید وہ بیوہ ہو گئی تھی۔ شاید اسے اس کے گھر سے نکال دیا گیا تھا۔ کون جانے وہ کس لیے یوں روتی تھی۔

"سنتا موریے دیواچے مائے آمی پاپیا کھا ترونتی کر — آمین —"

وہ اُٹھی۔ صلیب کا نشان بنایا۔ قربان گاہ کے آگے ایک گھٹنا ٹیک کر جھکی اور اپنے بچے کو گود میں لیے لیے باہر چلی گئی۔

مجھے گریسی بی بی یاد آ گئیں۔ انھوں نے بھی اسی طرح شاید اسی بنچ پر بیٹھ کر گڑگڑا کر دعائیں مانگی ہوں گی۔

اور ورجن نے ان کی دعا سُن لی ــــ ؟
یا یہ محض ایک اور اتفاق تھا ــــ ؟
فلسفی گریسی چچی کے لیے کیا کہیں گے ؟ اور عقلیت پرست اور ملحد، ہر ایک کے پاس اپنا علاحدہ علاحدہ جواب موجود ہے۔ میں یہ کس سے پوچھنے جاؤں؟ ابّا جان بڑی ہوئیں ختم ہو چکے، جن سے میں طرح طرح کے بچکانے سوالات کیا کرتی تھی اور ناصر چچا یعنی نواب زادہ سیّد علی ناصر خاں ایم۔اے، ایل۔ ایل۔ بی (علیگ) بھی عرصہ ہوا اپنے دوست سے جا ملے۔ اب میں کس سے جا کر پوچھوں کہ کیا زندگی میں واقعی معجزے ہوتے ہیں؟ اذیت اور افلاس اور بے انصافی اور بے رحمی اور تشدّد سے بھری ہوئی اس دنیا میں معجزے ہوتے ہیں ــــ ؟

عبادت گزار اب آ آ کر ہال کی بنچوں پر بیٹھ رہے تھے۔ میں نے سوچا گریسی چچی اس وقت جانے کہاں ہوں گی۔ اس بڑھاپے میں کیا اسی بمبئی میں کہیں آیا گیری کر رہی ہوں گی۔؟ (کیوں کہ ان کے پاس زندگی گزارنے کے لیے ایک محبّت بھرے دل کے علاوہ اور کوئی بھی کوالی فیکیشن نہیں تھی) کیا اب بھی وہ اسی بنچ پر آن کر بیٹھتی ہوں گی اور ورجن کو مخاطب کر کے کہتی ہوں گی ــــ

دیکھو ماں ــــ ہم تمھارے کو ایک بات بولتا ہے۔ کان کھول کر سُن لو ــــ تم نے ہمارا وِش پورا کیا۔ ہمارے بچّے کے لیے گھر کا سیکورٹی بنائے رکھا۔ ہمارا صاحب ورلڈ کا گریٹیسٹ، فائینسٹ مین تھا۔ مگر وہ ہمیں اس دنیا میں اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔ اب ہم پھر تمھارے پاس آیا ہے۔ بتاؤ اب ہم کیا کرے۔ ایک دم جلدی بولو ــــ ورنہ ہمارا تمھارا دوستی ختم۔

اور مجھے ایک لمحے کے لیے ایسا لگا جیسے گریسی چچی سچ مچ میرے نزدیک بیٹھی عبادت میں مصروف ہیں۔ میں نے مڑ کر دیکھا، مگر وہ میرا واہمہ تھا۔

گریسی چچی کے بجائے میرے برابر میں موٹے موٹے ہونٹوں والی کوئی گوانی عورت اودے رنگ کی سبز کنارے والی ساری میں ملبوس، بالوں میں سفید پھولوں کا گجرا لپیٹے کہنیوں تک پھنسی پھنسی آستینوں کا کھٹن بلاوز پہنے، سیاہ ریشمی جالی سے سر ڈھانپے خاموشی سے تسبیح پھیرنے میں مشغول تھی۔

میں نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ گرجا اب عقیدت مندوں سے کھچا کھچ بھر گیا تھا۔ میں خاموشی سے اٹھی اور باہر آ گئی۔

سڑک پر ٹریفک کا ہجوم تھا لیکن عجیب سی خاموشی طاری تھی۔ سامنے کریک پر شام کا نیلگوں اندھیرا چھا رہا تھا اور سمندری ہوا میں دور کے زمانوں اور گمشدہ آوازوں کی گونج تھی۔ میں نے دور جزیرہ نما کے افق پر جھکے ہوئے سناٹے کو دیکھا اور مجھے ایک مرہٹی نظم یاد آئی:

نیلا آسمان ہری
تنہا ستارہ رادھا
کھوئی ہوئی،
وہ دل کی تمنا ہے
سارے زمانوں میں۔
وسیع زمین گوونِدا
دھان کا کھیت رادھا۔
ازل سے ابد تک باوفا۔
وہ مدھر زبان والی ہے۔

سارے زمانوں میں
سیدھا بہتا ہوا دریا کرشن
کنارے پر جھکا جنگل رادھا
جو کوئی سوال نہیں کرتی
مجسّم تسلیم و رضا
وہ ابدی راحت ہے
سارے زمانوں میں ـــــ

سیاہ سمندر پر روشنیاں ٹمٹمانے لگیں۔ میں پھاٹک پر کھڑے ہوئے عبادت گزاروں کی بھیڑ میں سے نکلتی، فٹ پاتھ پر آ گئی اور سڑک عبور کرنے کے لیے سُرخ رنگ کے اس مہیب فائر انجن کے گزر نے کا انتظار کرنے لگی جو ٹن ٹن کرتا زنّاٹے سے باندرہ کی طرف نکلا جا رہا تھا۔

قلندر

غازی پور کے گورنمنٹ ہائی اسکول کی فٹ بال ٹیم ایک دوسرے اسکول سے میچ کھیلنے گئی تھی۔ وہاں کھیل سے پہلے لڑکوں میں کسی چھوٹی سی بات پر جھگڑا ہوا اور مار پیٹ شروع ہو گئی۔ اور چونکہ کھیل کے کسی پوائنٹ پر جھگڑا شروع ہوا تھا۔ تماشائیوں اور اسٹاف نے بھی دلچسپی لی۔ جن لڑکوں نے بیچ بچاؤ کی کوشش کی انھیں بھی چوٹیں آئیں اور ان میں میرے بھائی بھی شامل تھے جو گورنمنٹ ہائی اسکول کی نویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ ان کے ماتھے میں چوٹ لگی اور ناک سے خون بہنے لگا۔ اب ہنگامہ سارے میدان میں پھیل گیا۔ بھگدڑ مچ گئی اور جو لڑکے زخمی ہوئے تھے اس ہڑبونگ میں ان کی خبر کسی نے نہ لی۔

اس پسماندہ ضلع میں ٹیلیفون عنقا تھے۔ سارے شہر میں صرف چھے موٹریں تھیں اور ہاسپٹل ایمبولینس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ اتوار کا ویران

سا دن تھا۔ ہوا میں زرد پتے اڑتے پھر رہے تھے۔ میں لق و دق سنسان چھجے برآمدے میں فرش پر چپ چاپ بیٹھی گڑیاں کھیل رہی تھی۔ اتنے میں ایک یکہ کھٹ کھٹ کرتا آکے برآمدے کی اونچی سطح سے لگ کر کھڑا ہو گیا اور سترہ اٹھارہ سال کے ایک اجنبی لڑکے نے بھائی کو سہارا دے کر نیچے اتارا۔ بھائی کے ماتھے سے خون بہتا دیکھ کر میں دہشت کے مارے فوراً ایک ستون کے پیچھے چھپ گئی۔ سارے گھر میں ہنگامہ بپا ہو گیا۔ اماں بدحواس ہو کر باہر نکلیں۔ اجنبی لڑکے نے بڑے رسان سے ان کو مخاطب کیا ——— "ارے ارے دیکھیے، گھبرائیے نہیں! ——— گھبرائیے نہیں ——— میں کہتا ہوں ———" پھر وہ میری طرف مڑا اور کہنے لگا ——— "مُنّی! ذرا دوڑ کر ایک گلاس پانی تو لے آ بھیّا کے لیے"! اس پر کئی ملازم پانی کے جگ اور گلاس لے کر بھائی کے چاروں طرف آن کھڑے ہوئے اور لڑکے نے ان سے سوال کیا ——— "صاحب کدھر ہیں؟" "صاحب باہر گئے ہوئے ہیں" ——— کسی نے جواب دیا ——— "نہیں ——— نہیں ——— دفتر میں بیٹھے ہیں" دوسرے نے کہا۔ لڑکا مزید توقف کے بغیر آگے بڑھا اور گیلری میں سے گزرتا ادھر ادھر دیکھتا ابّا جان کے دفتر تک جا پہنچا۔ ابّا جان دروازے بند کیے کسی اہم مقدمے کا فیصلہ لکھنے میں مصروف تھے۔ لڑکے نے دستک دی اور اندر داخل ہو گیا۔ اور میز کے سامنے جا کر بڑی خود اعتمادی اور متانت سے بولا ——— "صاحب! آپ کے صاحبزادے ہمارے اسکول میں میچ کھیلنے آتے تھے، ان کو تھوڑی سی چوٹ آئی ہے کیونکہ کھیل کھیل میں دنگا ہو گیا تھا۔ میرا نام اقبال بخت ہے۔ میں منشی خوش بخت رائے سکینہ کا لڑکا ہوں، جو سٹی کورٹ میں مختار ہیں۔ آپ سے میری درخواست ہے کہ ہمارا اسکول بند کرنے کا حکم نہ دیں اور لڑکوں پر جرمانہ بھی نہ کریں کیونکہ

ایک تو ہمارے امتحان ہونے والے ہیں اور دوسرے ہمارے لڑکے بہت غریب ہیں ــــــ"

اباجان نے سر اُٹھا کر اسے دیکھا اور اس کی مدلل اور پُر اعتماد تقریر سُن کر بہت متاثر اور محظوظ ہوئے۔ انھوں نے اسے بڑی شفقت سے اپنے پاس بٹھایا۔

اس طرح سے اقبال میاں کا ہمارے یہاں آنا جانا شروع ہوا۔ بھائی سے ان کی کافی دوستی ہوگئی۔ مگر وہ زیادہ تر گھر کی خواتین کے پاس بیٹھتے تھے۔ امور خانہ داری پر صلاح مشورے دیتے تھے۔ بازار کے بھاؤ اور دُنیا کے حالات پر روشنی ڈالتے یا لطیفے سناتے۔ جب وہ دوسری مرتبہ ہمارے ہاں آئے تھے، تب میں نے بھائی کو آواز دی تھی ــــــ "اقبال میاں آئے ہیں"۔ وہ فوراً نہایت وقار سے چلتے ہوئے میرے نزدیک آئے اور ڈپٹ کر بولے ــــــ "دیکھو منّی! میں تم سے بہت بڑا ہوں۔ مجھے اقبال بھائی کہو ــــــ کیا کہوگی؟"

"اقبال بھائی"ــــــ میں نے ذرا سہم کر جواب دیا۔

اقبال بھائی مجھے ہمیشہ مُنّی ہی پکارتے رہے۔ مجھے ان کے دیے ہوئے اس نام سے سخت چڑ تھی۔ مگر ہمت نہ پڑتی تھی کہ ان سے کہوں کہ میرا اصل نام لیا کریں۔ اب وہ سارے گھر کے لیے "اقبال میاں" "اقبال بھائی" اور "اکبال بھیّا" بن چکے تھے۔ پہلو کے لان پر املتاس کا بڑا درخت ہمارے لیے بڑی اہمیت رکھتا تھا کہ اس کے سایے میں کھاٹ بچھا کر فرصت کے اوقات میں محفل جمتی تھی۔ اس کی صدارت ڈرائیور صاحب کرتے تھے۔ نائب صدر اقبال بھائی خود بخود بن گئے۔ اس محفل کے دوسرے اراکین، استاد یوسف خاں،

جمنا پانڈے مہاراج چپڑاسی، عبدل بیرا اور بھائی تھے۔ میں بن بُلائے مہمان کی حیثیت سے اِدھر اُدھر ہلگی رہتی تھی۔ استاد یوسف خاں کے کمرے کا تعلق اندر کے کمروں سے نہیں تھا اور اس کا دروازہ اسی لان پر کھلتا تھا۔ استاد پُرانے اسکول کے نہایت نستعلیق اور ثقہ موسیقار تھے۔ رام پور دربار سے ان کا تعلق رہ چکا تھا۔ شاعری بھی کرتے تھے اور دن بھر نولکشور پریس کے چھپے ہوئے کِرم خوردہ ناول پڑھا کرتے تھے۔ بوڑھے آدمی تھے۔ آنکھوں میں سرمہ لگاتے تھے اور نوکیلی مونچھیں رکھتے تھے۔ دونوں وقت کا کھانا اور ناشتہ اور چاے بڑے اہتمام سے کشتی میں سجا کر ان کے کمرے میں پہنچا دی جاتی تھی۔ سہ پہر کو وہ اندر آکر بڑے تکلّف سے اماں کو گت بھیروی اور گت بھیم پلاسی سکھلاتے تھے اور اماں بیٹھی ستار پر ٹن ٹن کیا کرتی تھیں۔ اقبال بھائی استاد کے یارِ غار بن گئے تھے اور آرایشِ محفل، طلسم ہوشربا، اسرارِ لندن اور شرر کے ناولوں کا لین دین دونوں کے درمیان چلتا رہتا تھا۔ اقبال بھائی اس سال انٹرنس کا امتحان دینے والے تھے۔

ایک روز مجھے ایک درخت کی شاخ سے لٹکتا دیکھ کر انھوں نے اماں سے کہا —— "مُنّی پڑھتی لکھتی بالکل نہیں۔ ہر وقت ڈنڈے بجایا کرتی ہے۔"

"یہاں کوئی اسکول تو ہے نہیں، پڑھے کہاں؟" اماں نے جواب دیا۔ پچھلے دنوں میرے ایک پھوپی زاد بھائی نے مجھے حساب سکھانے کی ہرممکن کوشش کر دیکھی تھی اور ناکام ہو چکے تھے۔ اب اقبال بھائی —— فوراً والنیٹر بن گئے۔

"امتحان کے بعد میں اسے پڑھا دیا کروں گا۔"

اگلے اتوار کو اقبال بھائی نے میرا انٹرویو لیا —— "انگریزی تو اسے تھوڑی سی آگئی ہے، اُردو فارسی میں بالکل کوری ہے،" انھوں نے اماں کو

رپورٹ دی اور اس کے بعد انھوں نے روزانہ نازل ہونا شروع کر دیا۔ ان کی تنخواہ دس روپے ماہوار مقرر کی گئی۔ روز شام کے چار بجے ان کا یکّہ دور پھاٹک میں داخل ہوتے دیکھ کر میری جان نکل جاتی۔ گرمیاں شروع ہو چکی تھیں۔ اقبال بھائی نے حکم دیا ـــــ "ہم باغ میں بیٹھ کر تجھے پڑھائیں گے، تیرا دماغ جس میں بھوسہ بھرا ہوا ہے، ٹھنڈی ہوا سے ذرا تازہ ہوگا" ـــــ لہذا پچھلے باغ میں فالسے کے درخت کے نیچے میری چھوٹی سی بید کی کرسی اور اقبال بھائی کی کرسی میز رکھی جاتی۔ جس روز میں نیکی کی جُون میں ہوتی تو مالی سے باغ کی بڑی جھاڑو مانگ لاتی اور فالسے کے نیچے اقبال بھائی کی کُرسی کی جگہ پر خوب جھاڑو دیتی اور یوں بھی پڑھائی کے مقابلے میں مجھے باغ میں جھاڑو دینا کہیں زیادہ اچھا لگتا تھا۔

اقبال بھائی جمع تفریق پر سر کھپانے کے بعد حکم دیتے ـــــ "تختی لاؤ" تختی پر وہ بے حد خوش خطی سے لکھتے ؎

قلم گوید کہ من شاہِ جہانم
قلم کش را بدولت می رسانم

اپنے ٹیڑھے میڑھے حروف میں مَیں اس شعر کو کئی مرتبہ لکھتی، یہاں تک کہ میری اُنگلیاں دُکھنے لگتیں اور میں دُعا مانگتی ـــــ "اللہ کرے اقبال بھائی مر جائیں ـــــ اللہ کرے ـــــ"

ایک مرتبہ میں سبق سنانے کے بجائے کرسی پر کھڑی ہو کر ایک ٹانگ سے ناچ رہی تھی کہ اقبال بھائی کو دفعتاً بے تحاشا غصّہ آ گیا۔ انھوں نے میرے کان اس زور سے اینٹھے کہ میرا چہرہ سُرخ ہو گیا اور میں چلا چلّا کر رونے لگی۔ مگر اس کے بعد سے میں نے شرارت کم کر دی۔

اقبال بھائی ابھی مجھے پانچ چھے مہینے ہی پڑھا پائے ہوں گے کہ ابا جان کا تبادلہ غازی پور سے اٹاوے کا ہوگیا۔

اگلے دو تین سال تک اقبال بھائی کے اماں کے پاس کبھی کبھار خط آتے رہے ——— "اب ہم نے ایف اے کرنے کا ارادہ بھی چھوڑ دیا ہے۔ انٹرنس میں تھرڈ ڈویژن ملا ۔ اس وجہ سے ہمارا دل ٹوٹ گیا ہے۔ بس اب ہم بھی منصرم پیش کار قانون گو یا قرق امین کی حیثیت سے زندگی گزاریں گے' یا حد سے حد والدصاحب قبلہ کی مانند مختار بن جائیں گے۔ اس لیے کبھی سوچتے ہیں قانون کا امتحان دے ڈالیں۔ اور اس کوردہ میں رہ کر کر بھی کیا سکتے ہیں ——— ؟"

پھر ان کے خط آنے بند ہوگئے۔

میں آئی۔ٹی کالج لکھنؤ کے فرسٹ ایئر میں پڑھ رہی تھی ۔ اس دن ہمارے یہاں کچھ مہمان چائے پر آئے ہوئے تھے ۔ سب لوگ نشست کے کمرے میں بیٹھے تھے کہ برآمدے میں آکر کسی نے آواز دی :

"ارے بھائی کوئی ہے ——— ؟"

"کون ہے ؟" ——— اماں نے کمرے میں سے پوچھا۔

"ہم آئے ہیں ——— اقبال بخت ——— "

اماں نے بے انتہا خوش ہوکر انھیں اندر بلایا ۔ کمرے میں بہت جگمگاتے قسم کے لوگوں کا مجمع تھا ۔ اقبال بھائی چاروں طرف نظر ڈال کر ذرا جھجکے ۔ مگر دوسرے لمحے بڑے وقار کے ساتھ اماں کے قریب جاکر بیٹھ گئے ۔ پھر ان کی نظر مجھ پر پڑی اور انھوں نے بے حد مسرت سے چلّا کر کہا ——— "اری مُنّی ——— تُو اتنی بڑی ہوگئی ——— ؟"

میں نئی نئی کالج میں داخل ہوئی تھی اور اپنے کالج اسٹوڈنٹ" ہونے کا

سخت احساس تھا۔ اقبال بھائی نے جب سب لوگوں کے سامنے اس طرح " اری مُنّی" کہہ کر مخاطب کیا تو بے حد کوفت ہوئی۔

اقبال بھائی میلا سا پاجامہ اور گھسی ہوئی شیروانی پہنے تھے اور ظاہر تھا کہ ان کی مالی حالت بہت سقیم تھی۔ مگر انھوں نے مختصراً اتنا ہی بتایا کہ کان پور میں ملازم ہوگئے ہیں اور پرائیویٹ طور پر ایف۔ اے۔ سی۔ ٹی کرچکے ہیں۔ پھر وہ ابا جان کے کمرے میں گئے اور ان کے پاس بہت دیر تک بیٹھے رہے۔

اس کے بعد اقبال بھائی پھر غائب ہوگئے۔

دس سال بعد —— مجھے لندن پہنچے چھ سات روز ہی ہوئے تھے میں بی بی سی کے اُردو سیکشن میں بیٹھی ہوئی تھی کہ کسی نے آواز دی —— "ارے بھائی سکینہ صاحب آگئے کہ نہیں؟"

"آگئے ——" یہ کہتے ہوئے اقبال بخت سکینہ پردہ اٹھا کر کمرے میں داخل ہوئے۔ گھسی ہوئی برساتی اوڑھے۔ اخباروں کا پلندا اور ایک موٹا سا پورٹ فولیو سنبھالے میرے سامنے سے گزرتے' ایک میز کی طرف چلے گئے۔ پھر انھوں نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ پہلے تو انھوں نے مجھے نہیں پہچانا۔ ٹکٹکی باندھے چند لمحوں تک دیکھتے رہے —— "اری مُنّی!" —— ان کے مُنہ سے نکلا پھر آواز بھرّا گئی۔

وہ میرے پاس آکر بیٹھے اور ابا جان کی خیریت پوچھی —— "ابا جان کا تو کئی سال ہوئے انتقال ہوگیا' اقبال بھائی!" —— میں نے کہا۔ یہ سن کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

اردو سیکشن کے اراکین نے ان کو روتا دیکھ کر خاموشی سے اپنے اپنے کاغذات پر سر جھکالیا۔

انھوں نے مجھے بتایا کہ کانپور کی ملازمت اسی سال چھوٹ گئی تھی۔ پھر وہ سارے ملک میں جوتیاں چٹخاتے پھرے۔ اسی دوران میں ان کے والدین کا انتقال ہوگیا۔ وہ اکلوتے بیٹے تھے۔ چھوٹی بہن کی کسی گاؤں میں شادی ہو چکی تھی۔ آزادی کے بعد جب قسمت آزمائی کے لیے انگلستان، کنیڈا اور امریکہ جانے کی ہوا چلی تو وہ بھی ایک دن غازی پور گئے۔ اپنا آبائی مکان فروخت کیا اور اس کے روپے سے جہاز کا ٹکٹ خرید کر لندن آ پہنچے۔ پچھلے چار سال سے وہ لندن میں تھے اور یہاں بھی مختلف قسم کے پاپڑ بیل چکے تھے۔ کسی کو ان کے متعلق ٹھیک سے معلوم نہ تھا کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ مجھ سے بھی انھوں نے ایک مرتبہ گول گول الفاظ میں صرف اتنا ہی کہا ——— "ریجنٹ اسٹریٹ پولی ٹیکنیک میں اکنومکس پڑھ رہا ہوں"۔ جس ادارے کا انھوں نے نام لیا، میں اس کی اصلیت سے بخوبی واقف ہو چکی تھی۔ جب لوگ اسی مبہم لہجے میں یہ کہتے کہ وہ ریجنٹ اسٹریٹ پولی ٹیکنیک میں جرنلزم پڑھ رہے ہیں یا اکنومکس پڑھ رہے ہیں یا فن سنگ تراشی یا فوٹو گرافی سیکھ رہے ہیں، تو مزید کسی شک و شبہہ کی گنجایش نہ ہو سکتی تھی۔

لیکن بہت جلد مجھے یہ معلوم ہوگیا کہ اقبال بھائی لندن کے ہندستانی اور پاکستانی طالب علموں کی کمیونٹی کے اہم ستون کی حیثیت رکھتے ہیں ــــ کوئی ہنگامہ، جلسہ، جلوس، جھگڑا فساد، الیکشن، تیج تہوار ان کے بغیر مکمل نہ ہو سکتا تھا۔ تصویروں کی نمایش ہے تو ہال وہ سجا رہے ہیں۔ ناچ گانے کا پروگرام ہے تو مائیکروفون لگا رہے ہیں۔ ڈراما ہے تو یہ ریہرسل کے لیے لوگوں کو پکڑتے پھر رہے ہیں۔ دعوت ہے تو ڈائننگ ہال میں مستعد کھڑے ہیں۔ کبھی کبھی وہ منظر پر سے غائب ہو جاتے اور اطلاع ملتی کہ اتوار کے روز پیٹی کوٹ لین کی

منڈی میں لوگوں کو قسمت کا حال بتاتے ہوئے پائے گئے یا گلاسگو کے کسی بازار میں ہندستانی جڑی بوٹیاں فروخت کرتے نظر آئے۔ ایک دفعہ معلوم ہوا کہ شہر کے ایک فیشن ایبل محلے کے ایک عالی شان فلیٹ میں فروکش ہیں۔ کبھی وہ بڑھیا ریسٹورانوں میں نظر آتے۔ کبھی مزدوروں کے چائے خانوں میں دکھلائی پڑتے۔ اقبال بھائی شاعری بھی کرتے تھے۔ آسٹریلیا اور ایم سی سی کے تاریخی میچ کے دنوں میں انھوں نے ایک مرثیہ لکھا:

ہر تازہ وکٹ پر ہمہ تن کانپ رہا ہے
بولر ہے بڑا سخت ہٹن کانپ رہا ہے
کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے

اقبال بھائی کو فن موسیقی، علم جیوتش، پامسٹری، ہومیوپیتھی، طب یونانی، اور آیورویدک سے لے کر پولٹری فارمنگ، کاشت کاری اور باغبانی تک ہر چیز میں دخل تھا اور حلقۂ اربابِ ذوق کی محفلوں میں بلاناغہ شرکت کرتے تھے۔ ہم دو تین لوگوں نے مل کر ایک فلم سوسائٹی بنائی، جس میں ہم بمبئی سے فلمیں منگواکر ہندستانی اور پاکستانی پبلک کو دکھاتے تھے۔ اس دن اقبال بھائی برات کے دولھا بنے ہوتے ٹکٹ بیچ رہے ہیں۔ مہمانوں کو لا لا کر بیٹھال رہے ہیں فلم شروع ہونے سے پہلے اسٹیج پر جاکر مس مہتاب یا مس نسیم یا مس ممی کو گلدستہ پیش کر رہے ہیں۔ اس زمانے میں انھوں نے یہ بھی طے کرلیا کہ بمبئی جاکر ایک عہد آفریں فلم بنائیں گے، جس کی کہانی مکالمے اور گیت خود لکھیں گے۔ ڈائرکٹ بھی خود کریں گے اور ہیرو کے بڑے بھائی یا ہیروین کے باپ کا رول بھی خود ادا کریں گے اور مجموعی طور پر ساری فلم انڈسٹری پر رولر پھیر دیں گے۔

اقبال بھائی شراب کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے اور مِنگل کے منگل گوشت نہیں کھاتے تھے۔ ایک روز وہ مجھے ایک سڑک پر نظر آتے اس حالت میں کہ ہاتھ میں بہت قیمتی پھولوں کا ایک گچھا ہے اور لپکے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ مجھے دیکھ کر بولے ——— "آؤ ——— آؤ ——— میں ذرا ایک دوست کو دیکھنے ہسپتال جا رہا ہوں" ——— میں ساتھ ہولی۔

ہسپتال میں ایک اسلامی ملک کے سفیر کی بیگم صاحبِ فراش تھیں۔ اقبال بھائی نے ان کے کمرے میں داخل ہو کر گلدستہ میز پر رکھا اور نہایت خلوص سے مریضہ کی مزاج پرُسی میں مصروف ہوگئے۔ اتنے میں سفیر کی بیٹی اندر آئی اور بے حد تپاک سے ان سے ملی۔ میں حیرت سے یہ سب دیکھا کی۔

باہر آ کر کہنے لگے ——— "بھئی یہ لوگ ہمارے دوست ہیں۔ بہت اچھے لوگ ہیں بے چارے۔"

"صاحبزادی سے آپ کی ملاقات کس طرح ہوئی؟"

"لمبا قصّہ ہے، پھر کبھی بتائیں گے۔"

وہ لڑکی بے حد بد دماغ تھی۔ یونی ورسٹی میں پڑھتی تھی اور حد سے زیادہ "اینٹی انڈین" مشہور تھی۔ اس وقت بھی اس نے ہسپتال کے کمرے میں کوئی ناگوار سا سیاسی تذکرہ چھیڑ دیا تھا۔

"بھئی اگر ہندستان کو گالیاں دے کر اس کا دل ٹھنڈا ہوتا ہے۔" اقبال بھائی نے زینہ اترتے ہوئے مجھ سے کہا ——— "تو اس میں میرا کیا ہرج ہے؟ اس کو اسی طرح شانتی ملتی ہے ———!"

اس کے کچھ عرصے بعد ہی ایک شام وہ انڈر گراونڈ میں مل گئے۔ ساتھ ہی وہ لڑکی اور اس کی ایک کزن بھی تھی۔ لڑکی نے مجھ سے کہا ——— "ہم لوگ ایک مجلس

میں جا رہے ہیں۔ آپ بھی چلیے۔"

"میں تو نہ جا سکوں گی۔ میں نے تھئیٹر کے ٹکٹ خرید لیے ہیں"——میں نے معذرت چاہی۔

اقبال بھائی نے بڑے صدمے سے مجھے دیکھا——"محرّم کی ساتویں تاریخ کو تھئیٹر جا رہی ہو؟"

میں بے حد شرمندہ ہوئی——"مجھے یاد نہ رہا تھا" میں نے جواب دیا۔

"آپ شیعہ ہیں یا سنّی؟"——دوسری لڑکی نے سوال کیا۔

"میں قادیانی ہوں"——میں نے جواب دیا۔

"قادیانی؟"——وہ خاموش ہو گئی۔ چند منٹ بعد سفیر کی لڑکی نے اظہار خیال کیا——"اقبال صاحب تو بڑے مومن آدمی ہیں۔ آج کل کے شیعوں میں اپنے مذہب کا اتنا درد کہاں ہے——؟" اتنے میں اسٹیشن آ گیا اور وہ تینوں ٹرین سے اتر گئے۔

اگلے روز بی بی سی میں اقبال بھائی سے ملاقات ہوئی تو میں نے کہا——"اقبال بھائی! اب آپ یہ فراڈ بھی کرنے لگے۔ ان لڑکیوں کے سامنے آپ نے خود کو مسلمان ظاہر کیا ہے؟ نہ صرف مسلمان بلکہ شیعہ——"

جواب ملا——"دیکھو منّی——دنیا میں اس قدر تفرقہ ہے کہ سب لوگ ایک دوسرے کی جان کو آئے ہوتے ہیں۔ میری جب اس لڑکی سے ملاقات ہوئی تو وہ میرے نام کی وجہ سے مجھے مسلمان سمجھی اور میرے سامنے ہندوؤں کی اور ہندستان کی خوب برائیاں کیں۔ اس کے بعد اگر میں اسے بتا دیتا کہ میں ہندو ہوں تو اسے کس قدر خجالت ہوتی، اور پھر اس میں میرا کیا ہرج ہے۔ میرے

خاندان میں سیکڑوں برس سے فارسی نام رکھے جاتے ہیں۔ اس سے ہندو دھرم پر کوئی آنچ نہیں آئی۔ اب اگر میں نے خود کو مسلمان ظاہر کر دیا تو دنیا پر کون سی قیامت آ جائے گی؟ ——— بتاؤ ——— ؟ ارے واہ ری مُنّی! ——— اتنی بڑی افلاطون بنتی ہو، مگر عقل میں وہی بھُوسہ بھرا ہے۔"

ایک شام میں اپنی ایک دوست زاہدہ کے ہاں گئی۔ وہ بے حد تندہی سے پیکنگ میں جٹی ہوئی تھی اور اپنے سارے خاندان سمیت اگلے روز صبح سویرے رخصت پر کراچی واپس جا رہی تھی۔ زاہدہ کے گھر پر مجھے یاد آیا کہ اقبال بھائی نے آسٹریلین طلبہ کی ایک تقریب میں مدعو کیا ہے ——— "ضرور آنا، آسٹریلین بے چارے یہ محسوس کرتے ہیں کہ انھیں بہت ہی غیر دلچسپ اور بے رنگ قوم سمجھا جاتا ہے۔ ان کا دل نہیں توڑنا چاہیے۔"

چند روز قبل میں ایک نیا ہینڈ بیگ خرید کر زاہدہ کے ہاں چھوڑ گئی تھی۔ چلتے وقت خیال آیا کہ اسے لیتی چلوں، بیگ زاہدہ کی سنگھار میز پر رکھا تھا۔ وہ دوسرے کمرے میں اسباب باندھ رہی تھی۔ میں نے جاتے ہوئے اسے آواز دی کہ میں بیگ لیے جا رہی ہوں ——— "اچھا" اس نے جواب دیا۔ میں نیچے آ گئی۔

آسٹریلین طلبہ کے ہاں اقبال بھائی ہال کے وسط میں کھڑے آسٹریلیا اور ہندوستان کے دوستانہ تعلقات پر دھواں دھار تقریر کر رہے تھے۔

میں برابر کے کمرے میں گئی، جہاں بہت سے لڑکوں لڑکیوں کا مجمع تھا۔ اور چار پانچ ویٹر چائے بنا بنا کر سب کو دے رہے تھے۔ میں نے نیا ہینڈ بیگ وہیں ایک کھڑکی میں رکھ دیا اور چائے پینے کے بعد ہال میں لوٹ آئی۔ چلتے وقت مجھے ہینڈ بیگ کا خیال آیا۔ میں اسے اندر سے اٹھا لائی اور اقبال بھائی کے ہاتھ

میں دے دیا۔ شاید اس کا کھٹکا کھل گیا تھا۔ زینے سے اترتے ہوئے انھوں نے کھٹکا بند کیا اور بولے ـــــ "اتنے ڈھیر سارے نوٹ ؟"

میں نے بے دھیانی میں ان کی بات پوری طرح نہیں سنی اور ادھر اُدھر کی باتوں میں لگ رہی۔ اسٹیشن پر اقبال بھائی نے بیگ مجھے تھما دیا۔ گھر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ زاہدہ کی کار باہر کھڑی ہے اور دونوں میاں بیوی انتہائی سراسیمگی کی حالت میں لینڈ لیڈی مسز ڈنگ فیلڈ سے کچھ پوچھ رہے ہیں۔ زاہدہ مجھے دیکھ کر ہکلانے لگی ـــــ "وہ ـــــ وہ بیگ ـــــ وہ بیگ ـــــ!"

"ہاں! ـــــ ہاں میرے پاس ہے تو ـــــ کیوں؟"

"اس میں مَیں نے پورے پانچ سو پاؤنڈ کے نوٹ ٹھونس دیے تھے۔ تمھارے جانے کے بعد یاد آیا اور تمھاری بُھلکّڑ عادت کا خیال کر کے جان نکل گئی کہ اگر تم نے بٹوہ راستے میں کہیں اِدھر اُدھر چھوڑ دیا تو کیا ہوگا ـــــ؟ یا اللہ تیرا شکر ـــــ یا اللہ تیرا شکر ـــــ یا اللہ ـــــ!"

دوسرے روز بی بی سی میں میں نے اقبال بھائی کو یہ سنسنی خیز واقعہ سُنایا۔ اطمینان سے بولے ـــــ "وہ تو میں نے بیگ میں پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ نوٹ ٹُھنسے ہوئے ہیں۔"

"آپ نے مجھے اسی وقت کیوں نہ بتایا؟"

"میں نے کہا تو تھا تم نے سُنا ہی نہیں۔"

"آپ کو یہ خیال بھی نہ آیا کہ میرے پاس اتنا روپیا کہاں سے آگیا جسے میں اطمینان سے اُدھ کھلے بیگ میں لیے گھوم رہی ہوں۔"

"میں نے سوچا، کہیں سے آ ہی گیا ہوگا۔ پوچھنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"اور دو گھنٹے وہ بیگ اسی طرح کھڑکی میں رکھا رہا۔ اگر اس وقت چوری ہو جاتا تو میں زاہدہ کو کیا منہ دکھاتی؟ ——— یا اللہ! ——— یا اللہ ——— !"

"دیکھ منی! ——— ہونی کو کوئی انہونی نہیں کرسکتا۔ تیری گوٹیاں کی قسمت میں تھا کہ اس کا روپیا اسے صحیح سلامت واپس مل جائے۔ اب تو کیوں فکر کر رہی ہے؟ یہ بتا تو نے اچھما کے لیے بات کی؟"

اچھما کوسوکٹی ایک پریشان حال، دل گرفتہ سی لڑکی تھی جو بہت دنوں سے ملازمت اور ایک سستے سے کمرے کی تلاش میں تھی۔ حال ہی میں مسز ڈونگ فیلڈ کے تہ خانے میں ایک کمرہ خالی ہوا تھا، جس کا کرایہ صرف ڈھائی پونڈ فی ہفتہ تھا۔ مسز ڈونگ فیلڈ کا اصرار تھا کہ وہ اپنے مکان میں ہر چلتے پھرتے، ایرے غیرے کو کرایے دار نہیں رکھتیں اور صرف بہترین خاندانوں اور اعلا طبقے کے افراد کو اپنے یہاں رہنے کا شرف بخشتی ہیں۔ ان کے مرحوم شوہر کو لونیل سروس میں تھے، اور مسز ڈونگ فیلڈ برسوں کولمبو میں بڑی میم صاحب کی حیثیت سے زندگی گزار چکی تھیں۔ ان کے سسر نائٹ تھے وغیرہ وغیرہ، لیکن میاں کے مرنے اور سلطنتِ برطانیہ کے زوال کے بعد وطن واپس آکر انھیں لینڈ لیڈی بننا پڑا تھا۔ اکثر زینے پر چڑھتے یا اترتے ہوئے وہ میرا راستہ روک کر اپنی عظمتِ رفتہ کے قصے سنانے لگتیں۔

ایک دن انھوں نے بڑے رازدارانہ لہجے میں بے حد اداسی سے مجھ سے کہا تھا ——— "ایک بات سنو! اتنے اچھے اچھے جنٹلمین تمھارے دوست ہیں ان میں سے کسی ایک سے میری شادی کرادو۔"

رات کو جب میں نے تہ خانے کے کمرے کے متعلق ان سے کہا تو نہ جانے وہ کس اچھی موڈ میں تھیں کہ انھوں نے اچھما کوسوکٹی کے متعلق یہ تک نہیں پوچھا

کہ وہ کیا کرتی ہے اور ہر ہفتے کرایہ ادا کر سکے گی یا نہیں۔ چنانچہ دو تین روز میں اچھّا کو سو کٹّی وہاں منتقل ہو گئی۔

میرا فلیٹ چوتھی منزل پر تھا۔ دوسری منزل پر اور لوگوں کے علاوہ ایک ٹیلی ویژن ایکٹرس ایڈوینا کارلائل رہتی تھی، جس کے متعلق مسز ونگ فیلڈ مجھ سے کہہ چکی تھیں کہ میں تو اسے کبھی اپنے یہاں جگہ نہ دیتی مائی ڈیئر، مگر وہ بڑی خاندانی لڑکی ہے، بس ذرا اس کی زندگی پٹری سے اُتر گئی ہے۔

میری اس سے شناسائی صرف اس حد تک تھی کہ زینے پر مڈبھیڑ ہو جاتی تو وہ مسکرا کر ہلو کہہ دیا کرتی تھی۔ مسز ونگ فیلڈ نے اطلاع دی تھی کہ اکثر وہ دن دن بھر کمرے میں اکیلی بیٹھی شراب پیا کرتی ہے۔ وہ اپنے شوہر پر بُری طرح عاشق تھی۔ مگر اس نے اس بے چاری کو طلاق دے دی تھی۔ جب ہی سے اس کا یہ حال ہو گیا تھا۔

ایک رات دو بجے کے قریب مدھم سے شور سے میری آنکھ کھل گئی۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو سامنے پولس کانسٹیبل کھڑا تھا اور اس کے پیچھے مسز ونگ فیلڈ مارے بدحواسی کے آئیں بائیں شائیں کر رہی تھیں —— "غضب ہو گیا —— غضب ہو گیا —— انھوں نے کہا —— ایڈوینا نے تمھارے غسل خانے کی کھڑکی سے کود کر خودکشی کر لی —— !"

"میرے غسل خانے کی کھڑکی سے؟"

"ہاں، سب سے اُونچی کھڑکی بے چاری ایڈوینا کو یہی دستیاب ہوئی۔"

کانسٹیبل غسل خانے کے اندر گیا۔ کھڑکی کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے۔ کھڑکی کے نیچے ٹب میں ایڈوینا کا ایک سلیپر پڑا تھا۔ غسل خانے کا دروازہ لینڈنگ

پر کھلتا تھا اور مس ایڈ وینا کارلائل بڑے اطمینان سے اس میں داخل ہو کر نیچے کود گئی تھیں۔ میرے ذہن میں صبح کے تہلکہ پسند اخباروں کی سرخیاں کوندگئیں ——— اب رپورٹر میرا انٹرویو کریں گے۔ اس کھڑکی اور ٹب کی تصویریں کھنچیں گی۔ اللہ جانے کیا کیا ہوگا ——— نیچے سے آوازوں کی بھنبھناہٹ بلند ہوئی ——— "زندہ ہے ——— زندہ ہے ———!"

میں نے جھانک کر نیچے دیکھا۔ ایڈ وینا کو ایمبولنس میں لٹایا جا چکا تھا۔

"زندہ ہے ———؟" مسز ونگ فیلڈ نے ذرا مایوسی سے پوچھا اور کانسٹیبل کے ساتھ تیزی سے نیچے اتر گئیں۔

صبح کو یہ واقعہ میں نے بی بی سی کینٹین میں جملہ خواتین وحضرات کو سنایا۔ اتنے میں اقبال بھائی آ گئے۔ پورا قصہ سن کر بولے ——— "کس ہسپتال میں ہے؟" میں نے بتایا۔ اس کے بعد دوسری باتیں شروع ہو گئیں۔

اس بات کو چند ہفتے ہی گزرے تھے کہ رات کے بارہ ساڑھے بارہ بجے شور سے پھر میری آنکھ کھل گئی۔ کھڑکی میں سے میں نے جھانک کر دیکھا کہ گراونڈ فلور کی سیڑھیوں پر اقبال بھائی دم بخود کھڑے ہیں اور مسز ونگ فیلڈ ان پر بُری طرح برس رہی ہیں۔ میں گھبرا کر نیچے اُتری۔ مسز ونگ فیلڈ تقریباً ہسٹریائی انداز میں چیخ رہی تھیں۔

"مسز ونگ فیلڈ! کیا بات ہے؟" ——— میں نے ذرا درشتی سے پُوچھا۔

وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر میری طرف مڑیں ——— "تم خود فیصلہ کر لو ——— جو غنڈا ہوگا اسے غنڈا ہی کہا جائے گا۔"

جب انھوں نے اقبال بھائی کو غنڈا کہا تو مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے

میرے منہ پر تھپڑ لگا دیا ہو۔ اقبال بھائی سر جھکائے کھڑے تھے۔

مسز ونگ فیلڈ گرجتی رہیں ——— "تم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میرے یہاں جنٹلمین لڑکیوں کے کمرے میں رات کو نہیں ٹھہر سکتے ——— یہ میرا قانون ہے ——— ابھی میرے یہاں ایک خودکشی کی واردات ہو چکی ہے۔ مجھے اپنے مکان کی نیک نامی کا خیال بھی کرنا ہے۔ میں صرف اعلا خاندان ——— "

"مسز ونگ فیلڈ! اصل بات بتائیے کیا ہے؟ آپ مسٹر سکسینہ سے کیا کہہ رہی ہیں؟" ——— میں نے آگ بگولا ہو کر پوچھا۔

"ان سے پوچھ رہی ہوں کہ یہ رات کے ساڑھے بارہ بجے مس کوسوکٹی کے کمرے میں کیا کر رہے تھے؟"

اقبال بھائی جیسے مہذب اور وضع دار آدمی کو میری موجودگی میں ایسی لچر باتیں سننا پڑ رہی تھیں۔ ان کا چہرہ غم و غصّے سے سرخ ہو گیا تھا مگر وہ خاموش رہے۔

مسز ونگ فیلڈ غصّے سے بے قابو ہو کر چند منٹ تک اسی طرح چلّاتی رہیں۔ گیلری کے دروازے کھلے اور بند ہوئے۔ اوپر کی منزلوں کے دریچوں میں سے سر باہر نکال کر لوگوں نے جھانکا۔ اقبال بھائی چُپ کھڑے رہے۔ پھر وہ دفعتاً خاموش ہو گئیں اور اپنے کمرے میں جا کر دروازہ زور سے بند کر لیا۔

نیچے تہ خانے میں اچمّا کوسوکٹی تیز بخار میں نیم بے ہوش پڑی تھی۔ اقبال بھائی رات کے گیارہ بجے دوا لے کر اس کے پاس پہنچے تھے اور گھنٹے بھر سے اس کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اسی وقت مسز ونگ فیلڈ نے زینے کے دروازے میں جا کر چلّانا شروع کر دیا تھا۔

"مجھے معلوم نہ تھا کہ اچھما بیمار ہے" ——— میں نے نادم ہو کر کہا ——— "میں بھی دس بجے کے بعد واپس آئی ہوں۔"

"مجھے خود معلوم نہ تھا" ——— اقبال بھائی نے کہا ——— "دس بجے اس کا فون آیا کہ اس کی طبیعت بہت سخت خراب ہے۔" پھر انھوں نے آہستہ سے برساتی کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک لفافہ نکال کر مجھے دیا ——— "اسے روپے کی ضرورت ہوگی۔ صبح کو اسے دے دینا" اتنا کہہ کر وہ سر جھکائے ہوئے سیڑھیاں اُتر کر پھاٹک سے باہر چلے گئے۔ میں نے لفافہ کھولا۔ اس میں دس پاؤنڈ کے نوٹ تھے۔ یہ دس پاؤنڈ اقبال بھائی نے جانے کون کون سے جتن کر کے کمائے ہوں گے۔ میں انھیں سر جھکاتے، گھسی ہوئی برساتی اوڑھے تیز تیز قدم رکھتے سنسان سڑک پر ایک طرف کو جاتا دیکھتی رہی۔

دوسرے دن میں چند ہفتے کے لیے شہر سے باہر جا رہی تھی۔ واپس آکر میں ایک اور جگہ منتقل ہو گئی۔ مجھے مسز ونگ فیلڈ سے کوفت ہونے لگی تھی۔ لینڈ لیڈیاں زیادہ تر عامیانہ ہوتی ہیں۔ مگر مسز ونگ فیلڈ جس انتہائی گھٹیا انداز میں اقبال بھائی پر چیخی تھیں، اس منظر کی یاد میرے لیے بہت تکلیف دہ تھی۔

اچھما کوسوکٹی تندرست ہو چکی تھی۔ اسے کہیں نوکری بھی مل گئی تھی، مگر اپنے لیے ساری دوڑ دھوپ کروانے اور اپنے کام نکلوانے کے بعد اس نے اقبال بھائی کی طرف سے یکایک سرد مہری اختیار کر لی۔ لیکن وہ وضع داری سے اس سے شناسائی نبھاتے رہے۔

ایک روز فون کی گھنٹی بجی اور ایک خاتون کی آواز آئی ——— "ہلو ——— ہلو ——— میں مسز آلُو ویہارے بول رہی ہوں ——— !"

"مسز آلُو ویہارے ——— ؟" میں نے دہرایا۔

"ہاں! تم مجھے پہچانتی نہیں ——؟ میں تمھاری پرانی لینڈلیڈی ہوں، سابق مسز ونگ فیلڈ —— میری شادی ہوگئی ہے۔ آج شام کو میرے ساتھ آکر چائے پیو —— !"

شام کو مسز آلو ویہارے اپنے کمرۂ نشست کے دروازے پر شاداں فرحاں مجھ سے ملیں۔

کمرے کے آتش دان پر ایک تصویر رکھی تھی، جس میں مسز آلو ویہارے اپنی عمر سے کوئی دس سال چھوٹے ایک سنگھالی آدمی کے ساتھ پھولوں کا گچھا ہاتھ میں لیے کھڑی مسکرا رہی تھیں۔ دولھا کے برابر میں اقبال بخت سکینہ کوٹ کے کالر میں کارنیشن سجائے متبسم تھے۔

"مسٹر سکینہ میرے شوہر کے بیسٹ مین تھے ——" مسز آلو ویہارے نے اطلاع دی۔

اقبال بھائی ——! دوسرے روز میں نے موصوف سے استفسار کیا۔

"دیکھ منّی بات یہ ہوئی کہ اس رات جو وہ بی بی پنجے جھاڑ کر اس بری طرح میرے پیچھے پڑ گئیں تو میں فوراً سمجھ گیا کہ وہ حد سے زیادہ فرسٹریشن اور تنہائی کی شکار ہیں۔ ان کی مدد کرنا چاہیے۔ تو نے بتایا تھا کہ وہ کالے آدمی تک سے شادی کرنے کو تیار ہیں۔ میں کولمبو کے اس آلو ویہارے کو جانتا تھا، جو کسی دولت مند بیوہ کی تلاش میں تھا۔ بڑا شریف اور غریب لڑکا ہے۔ میں نے مسز ونگ فیلڈ کا پتا اسے بتا دیا۔ دونوں کی زندگی بن گئی۔ اس میں کوئی حرج ہوا میرا؟"

اقبال بھائی سمیت طلبہ کا بہت بڑا جتھا سالانہ یوتھ فیسٹول کے لیے پراگ جا رہا تھا۔ اس سال پاکستانی طلبہ کو کمیونسٹ ممالک جانے کی ممانعت کر دی گئی تھی اور ان میں سے چند لوگ اس وجہ سے بہت دل گرفتہ تھے۔ وفد کے

پراگ روانہ ہونے سے ایک روز قبل ایک تقریب میں مشرقی پاکستان کے ایک طالب علم نے افسوس سے کہا ——— "ہم لوگ اس سال نہیں جا سکتا ——— ادھر ورلڈ کا سارا کنٹری ہوگا۔ خالی پاکستان نہیں ہوگا"۔—— اقبال بھائی فوراً اس کے پاس گئے اور رسان سے بولے ——— "نورالفرقان بھائی! دل چھوٹا مت کرو۔ پاکستان کی نمائندگی میں کر دوں گا"۔

پراگ میں دنیا بھر سے آئے ہوئے نوجوان ایک عظیم الشان کانسرٹ میں اپنے اپنے ملکوں کے عوامی گیت گا رہے تھے۔ اتنے میں اسٹیج پر خاموشی چھائی۔ ایک لڑکی نے اناؤنس کیا ——— "اب ہمارے عزیز ملک پاکستان کے نمائندے اپنے دیس کے مزدوروں کا گیت سنائیں گے"۔

پاکستان کے نام پر بہت دیر تک تالیاں بجتی رہیں اور سفید کھڑکھڑاتی ہوئی شلوار، سیاہ شیروانی اور بھورے رنگ کی قراقلی سے مزین بے حد رعب داب اور وقار سے چلتے ہوئے کامریڈ اقبال بخت مائیکروفون کے سامنے آئے پاکستان میں عوامی اور ترقی پسند تحریک کی ناکامی کے اسباب پر روشنی ڈالی۔ اور کہا ——— "ساتھیو! اب میں آپ کو اپنے وطن عزیز کے محنت کش طبقے کا ایک محبوب اور روح پرور گیت سناتا ہوں"۔ اور بے حد پاٹ دار آواز میں انھوں نے شروع کیا:

بوجھ اٹھالو ہیّا ہیّا! ——— بوجھ اٹھایا۔ ہیّا ہیّا!
محل بنے گا راجا جی کا ——— پیٹ پلے گا مہاراتہارا!
اونچا کر لو ہیّا ہیّا! ——— بوجھ اٹھالو شیر بہادر ہیّا ہیّا

مجمع پر اس گیت کا بے انتہا اثر ہوا، اور حسب معمول سامعین نے ساتھ ساتھ آواز ملانی شروع کر دی۔ مگر آگے چل کر سید مطلبی فریدآبادی کے اس مشہور گیت

کے باقی بول اقبال بھائی کے ذہن سے بالکل اتر گئے۔ دراصل ان کو یاد ہی صرف تین بول تھے۔ لیکن انھوں نے بڑے اطمینان سے گانا جاری رکھا:

پیالی اٹھاؤ کیسے بھائی ——— ایسے بھائی ہیّا ہیّا
چمچہ اٹھاؤ چمچہ اٹھایا ——— ہاں ہاں بھائی ہیّا ہیّا

ہزاروں کے مجمع نے ایک ساتھ دہرا دیا:

چمچہ اٹھاؤ چمچہ اٹھایا ——— ہاں ہاں بھائی ہیّا ہیّا

اس طرح جو جو الفاظ اقبال بھائی کے دماغ میں آتے گئے وہ ہیّا ہیّا کے ساتھ جوڑتے گئے اور تالیوں کے طوفان میں ان کا گیت انتہائی کامیابی کے ساتھ ختم ہوا۔

چیکوسلواکیہ سے واپسی کے کچھ دن بعد اقبال بھائی نے اطلاع دی:
"میں نے سانپوں کا کاروبار شروع کر دیا ہے۔"

"سانپوں کا کاروبار ———؟" میں نے دہرایا۔ مگر مجھے مطلق تعجب نہ ہوا۔ کیونکہ اقبال بھائی کچھ بھی کر سکتے تھے۔

"کچھ سو بندر بھی ہیں" ——— انھوں نے ذرا انکسار سے اضافہ کیا ——— "دراصل" ——— انھوں نے کھنکار کر کہنا شروع کیا ———
"بات یہ ہے منّی کہ یہ اپنے خالد صاحب جو ہیں نا، ان کے سسر مسٹر چراغ دین امریکہ کے چڑیا گھروں اور تجربہ گاہوں کو سانپ اور بندر سپلائی کرتے ہیں۔ مجھے انھوں نے اپنی فرم میں نوکر رکھ لیا ہے اور اب میں وہاں کا کام سنبھالنے امریکہ جا رہا ہوں۔"

چنانچہ اقبال بھائی سانپوں کا کاروبار کرنے امریکہ چلے گئے۔
ایک روز ڈاک کے ذریعہ مجھے ایڈوینا کارلائل کا مختصر سا خط ملا، جو آئرلینڈ

سے آیا تھا۔ ایڈ و نیا کار لائل نے لکھا تھا

ساری دنیا نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔ مجھے اپنے وجود سے نفرت ہو چکی تھی۔ میں نے موت کا سہارا ڈھونڈا۔ مگر مرنے میں بھی اپنی زندگی ہی کی طرح ناکام رہی۔ سال بھر تک میں پلاسٹر آف پیرس میں جکڑی ہسپتال میں پڑی رہی اور مسٹر سکسینہ ہر ہفتہ ہر موسم میں، ہر حالت میں گھنٹہ بھر کے لیے میرے پاس آکر بیٹھتے تھے اور سمجھاتے تھے کہ زندہ رہنے کے لیے ہمت نہ ہارنا کس قدر ضروری ہے!

مجھے معلوم نہیں آج کل وہ کہاں ہیں؟ یہ خط میں آپ کو اس لیے لکھ رہی ہوں کہ ان کو میرا اسلام پہنچا دیجیے ــــــــ"

مگر مجھے بھی معلوم نہیں تھا کہ مسٹر سکسینہ آج کل کہاں ہیں، انھوں نے امریکہ پہنچ کر کسی کو ایک کارڈ تک نہ بھیجا تھا۔

میں وطن واپس آگئی۔ اقبال بھائی کے لیے کسی کو معلوم نہ ہوا کہ وہ کون سی وادی اور کون سی منزل میں ہیں۔ لیکن کوئی چار سال ہوئے میری ایک چچازاد بہن تعلیم ختم کر کے سان فرانسسکو سے لوٹی تو اس نے اطلاع دی:

"میں نے اقبال بھائی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔"

"کہاں ــــــــ؟"

"ہالی وُڈ میں ــــــــ خاص الخاص بیورلی ہلز پر ــــــــ!"

"بیورلی ہلز پر کیا کرتے ہیں؟"

"رہتے ہیں، ایک بہت عالی شان محل ہیں، جس میں دو سوئمنگ پول ہیں۔ کیڈلیک کاروں کی ایک فلیٹ ہے وغیرہ وغیرہ ــــــــ مجھے انھوں نے کھانے پر بھی بلایا اپنے ہاں ــــــــ نیگرو بٹلر ــــــــ اور ــــــــ اور ــــــــ"

راوی نے مزید یہ بتایا کہ سانپوں کے کاروبار کے لیے امریکہ پہنچنے کے تیسرے دن ہی مسٹر چراغ دین اور مسٹر اقبال بخت سکسینہ کے درمیان کچھ اختلاف رائے ہو گیا، جس کے نتیجے کے طور پر مسٹر سکسینہ کو اپنی ملازمت سے مستعفی ہونا پڑا۔ اس کے بعد سنہری مواقع کے اس دیس میں موصوف انواع و اقسام کی ملازمتیں اور مزدوریاں کرتے کیلی فورنیا پہنچے۔ وہاں سکھ اور پنجابی مسلمان زمین داروں کے کھیتوں پر کام کرتے رہے۔ وہاں سے ہالی وُڈ تشریف لے گئے اور مشرق کے متعلق بنائی جانے والی تصویروں میں چینی رکشا والے، ہندستانی فقیر، قلی اور سپیرے اور عرب بدّو کے ایک ایک دو دو منٹ والے رول بخیر خوبی ادا کرتے رہے۔ اور ایک ریسٹوران میں ویٹر بن گئے ایک مشہور پروڈیوسر کی کروڑپتی بیوہ اس جگہ کبھی کبھی کھانا کھانے آیا کرتی تھی، وہ لاولد اور بے حد بوڑھی عورت تھی جسے آنکھوں سے بھی کم سجھائی دیتا تھا۔ اور وہ بیورلی ہلز پر اپنے شان دار محل کے اندر شدید تنہائی میں زندہ تھی — ہالی وُڈ حسن اور جوانی کا پرستار ہے۔ ایک پچھتر سالہ بوڑھی اور اندھی عورت سے دو منٹ بات کرنے کا بھی وہاں کسی کے پاس وقت نہ تھا۔ جب وہ ریسٹوران میں آ کر کونے میں اپنی مخصوص میز پر بیٹھ جاتی تو اقبال بھائی بڑی محبت سے اس کی مزاج پرسی کرتے۔ ان کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کون ہے؟ بوڑھی ان کی بے حد ممنون ہو گئی اور اس نے ان کو اپنے گھر مدعو کیا۔ پھر وہ اکثر اس کے ہاں جاتے اور اسے اخبار اور رسالے پڑھ کر سناتے۔ اس بوڑھی کی کمپینین اپنی دوسرا تھ کے معاوضے میں بھاری تنخواہ لیتی تھیں۔ اقبال بھائی محض جذبۂ انسانیت کی بنا پر اس کے پاس بیٹھے رہتے۔ آخر اس نے اصرار کیا کہ وہ اس کے ہاں منتقل ہو جائیں۔ چنانچہ اقبال بھائی اب بیورلی ہلز کے اس محل میں رہتے

ہیں اور بڑھیا شاید قانونی طور پر ان کو اپنا بیٹا بنانے والی ہے!

"اقبال بخت سکینہ کی داستان" ——— یہ ساری کتھا سن کر کسی نے کہا ——— "کامیابی کی کلاسیک داستان ہے"

لیکن چھ مہینے کے بعد ایک اور صاحب امریکہ سے واپس آئے۔ انھوں نے اقبال بھائی کو اسی ریستوران میں ویٹر کے یونی فارم میں دیکھا۔ تب یہ معلوم ہوا کہ اس کروڑپتی بڑھیا کا انتقال ہوگیا۔ وہ کافی خبطی اور سنکی ضعیفہ تھی اور اپنی ساری دولت اس نے پیرس کے کسی سبزی فروش کے نام چھوڑی ہے۔ اقبال بھائی اپنے کام پر واپس آچکے ہیں۔

آج تیسرے پہر کو میں شاردا مہتہ کے گھر کے سامنے سے گزر رہی تھی کہ اس نے مجھے آواز دی۔ وہ اسی وقت کار میں سوار ہو رہی تھی ——— "کہاں جا رہی ہو ——— ؟" اس نے پوچھا۔ میں نے بتایا ——— "میں بھی اسی طرف جا رہی ہوں ——— آؤ! تم کو راستے میں اتار دوں گی ——— ست سنگ کا سمے تین بجے کا تھا۔ مجھے دیر ہو گئی۔"

شاردا مہتہ ایک سیدھی سادی، نارمل، مذہبی قسم کی ہاؤس وائف ہے اور جب سے اس کی اکلوتی بیٹی پولیو میں مبتلا ہوئی ہے، پوجا پاٹ، مندروں یاتراؤں، سادھو سنتوں، پیروں فقیروں، درگاہوں اور منتوں مرادوں کا سلسلہ اس کے یہاں بہت زیادہ ہوگیا ہے۔ یوں بھی وہ ان لوگوں میں سے ہے، جن کی خوش عقیدگی، بھروسے، یقین اور رجائیت کی بنا پر دنیا قائم ہے۔

مضافات میں پہنچ کر ایک جگہ ایک گجراتی سیٹھ کی شان دار وِلا میں شاردا کی کار داخل ہوئی۔ ست سنگ ختم ہو چکا تھا اور موٹریں واپس جارہی تھیں۔
"ارے۔ تمھارا ست سنگ تو ختم ہو گیا۔" میں نے کہا۔
"کوئی بات نہیں۔ میں گورو جی کے درشن تو کر لوں گی۔ وہ کل سویرے امرناتھ جا رہے ہیں۔ مجھے پانچ منٹ لگیں گے۔ تم بھی اتر آؤ۔" اس نے جواب دیا۔
سامنے برآمدے میں ایک غیر ملکی خاتون سفید ساری میں ملبوس چندن کا بڑا سا ٹیکا پیشانی پر لگائے فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھی چند خواتین کو گیتا کا سبق دے رہی تھیں۔ ان کی عمر چالیس پینتالیس برس کی رہی ہوگی اور لب و لہجے سے امریکن معلوم ہوتی تھیں ——— شاردا نے نزدیک جاکر ان کو پرنام کیا ——— "یہ ماتا جی ہیں" ——— اس نے چپکے سے مجھ سے کہا اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔
دہلیز پر چپّل اتار کر اور آنچل سے سر ڈھانپ کر میں بھی اندر گئی۔ کمرے میں سفید چاندنی بچھی تھی جس پر جا بجا گیندے کے پھول اور گلاب کی پنکھڑیاں بکھری ہوئی تھیں۔ عقیدت مند ابھی ابھی اٹھ کر گئے تھے، اس لیے چاندنی پر سلوٹیں پڑی تھیں۔ ایک طرف ہارمونیم، کھڑتالیں اور تانپورے رکھے تھے۔ دریچوں میں تازہ گلدستے سجے تھے اور لوبان جل رہا تھا۔ وسط میں صندل کی چوکی پر سفید براق کپڑے پہنے کھچڑی بالوں کی لٹیں کندھے پر چھٹکائے گورو جی پدم آسن میں بیٹھے تھے۔ گیتا کا درس انھوں نے ابھی ختم کیا تھا۔ کتاب چوکی پر رکھی تھی اور وہ خاموشی سے دریچے کے باہر دیکھ رہے تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر قطعاً تعجب نہ ہوا کہ وہ اقبال بخت سکسینہ تھے۔

انھوں نے شاید ایک بار پھر مجھے نہیں پہچانا۔ اگر پہچانا تو ظاہر نہیں کیا۔ چند لمحوں تک ٹکٹکی باندھے وہ مجھے دیکھتے رہے۔ پھر اسی طرح انھوں نے خلا پر نظریں جمادیں۔

شاردا نے جھک کر انتہائی عقیدت سے ان کے پاؤں چھوئے اور پیچھے ہٹی اور اس نے آنکھوں سے مجھے اشارہ کیا کہ میں اس کے ساتھ باہر چلوں، کیونکہ وہ درشن کر چکی تھی۔ لیکن شاردا کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ میں آہستہ سے آگے بڑھی اور میں نے جھک کر گوروجی کے پاؤں چھوئے۔

بچپن میں اقبال بھائی نے میرے کان اینٹھے تھے۔ ڈانٹ ڈانٹ کر انتہائی سخت گیری اور محنت سے پڑھنا لکھنا سکھایا تھا۔ اور استاد کا رتبہ ماں باپ کے برابر ہوتا ہے۔ وہ دنیا کے لیے جانے کس چکر میں اور کس طریقے سے "گوروجی" بن گئے تھے۔ لیکن ان کو گوروجی سمجھنے کا حق صرف مجھے پہنچتا تھا۔

انھوں نے ہاتھ اٹھاکر خاموشی سے مجھے آشیرباد دی اور اسی طرح سامنے کی طرف دیکھتے رہے۔ میں نے دبے پاؤں دہلیز تک پہنچ کر چپل پہنی اور شاردا کے ساتھ باہر آگئی۔

اب مردوں اور عورتوں کی ایک قطار "درشن" کے لیے اندر جا رہی تھی۔

اور برآمدے سے اترتے ہوئے میں نے سوچا کہ اگر میں ان سے سوال کرتی ——— "اقبال بھائی! آپ نے اب کی بار اتنا لمبا چوڑا فراڈ کیوں کیا ——— ؟" تو وہ جواب دیتے ——— "دیکھ منّی! ——— دنیا شانتی کی تلاش میں دیوانی ہوگئی ہے ——— اب اگر میں اس بھیس میں چند دُکھی

آتماؤں کو تھوڑی سی شانتی دے سکتا ہوں تو اس میں میرا کیا حرج ہے؟"
اور کیا معلوم اقبال بھائی خود بھی مُکتی کے راستے پر پہنچ گئے ہوں۔
اپنے دل کا بھید وہ خود جانیں ۔ ـــــــ دوسرے جاننے والے کون ـــ؟

کارمن

رات کے گیارہ بجے ٹیکسی شہر کی خاموش سڑکوں پر سے گزرتی ایک پرانی وضع کے پھاٹک کے سامنے جا کر رُکی۔ ڈرائیور نے دروازہ کھول کر بڑے یقین کے ساتھ میرا سوٹ کیس اتار کر فٹ پاتھ پر رکھ دیا اور پیسوں کے لیے ہاتھ پھیلائے تو مجھے ذرا عجیب سا لگا۔

"یہی جگہ ہے؟" ——— میں نے شُبے سے پوچھا۔

"جی ہاں!" ——— اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ میں نیچے اتری۔ ٹیکسی گلی کے اندھیرے میں غائب ہو گئی اور میں سنسان فٹ پاتھ پر کھڑی رہ گئی۔ میں نے پھاٹک کھولنے کی کوشش کی مگر وہ اندر سے بند تھا۔ تب میں نے بڑے دروازے میں جو کھڑکی لگی تھی اُسے کھٹکھٹایا۔ کچھ دیر بعد کھڑکی کھلی۔ میں نے چوروں کی طرح اندر جھانکا۔ اندر نیم تاریک آنگن تھا جس کے ایک کونے میں دو لڑکیاں رات کے کپڑوں میں ملبوس آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھیں۔ آنگن

کے سرے پر ایک چھوٹی سی شکستہ عمارت ایستادہ تھی۔ مجھے ایک لمحے کے لیے گھسیاری منڈی لکھنؤ کا اسکول یاد آگیا، جہاں سے میں نے بنارس یونی ورسٹی کا میٹرک پاس کیا تھا۔ میں نے پلٹ کر گلی کی طرف دیکھا جہاں مکمل خاموشی طاری تھی۔ فرض کیجیے ——— میں نے اپنے آپ سے کہا کہ یہ جگہ اُچکوں، بردہ فروشوں اور اسمگلروں کا اڈا نکلی تو ——— ؟ میں ایک اجنبی ملک کے اجنبی شہر میں رات کے گیارہ بجے ایک گمنام عمارت کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی جو گھسیاری منڈی کے اسکول سے ملتا جلتا تھا ———!

ایک لڑکی کھڑکی کی طرف آئی۔

"گڈ ایوننگ! یہ وائی ڈبلیو سی اے ہے نا ———؟" میں نے ذرا عجز سے مسکرا کر پوچھا ——— "میں نے تار دلوا دیا تھا کہ میرے لیے ایک کمرہ ریزرو کر دیا جائے"، مگر کس قدر خستہ حال وائی ڈبلیو سی اے ہے یہ ——— میں نے دل میں سوچا۔

"ہمیں آپ کا کوئی تار نہیں ملا۔ اور افسوس ہے کہ سارے کمرے گھرے ہوئے ہیں۔"

اب دوسری لڑکی آگے بڑھی ——— "یہ ورکنگ گرلز کا ہوسٹل ہے۔ یہاں عام طور سے مسافروں کو نہیں ٹھہرایا جاتا"——— اس نے کہا۔

میں یک لخت بے حد گھبرا گئی ——— اب کیا ہوگا؟ میں اس وقت یہاں سے کہاں جاؤں گی؟ ——— دوسری لڑکی میری پریشانی دیکھ کر خوش خلقی سے مسکرائی۔

"کوئی بات نہیں۔ گھبراؤ مت ——— اندر آجاؤ ——— لو ادھر سے کود آؤ ———!"

"مگر کمرہ تو کوئی خالی نہیں ہے" ——— میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا ——— "میرے لیے جگہ کہاں ہوگی ؟"

"ہاں ہاں، کوئی بات نہیں۔ ہم جگہ بنا دیں گے۔ اب اس وقت آدھی رات کو تم کہاں جا سکتی ہو ——— ؟" اسی لڑکی نے جواب دیا ——— میں سوٹ کیس اٹھا کر کھڑکی سے اندر آنگن میں کود گئی۔ لڑکی نے سوٹ کیس مجھ سے لے لیا۔ عمارت کی طرف جاتے ہوئے میں نے جلدی جلدی کہا ——— "بس آج کی رات مجھے ٹھہر جانے دو۔ میں کل صبح اپنے دوستوں کو فون کر دوں گی۔ میں یہاں تین چار لوگوں کو جانتی ہوں۔ تم کو بالکل زحمت نہ ہوگی ——— !"

"فکر مت کرو ——— !" اس نے کہا۔ پہلی لڑکی شب بخیر کہہ کر غائب ہو گئی۔

ہم سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے میں پہنچے۔ برآمدے کے ایک کونے میں لکڑی کی دیواریں لگا کر ایک کمرہ سا بنا دیا گیا تھا۔ لڑکی سرخ پھولوں والا دبیز پردہ اٹھا کر اس میں داخل ہوئی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے گئی ——— "یہاں میں رہتی ہوں۔ تم بھی یہیں سو جاؤ" ——— اس نے سوٹ کیس ایک کرسی پر رکھ دیا اور الماری میں سے صاف تولیہ اور نیا صابن نکالنے لگی۔ ایک کونے میں چھوٹے سے پلنگ پر مچھر دانی لگی تھی۔ برابر میں سنگھار میز رکھی تھی۔ اور کتابوں کی الماری۔ جیسے کمرے ساری دنیا میں لڑکیوں کے ہوسٹلوں میں ہوتے ہیں ——— لڑکی نے فوراً دوسری الماری میں سے چادر اور کمبل نکال کر فرش کے گھسے ہوئے بدرنگ قالین پر بستر بچھایا اور پلنگ پر نئی چادر لگا کر مچھر دانی کے پردے گرا دیے۔

"تمھارا بستر تیار ہے !"

مجھے بے حد ندامت ہوئی ——— "سنو، میں فرش پر سو جاؤں گی"

"ہرگز نہیں۔ اتنے مچھر کاٹیں گے کہ حالت تباہ ہو جائے گی۔ ہم لوگ ان مچھروں کے عادی ہیں۔ کپڑے بدل لو"۔۔۔۔۔۔ اتنا کہہ کر وہ اطمینان سے فرش پر بیٹھ گئی۔۔۔۔۔۔ "میرا نام کارمن ہے۔ میں ایک دفتر میں ملازم ہوں اور شام کو یونیورسٹی میں ریسرچ کرتی ہوں۔ کیمسٹری میرا مضمون ہے۔ میں وائی ڈبلیو کی سوشل سکریٹری بھی ہوں۔ اب تم اپنے متعلق بتاؤ!"

میں نے بتایا۔۔۔۔۔۔

"اب سو جاؤ۔۔۔۔۔۔!" مجھے اونگھتے دیکھ کر اس نے کہا۔ پھر اس نے دو زانو جھک کر دعا مانگی اور فرش پر لیٹ کر فوراً سو گئی۔

صبح کو عمارت جاگی۔ لڑکیاں سروں پر تولیہ لپیٹے اور ہاؤس کوٹ پہنے غسل خانوں سے نکل رہی تھیں۔ برآمدے میں سے گرم قہوے کی خوشبو آ رہی تھی۔ دو تین لڑکیاں آنگن میں ٹہل ٹہل کر دانتوں پر برش کر رہی تھیں۔

"چلو تمہیں غسل خانہ دکھاؤں"۔۔۔۔۔۔ کارمن نے مجھ سے کہا اور ہال میں سے گزر کر ایک گلیارے میں لے گئی جس کے سرے پر ایک ٹوٹی پھوٹی کوٹھری سی تھی جس میں صرف ایک نل لگا ہوا تھا اور دیوار پر ایک کھونٹی گڑی تھی۔ اس کا فرش اکھڑا ہوا تھا اور دیواروں پر سیلن تھی۔ روشن دان کے ادھر سے کسی لڑکی کے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ اس غسل خانے کے اندر کھڑے ہو کر میں نے سوچا۔ کیسی عجیب بات ہے۔۔۔۔۔۔ مدتوں سے یہ غسل خانہ اس ملک میں، اس شہر میں، اس عمارت میں اپنی جگہ پر موجود ہے۔۔۔۔۔۔ اور میرے وجود سے بالکل بے خبر۔۔۔۔۔۔ اور آج میں اس میں موجود ہوں۔ کیسا بے وقوفی کا خیال تھا۔

جب میں نہا کے باہر نکلی تو نیم تاریک ہال میں ایک چھوٹی سی میز پر میرے لیے ناشتہ چنا جا چکا تھا۔ کئی لڑکیاں جمع ہو گئی تھیں۔ کارمن نے ان سب سے میرا تعارف کرایا۔ بہت جلد ہم سب پرانے دوستوں کی طرح قہقہے لگا رہے تھے۔

"اب میں ذرا اپنے جاننے والوں کو فون کر دوں" چائے ختم کرنے کے بعد میں نے کہا۔

کارمن شرارت سے مسکرائی: ——— "ہاں اب تم اپنے بڑے بڑے مشہور اور اہم دوستوں کو فون کرو، اور ان کے ہاں چلی جاؤ۔ تمہاری پروا کون کرتا ہے۔ کیوں روزا ——— ؟"

"ہم اس کی پروا کرتے ہیں ؟"

"بالکل نہیں"——— کورس ہوا۔

لڑکیاں میز پر سے اٹھیں ——— "ہم لوگ اپنے اپنے کام پر جا رہے ہیں شام کو تم سے ملاقات ہوگی"——— میگڈیلینا نے کہا۔

"شام کو ——— ؟" ایمیلیا نے کہا ——— "شام کو یہ کسی کنٹری کلب میں بیٹھی ہوگی ——— !"

کارمن کے دفتر جانے کے بعد میں نے برآمدے میں جا کر فون کرنے شروع کیے ——— فوج کے میڈیکل چیف میجر جنرل کیمو گلڈاس جو جنگ کے زمانے میں میرے ماموں جان کے رفیق کار رہ چکے تھے ——— مسز انطونیا کوسٹیلو، ایک کروڑ پتی کاروباری کی بیوی جو یہاں کی مشہور سماجی لیڈر تھیں اور جن سے میں کسی بین الاقوامی کانفرنس میں ملی تھی ——— الفانسو ولیرا ——— اس ملک کا نامور ناول نگار اور جرنلسٹ، جو ایک دفعہ کراچی آیا تھا ——— "ہلو ———

ہلو ——— ارے ——— تم کب آئیں ——— ہمیں اطلاع کیوں نہیں دی ——— ؟ کہاں ٹھہری ہو ——— ؟ وہاں ——— ؟ گڈ گاڈ ——— ! وہ کوئی ٹھہرنے کی جگہ ہے ——— ؟ ہم فوراً انھیں لینے آ رہے ہیں ———"

ان سب نے باری باری مجھ سے یہی الفاظ دہرائے۔ سب سے آخر میں، میں نے ڈون گارسیا ڈیل پریڈوس کو فون کیا۔ یہ مغربی یورپ کے ایک ملک میں اپنے دیس کے سفیر رہ چکے تھے اور وہیں ان سے اور ان کی بیوی سے میری اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ ان کے سکریٹری نے بتایا کہ وہ لوگ آج کل پہاڑ پر گئے ہوئے ہیں۔ اس نے میری کال ان کے پہاڑی محل میں منتقل کر دی۔

تھوڑی دیر بعد مسز کوسٹیلو اپنی مرسی ڈیز میں مجھے لینے کے لیے آگئیں۔ کارمن کے کمرے میں آ کر انھوں نے چاروں طرف دیکھا اور میرا سوٹ کیس اٹھا لیا ———

مجھے دھکا سا لگا۔ میں ان لوگوں کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ میں کارمن، ایمیلیا، برنارڈا اور روزا، اور مگدلینیا کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔

"سامان ابھی رہنے دیجیے۔ شام کو دیکھا جائے گا" ——— میں نے ذرا جھینپ کر مسز کوسٹیلو سے کہا۔

"مگر تم کو اس نامعقول جگہ پر بے حد تکلیف ہوگی" وہ برابر دہراتی رہیں ———

رات کو جب میں واپس آئی تو کارمن اور ایمیلیا پھاٹک کی کھڑکی میں ٹھنسی میرا انتظار کر رہی تھیں ——— "آج ہم نے تمھارے لیے کمرے کا انتظام کر دیا ہے ———" کارمن نے کہا۔ میں خوش ہوئی کہ اب اسے فرش پر نہ سونا پڑے گا۔

ہال کی دوسری طرف ایک اور سیلے ہوئے کمرے میں دو پلنگ بچھے تھے۔ ایک پر مسز سیلیے بستر لگا تھا اور دوسرے پر مسز سوڈیل بیٹھی سگریٹ پی رہی تھیں ——— وہ اڑتیس انتالیس سال کی رہی ہوں گی۔ ان کی آنکھوں میں عجیب طرح کی اُداسی تھی۔ پولینیزین نسل کی کس شاخ سے ان کا تعلق تھا۔ ان کی شکل سے معلوم نہ ہو سکتا تھا۔ پلنگ پر نیم دراز ہو کر انھوں نے فوراً اپنی زندگی کی کہانی سنانا شروع کر دی ——— "میں گام سے آئی ہوں ———" انھوں نے کہا ——— "گام کہاں ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"بحرالکاہل میں ایک جزیرہ ہے۔ اس پر امریکن حکومت ہے۔ وہ اتنا چھوٹا جزیرہ ہے کہ دُنیا کے نقشے پر اس کے نام کے نیچے صرف ایک نقطہ لگا ہوا ہے۔ میں امریکن شہری ہوں ———" انھوں نے ذرا فخر سے اضافہ کیا۔

"گام ———" میں نے دل میں دہرایا۔ کمال ہے۔ دنیا میں کتنی جگہیں ہیں۔ اور ان میں بالکل ہمارے جیسے لوگ بستے ہیں۔

"میری لڑکی ایک وائلن بجانے والے کے ساتھ بھاگ آئی ہے۔ میں اسے پکڑنے آئی ہوں۔ وہ صرف سترہ سال کی ہے۔ مگر حد سے زیادہ خودسر ——— یہ آج کل کی لڑکیاں ———" پھر وہ دفعتاً اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ ——— "مجھے کینسر ہو گیا تھا۔"

"اوہ ——— !" میرے مُنہ سے نکلا۔

"مجھے سینے کا کینسر ہو گیا تھا ———" انھوں نے بڑے الم سے کہا ——— "ورنہ تین سال قبل ——— میں بھی ——— میں بھی اور سب کی طرح نارمل تھی ———" ان کی آواز میں بے پایاں کرب تھا ——— "دیکھو ———!" انھوں نے اپنے نائٹ گون کا کالر سامنے سے ہٹا دیا ——— میں نے لرز کر

آنکھیں بند کر لیں ———— ایک عورت سے اس کے جسم کی خوبصورتی ہمیشہ کے لیے چھن جاتے۔ کتنی قہرناک بات تھی۔

تھوڑی دیر بعد مسز سوریل سگریٹ بجھا کر سو گئیں۔ کھڑکی کی سلاخوں میں سے چاند اندر جھانک رہا تھا۔ نزدیک کے کمرے سے مگدلینیا کے گانے کی دھیمی آواز آنی بھی بند ہو گئی۔

دفعتاً میرا جی چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر روؤں۔

اگلا ہفتہ فیشن ایبل رسالوں کی زبان میں "سوشل اور تہذیبی مصروفیات کی آندھی" کی طرح "آرٹ و کلچر" کے معاملات میں گزرا۔ دن مسز کوسٹیلو اور ان کے احباب کے حسین، پُرفضا مکانوں میں اور شامیں شہر کی جگمگاتی تفریح گاہوں میں بسر ہوتیں ——— ہر طرح کے لوگ ——— انٹلکچوئیل ——— جرنلسٹ ——— مصنّف ——— سیاسی لیڈر، مسز کوسٹیلو کے گھر آتے اور ان سے بحث مباحثے رہتے اور میں انگریزی محاورے کے الفاظ میں اپنے آپ کو گویا بے حد "اینجوائے" کر رہی تھی۔ میں رات کو وائی ڈبلیو واپس آتی اور ہال کی چوکور میز کے اردگرد بیٹھ کر پانچوں لڑکیاں بڑے اشتیاق سے مجھ سے دن بھر کے واقعات سُنتیں ——— "کمال ہے ——— !" روزا کہتی ——— "ہم اسی شہر کے رہنے والے ہیں مگر ہمیں معلوم نہیں کہ یہاں ایسی الف لیلوی فضائیں بھی ہیں۔"

"یہ بے حد امیر لوگ جو ہوتے ہیں نا۔ یہ اتنے روپے کا کیا کرتے ہیں ———؟" ایمیلیا پوچھتی۔ ایمیلیا ایک اسکول میں پڑھاتی تھی، روزا ایک سرکاری دفتر میں اسٹینو گرافر تھی۔ مگدلینیا اور برنارڈا ایک میوزک کالج میں پیانو اور وائلن کی اعلا تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ یہ سب متوسط اور نچلے متوسط طبقے کی لڑکیاں تھیں۔

اتوار کی صبح کارمن ماس میں جانے کی تیاری میں مصروف تھی۔ کوئی چیز نکالنے کے لیے میں نے الماری کی دراز کھولی تو اس کے جھٹکے سے اُوپر سے ایک اونی خرگوش نیچے گر پڑا۔ میں اسے واپس رکھنے کے لیے اوپر اُچکی تو الماری کی چھت پر بہت سارے کھلونے رکھے نظر آئے۔

"یہ میرے بچّے کے کھلونے ہیں" ——— کارمن نے سنگھار میز کے سامنے بال بناتے ہوئے بڑے اطمینان سے کہا۔

"تمھارے بچّے کے ——— ؟" میں ہکّا بکّا رہ گئی اور میں نے بڑے دُکھ سے اُسے دیکھا ——— کارمن بِن بیاہی ماں تھی۔

آئینے میں میرا ردِّ عمل دیکھ کر وہ میری طرف پلٹی۔ اس کا چہرہ سُرخ ہوگیا اور اس نے کہا ——— "تم غلط سمجھیں ——— !" پھر وہ کھِل کھلا کر ہنسی اور اس نے الماری کی نچلی دراز میں سے ایک ہلکے نیلے رنگ کی چمکیلی "بے بی بک" نکالی ——— "دیکھو! یہ میرے بچّے کی سالگرہ کی کتاب ہے جب وہ ایک سال کا ہوگا تو یہ کرے گا۔ جب دو سال کا ہو جائے گا تو یہ کہے گا۔ یہاں اس کی تصویریں چپکاؤں گی ———" وہ اطمینان سے آلتی پالتی مار کر پلنگ پر بیٹھ گئی اور اسی کتاب میں سے خوب صورت امریکن بچّوں کی رنگین تصویروں کے تراشے نکال کر بستر پر پھیلا دیے ——— "دیکھو میری ناک کتنی چپٹی ہے اور نِک تو مجھ سے بھی گیا گزرا ہے۔ تو ہم دونوں کے بچّے کی ناک کا سوچو تو کیا حشر ہوگا ——— ؟ میں اس کی پیدایش سے مہینوں پہلے یہ تصویریں دیکھا کروں گی تاکہ اس بے چارے کی ناک پر کچھ اثر پڑے۔"

"تم دیوانی ہو اچھی خاصی ——— !" میں نے کہا ——— "اور یہ نِک کون بزرگ ہیں ——— ؟"

اس کا رنگ ایک دم سفید پڑ گیا ——— "ابھی اس کا ذکر نہ کرو۔ اس کے نام پر مجھے لگتا ہے کہ میرا دل کٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔"

مگر اس کے بعد وہ برابر نِک کا ذکر کرتی رہی ——— "میں اتنی بدصورت ہوں۔ مگر نِک کہتا ہے ——— کارمن ——— کارمن ——— مجھے تمھارے دل سے، تمھارے دماغ سے، تمھاری روح سے عشق ہے" نِک نے اتنی دنیا دیکھی ہے۔ اتنی حسین لڑکیوں سے اس کی دوستی رہی ہے مگر اسے میری بدصورتی کا ذرا بھی احساس نہیں۔"

گرجا سے واپسی پر، خلیج کے کنارے کنارے سڑک پر چلتے ہوئے، وائی ڈبلیو کے نمناک ہال میں کپڑوں پر استری کرتے ہوئے کارمن نے مجھے اپنی اور نِک کی داستان سنائی۔ نِک ڈاکٹر تھا اور ہارٹ سرجری کی اعلا ٹریننگ کے لیے باہر گیا ہوا تھا۔ اور اسے دیوانہ وار چاہتا تھا۔

رات کو میں مسز سوریل کے کمرے سے کارمن کے کمرے میں واپس آچکی تھی۔ کیونکہ مسز سوریل اپنی لڑکی کو پکڑ لانے میں کامیاب ہو گئی تھیں اور لڑکی اب ان کے ساتھ مقیم تھی۔ سونے سے پہلے میں مچھر دانی ٹھیک کر رہی تھی۔ کارمن پھر فرش پر آسن جمائے بیٹھی تھی۔

"نِک ———" اس نے کہنا شروع کیا۔

"آج کل کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"معلوم نہیں۔"

"تم اسے خط نہیں لکھتیں؟"

"نہیں"

"کیوں؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"تم خدا پر یقین رکھتی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"یہ تو بہت لمبا چوڑا مسئلہ ہے۔" میں نے جماہی لے کر جواب دیا —

"مگر یہ بتاؤ کہ تم اسے خط کیوں نہیں لکھتیں؟"

"پہلے میرے سوال کا جواب دو ——— تم خدا پر یقین رکھتی ہو؟"

"ہاں ——— !" میں نے بحث کو مختصر کرنے کے لیے کہا۔

"اچھا تو تم خدا کو خط لکھتی ہو؟"

عمارت کی روشنیاں بجھ گئیں۔ رات کی ہوا میں آنگن کے درخت سرسرا رہے تھے۔ کمرے کے دروازے پر پڑا ہوا سرخ پھولوں والا پردہ ہوا کے جھونکوں سے پھڑ پھڑائے جا رہا تھا۔ میں نے اٹھ کر اسے ایک طرف سرکا دیا۔

"بہت خوبصورت پردہ ہے۔" میں نے پلنگ کی طرف لوٹتے ہوئے اظہارِ خیال کیا۔ کارمن فرش پر کروٹ بدل کر آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔ میری بات پر وہ پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اور اس نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا ———

'میں اور نِک ایک مرتبہ پہاڑی علاقے میں کئی سو میل کی ڈرائیو کے لیے گئے تھے ——— سن رہی ہو؟"

"ہاں ——— ہاں ——— بتاؤ ——— !"

"راستے میں نِک نے کہا کہ چلو ڈون ریموں سے ملنے چلیں۔ ڈون ریموں" نِک کے والد کے دوست اور کابینہ کے وزیر تھے اور انھوں نے حال ہی میں اپنے ضلع کے پہاڑی مقام پر نئی کوٹھی بنوائی تھی۔ جب ہم لوگ ان کی کوٹھی کے نزدیک پہنچے تو سامنے سے سفید فراک پہنے بہت سی چھوٹی بچیاں ایک

اسکول سے نکل کر آتی دکھائی دیں۔ مجھے وہ منظر ایک خواب کی طرح یاد ہے۔ پھر ہم لوگ اندر گئے اور مسز رمیوں کے انتظار میں ان کے شاندار ڈرائنگ روم میں بیٹھے۔ کیبنٹ منسٹر گھر پر موجود نہیں تھے۔ ڈرائنگ روم اور اسٹڈی کے درمیان جو دیوار تھی اس میں شیشے کی ایک چوکور ڈبے ایسی کھڑکی میں پلاسٹک کی ایک بہت بڑی گڑیا سجی تھی جو کمرے کی نفیس آرایش کے مقابلے میں بہت بھدی معلوم ہو رہی تھی۔ ہم دونوں اس بدمذاقی پر چپکے سے مسکرائے پھر مسز رمیوں برآمد ہوئیں۔ انھوں نے ہمیں ٹھنڈی چائے پلائی اور سارا گھر دکھلایا۔ ان کے غسل خانے سیاہ ٹائل کے تھے اور مہمان کمرے کے نفیس "دیوان بیڈ" سُرخ پھول دار ٹیپسٹری (TAPESTRY) کے جھالر والے غلافوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ ان پلنگوں کو دیکھ کر نک نے چپکے سے مجھ سے کہا تھا ——

"بدمذاقی کی انتہا" اور میں نے اپنے دل میں کہا تھا —— کوئی بدمذاقی نہیں۔ میں تو اپنے گھر کے لیے ایسے ہی پلنگ خریدوں گی اور اسی رنگ کے غلاف بنواؤں گی۔ اس کے بعد —— میں جب بھی گھریلو ساز و سامان کی دکانوں سے گزرتی تو اس کپڑے کو دیکھ کر میرے قدم ٹھٹھک جاتے —— پھر میں نے تنخواہ میں سے بچا بچا کر اسی قیمتی کپڑے کا یہ پردہ خرید لیا

"جب میں ایک مخصوص چینی ریستوران کے آگے سے گزرتی ہوں —" وہ اسی آواز میں کہتی رہی —— "اور شیشے کے دریچے کے قریب رکھی ہوئی میز اور اس پر جلتا ہوا سبز لیمپ نظر آتا ہے۔ وہاں میں نے ایک شام نک کے ساتھ کھانا کھایا تھا۔"

مجھے نیند آرہی تھی اور میں ناب کے اس وظیفے سے اکتا چکی تھی۔ میں نے مچھر دانی کے پردے گراتے ہوئے کہا —— "ایک بات بتاؤ۔ تم کو اس

قدر شدید عشق ہے اپنے اس نِک سے تو تم نے اس سے شادی کیوں نہ کرلی ؟ اب تک کیوں جھک مارتی رہیں ——— ؟"

"مجھے دس سال تک ایک دُور افتادہ جزیرے میں اپنے بابا کے ساتھ رہنا پڑا" ——— اس نے اُداسی سے جواب دیا — "پہلے ہم لوگ اسی شہر میں رہتے تھے ۔ جنگ کے زمانے میں بمباری سے ہمارا چھوٹا سا مکان جل کر راکھ ہوگیا اور میری ماں اور دونوں بھائی مارے گئے۔ صرف میں اور میرے بابا زندہ بچے ۔ بابا ایک اسکول میں سائنس ٹیچر تھے ۔ ان کو ٹی بی ہوگئی ۔ اور میں نے انھیں سینے ٹوریم میں داخل کرادیا جو بہت دور کے جزیرے میں تھا ——— سینے ٹوریم بہت مہنگا تھا اس لیے کالج چھوڑتے ہی میں نے اسی صحت گاہ کے دفتر میں نوکری کرلی اور آس پاس کے دولت مند زمینداروں کے گھروں میں ٹیوشن بھی کرتی رہی، مگر بابا کا علاج اور زیادہ مہنگا ہوتا گیا۔ تب میں نے اپنے گانو جاکر انناس کا آبائی باغیچہ رہن رکھ دیا ۔ تب بھی بابا اچھے نہ ہوتے ۔ میں ایک جزیرے سے دوسرے جزیرے تک کشتی میں بیٹھ کر جاتی اور زمینداروں کے محلوں میں ان کے کند ذہن بچوں کو پڑھاتے پڑھاتے تھک کر چُور ہوجاتی ۔ تب بھی بابا اچھے نہ ہوتے۔ نِک سے میری ملاقات آج سے دس سال قبل ایک فیسٹا (FIESTA) میں ہوئی تھی۔ اس دوران میں جب بھی میں دارالسلطنت آتی وہ مجھ سے ملتا رہتا ۔ تین سال ہوتے اس نے شادی پر اصرار کیا ۔ لیکن بابا کی حالت اتنی خراب تھی کہ میں ان کو مرتا چھوڑ کر یہاں نہ آسکتی تھی ۔ اسی زمانے میں نِک کو باہر جانا پڑ گیا جب بابا مر گئے تو میں یہاں آگئی ۔ اب میں یہاں ملازمت کر رہی ہوں اور اگلے سال یونیورسٹی میں اپنا مقالہ بھی داخل کردوں گی ۔ میں چاہتی ہوں کہ بابا

کے کھیت بھی رہن سے چھڑالوں - نِک میری مدد کرنا چاہتا تھا مگر میں شادی سے پہلے اس سے ایک پیسا نہ لوں گی - اس کے خاندان والے بڑے بد دماغ اور اکڑفوں والے لوگ ہیں - اور ایک لڑکی کے لیے اس کی عزتِ نفس بہت بڑی چیز ہے - عزتِ نفس اور خودداری اور خود اعتمادی، اگر مجھے کبھی یہ احساس ہو جائے کہ نِک بھی مجھے حقیر سمجھتا ہے ـــــ یا مجھے ـــــ ؟ سوگئیں ـــــ ؟ اچھا گڈ نائٹ ـــــ !"

دوسرے روز صبح وہ تیار ہو کر حسب معمول سب سے پہلے ناشتے کی میز پر انتظام کے لیے پہنچ چکی تھی - مسز سوریل گام واپس جا رہی تھیں - اپنے ہونے والے داماد سے ان کی صلح ہو گئی تھی - وہ سویرے ہی سے آن پہنچا تھا - وہ ایک منحنی سا نوجوان تھا اور برآمدے کے ایک کونے میں بھیگی بلی بنا بیٹھا تھا - فضا پر عجیب سی بشاشت طاری تھی - لڑکیاں بات بات پر قہقہے لگا رہی تھیں - میں بھی بہت مسرور تھی اور خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی - یہ ہلکے پھلکے پن اور مکمل امن و سکون کا شگفتہ احساس زندگی میں بہت کم آتا ہے اور صرف چند لمحے رہتا ہے - مگر وہ لمحے بہت غنیمت ہیں -

کارمن جلدی جلدی ناشتہ ختم کر کے دفتر چلی گئی -

"آج بھی تم اپنے شان دار دوستوں سے ملنے نہ جا رہی ہو نہیں تو تم کو جیپنی JEEPNEY میں بٹھا کر شہر کے گلی کوچوں کی سیر کراتے ـــــ"

مگدیلینا نے مجھ سے کہا -

"تمھارے لیے ایک کیڈی لیک آئی ہے بھئی!" ـــــ روزا نے اندر آکر اطلاع دی

"کیڈی لیک ـــــ ؟ اُفوہ ـــــ !" کورس ہوا -

"تمھارے لیے ایسی ایسی جغادری موٹریں آتی ہیں کہ ہم لوگوں کی رعب کے مارے بالکل گھگھی بندھ جاتی ہے ——— !" برنارڈا نے خوش دلی سے اضافہ کیا۔ میں نے لڑکیوں کو خدا حافظ کہا اور اپنا سفری بیگ کندھے سے لٹکا کر باہر آ گئی۔ میں سابق سفیر ڈون گارسیا ڈیل پریڈوس کے ہاں دو دن کے لیے ان کے ہل اسٹیشن جا رہی تھی۔ ان کے وردی پوش شوفر نے سیاہ کیڈی لیک کا دروازہ مودبانہ بند کیا اور کار شہر سے نکل کر سرسبز پہاڑوں کی سمت روانہ ہو گئی۔

پہاڑ کی ایک چوٹی پر ڈون گارسیا کا ہسپانوی وضع کا شاندار گھر درختوں میں چھپا دور سے نظر آ رہا تھا۔ وادیوں میں کہرا منڈلا رہا تھا اور سفید اور کاسنی اور سرخ اور زرد رنگ کے پہاڑی پھول سارے میں کھلے ہوئے تھے۔ کار پھاٹک میں داخل ہو کر پورچ میں رک گئی۔ قبائلی نسلوں والی شائستہ نوکرانیاں باہر نکلیں۔ بٹلر نے نیچے آ کر کار کا دروازہ کھولا۔ ہال کے دروازے میں ڈون گارسیا اور ان کی بیوی ڈونا ماریا میرے منتظر تھے۔ ان کا گھر سفید قالینوں اور سنہرے فرنیچر اور انتہائی قیمتی سامانِ آرائش سے سجا ہوا تھا اور اس طرح کے کمرے تھے جن کی تصویریں لائف میگزین کے رنگین صفحات پر "پیریڈ فرنیچر" یا "انٹیریر ڈیکوریشن" کے سلسلے میں اکثر شائع کی جاتی ہیں۔

کچھ دیر بعد میں ڈونا ماریا کے ساتھ اوپر کی منزل پر گئی۔ وہاں شیشوں والے برآمدے کے ایک کونے میں ایک نازک سی بید کی ٹوکری میں ایک چھ مہینے کی بے حد گلابی بچی پڑی غاؤں غاؤں کر رہی تھی۔ وہ بچی اس قدر پیاری سی تھی کہ میں ڈونا ماریا کی بات ادھوری چھوڑ کر سیدھی ٹوکری کے پاس چلی گئی ایک بے حد حسین، صحت مند، تر و تازہ، اور کمسن امریکن لڑکی نزدیک کے صوفے

سے اٹھ کر میری جانب آئی اور مسکرا کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"یہ میری بہو ہے" ——— ڈونا ماریا نے کہا۔

ہم تینوں ٹوکری کے گرد کھڑے ہو کر بچی سے لاڈ پیار میں مصروف ہو گئے۔

دوپہر کو لنچ کی میز پر امریکن لڑکی کا شوہر بھی آ گیا۔

"یہ ہمارا بیٹا ہوزے ہے" ——— ڈون گارسیا نے کہا

ہوزے کی عمر تقریباً پینتیس سال کی رہی ہوگی۔ اپنی قومی کرختگی کی ہلکے آبی رنگ کی قمیص اور سفید پتلون میں وہ خاصا وجیہہ معلوم ہو رہا تھا۔ وہ اپنی نوعمر بیوی کو بے انتہا چاہتا تھا اور بچی پر عاشق تھا۔ زیادہ تر وہ اُسی کی باتیں کرتا رہا۔

رات کو میں اپنی بے حد پُرتکلف اور بڑھیا خواب گاہ میں گئی جس کے ساز و سامان کو ہاتھ لگاتے فکر ہوتی تھی کہ کہیں میلا نہ ہو جائے۔ اس وقت مجھے "وائی ڈبلیو" کے سیلے ہوئے کمرے اور تنگ مچھر دانی اور مسز سوریل اور ہال کی مدرنگ میز کرسیاں شدّت سے یاد آئیں!

دو دن بعد پریڈوس خاندان میرے ساتھ ہی دارالسلطنت واپس لوٹا۔ اپنے ماں باپ کو ان کے ٹاؤن ہاؤس میں اُتارنے کے بعد ہوزے نے مجھے میری جائے قیام پر پہنچانے کے لیے کیڈی لیک دوبارہ اسٹارٹ کی۔ ہوزے اور اس کی بیوی ڈوروتھی صرف دو ہفتے قبل امریکہ سے لوٹے تھے۔ ان کا بہت سا سامان کسٹم ہاؤس میں پڑا تھا جسے چھڑانے کے لیے انھیں جانا تھا۔

شہر کے سب سے اعلا ہوٹل کے سامنے ہوزے نے کار روک لی۔

"یہاں کیا کرنا ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"تم یہیں ٹھہری ہونا؟"

"نہیں! ڈیر ہوزے۔ میں وائی ڈبلیو سی اے میں ٹھہری ہوں۔"
"وائی ڈبلیو ——— ؟ گڈ گاڈ ——— ! کمال ہے۔ اچھا، وہیں چلتے ہیں مگر کیا تم کو یہاں جگہ نہ مل سکی؟ تمھیں چاہیے تھا کہ آتے ہی ڈیڈی کو اطلاع دیتیں ——— !"

اس وقت مجھے دفعتاً خیال آیا کہ میں ہر طبقے اور ہر قسم کے لوگوں کو اپنی افتادِ طبع کے ذریعے کم از کم اپنی حد تک ذہنی طور پر ہموار کرتی چلی جاتی ہوں مگر ہوزے اور اس کے والدین اس ملک کے دس دولت مندترین خاندانوں میں شامل تھے اور یہاں کے حکمران طبقے کے اہم ستون تھے اور ان لوگوں کو یہ سمجھانا بالکل بے کار تھا کہ مجھے وائی ڈبلیو کیوں اتنا اچھا لگتا ہے اور میں وہاں ٹھہرنے پر کیوں اس قدر مصر ہوں۔

ہوزے نے گلی کے نکڑ پر کار روک لی۔ کیونکہ "جیپنیوں" کی قطار نے سارا راستہ گھیر رکھا تھا۔ میں جب وائی ڈبلیو کے اندر پہنچی تو سب لوگ سو چکے تھے۔ میں چپکے سے جا کر اپنی مچھر دانی میں گھس گئی۔ کارمن حسب معمول فرش پر سکون کے ساتھ سو رہی تھی۔ اس کے سرھانے سانتو طوماس (سینٹ طامس) کی تصویر پر گلی کے لیمپ کا مدھم عکس جھلملا رہا تھا۔

صبح چار بجے اٹھ کر میں دبے پاؤں چلتی شکستہ غسل خانے میں گئی اور آہستہ سے پانی کا نل کھولا۔ مگر پانی کی دھار اس زور سے نکلی کہ میں چونک اٹھی۔ اسی طرح چپکے چپکے کمرے میں آ کر میں نے اسباب باندھا تاکہ آہٹ سے کارمن کی آنکھ نہ کھل جائے۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ وہ فرش پر سے غائب ہے۔ کچھ دیر بعد اس نے آ کر کہا ——— "ناشتہ تیار ہے" ——— وہ ٹیکسی کے لیے فون بھی کر چکی تھی۔

"کیسا سفر رہا ——— ؟" اس نے چائے اُنڈیلتے ہوئے پوچھا۔

"بہت دل چسپ !"

"یہ تمھارے دوست لوگ کون تھے، جہاں تم گئی تھیں ——— ؟ تم نے بتایا ہی نہیں !"

میں بات شروع کرنے ہی والی تھی کہ —— اچانک ایک خیال آیا۔ میں نے جلدی سے کمرے میں جاکر سوٹ کیس کھولا۔ ایک نئی بنارسی ساری نکال کر ایک پرچے پر لکھا ——— "تمھاری شادی کے لیے میرا پیشگی تحفہ ——— !" اور ساری اور پرچہ کارمن کے تکیے کے نیچے رکھ دیا۔

"ٹیکسی آگئی ——— " کارمن نے برآمدے میں سے آواز دی۔

ہم دونوں سامان اٹھا کر باہر آئے۔ میں ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ اتنے میں کارمن پھاٹک کی کھڑکی میں سے سر نکال کر چلائی ——— "ارے تم نے اپنا پتا تو دیا ہی نہیں" —— میں نے کاغذ کے ٹکڑے پر اپنا پتا گھسیٹ کر اسے تھما دیا۔ پھر مجھے بھی ایک بے حد ضروری بات یاد آئی ——— "حد ہو گئی کارمن! تمھاری وائی ڈبلیو نے مجھے اپنا بل نہیں دیا۔"

"بکو مت ——— !"

"ارے یہ تمھارا نجی گھر تو نہیں تھا۔"

"تم میری مہمان تھیں۔"

"بکو مت ——— !"

"تم خود مت بکو۔ اب بھاگو ورنہ ہوائی جہاز چھوٹ جائے گا۔ اور دیکھو، جب میں شادی کا کارڈ بھیجوں تو تم کو آنا پڑے گا۔ میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گی۔ ذرا سوچو، نِک تم سے مل کر کتنا خوش ہوگا۔"

مگر ہم دونوں کو معلوم تھا کہ میرا دوبارہ اتنی دُور آنا بہت مشکل ہے۔

"خدا حافظ کارمن!" ——— میں نے کہا۔

"خدا حافظ ——— !" وہ کھڑکی میں سے سر نکال کر بہت دیر تک ہاتھ ہلاتی رہی۔ ٹیکسی صبح کاذب کے دھندلکے میں ایر پورٹ روانہ ہو گئی۔

ہوائی جہاز تیار کھڑا تھا۔ میں کسٹم کاؤنٹر پر سے لوٹی تو پیچھے سے ڈون کاریا کی آواز آئی ——— "نِک! میں ذرا سگار خرید لوں!"

"بہت اچھا ڈیڈی ———" یہ ہوزے کی آواز تھی۔

میں چونک کر پیچھے مڑی۔ ہوزے مسکراتا ہوا میری طرف بڑھا ——— "دیکھا ہم لوگ کیسے ٹھیک وقت پر پہنچے!"

"ہوزے ——— !" میں نے ڈوبتے ہوئے دل سے پوچھا ——— "تمہارا دوسرا نام کیا ہے؟"

"نِک ——— ! ڈیڈی جب بہت لاڈ میں آتے ہیں تو مجھے نِک پکارتے ہیں۔ ورنہ عام طور پر میں ہوزے ہی کہلاتا ہوں۔ کیوں ——— ؟"

"کچھ نہیں" ——— میں اس کے ساتھ ساتھ لاؤنج کی طرف چلنے لگی ———

"تم امریکہ کیا کرنے گئے تھے؟" میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"ہارٹ سرجری میں اسپیشلائز کرنے ——— تمھیں بتایا تھا۔ کیوں ——— ؟"

"تم ——— کبھی تم نے ——— تم نے ———"

"کیوں ——— ؟ کیا ہوا ——— ؟ کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں ——— !" میری آواز ڈوب گئی۔ لاؤڈ اسپیکر نے یکسانیت سے دُہرانا شروع کیا ——— "پین امریکن کے مسافر ——— پین امریکن کے مسافر ——— !"

" ارے ——— ! روانگی کا وقت اتنی جلدی آگیا ؟ " نِک نے تعجب سے گھڑی دیکھی ۔ ڈون گارسیا سگار خرید کر شفقت سے مسکراتے میری طرف آئے ' میں نے دونوں باپ بیٹوں کا شکریہ ادا کیا ۔ انھیں خدا حافظ کہا اور تیزی سے مسافروں کی قطار میں جا ملی ۔

دوڑتے ہوئے طیارے کی کھڑکی میں سے میں نے دیکھا ۔ ڈون گارسیا اور نِک نیچے ریلنگ پر جھکے رومال ہلا رہے تھے ۔ طیارے نے زمین سے بلند ہونا شروع کر دیا ———

یہاں سے بہت دُور ' خطرناک طوفانوں سے گھرے ہوئے پوربی سمندر میں ہرے بھرے جزیروں کا ایک جھنڈ ہے جو فلپائن کہلاتا ہے ۔ اس کے جاگتے جگمگاتے دارالسلطنت منیلا کے ایک بے رنگ سے محلّے کی ایک شکستہ عمارت کے اندر ایک بے حد چپٹی ناک اور فرشتے کے سے معصوم دل والی فلپنو لڑکی رہتی ہے جو اپنے بچّے کے لیے کھلونے جمع کر رہی ہے اور اپنے خدا کی واپسی کی منتظر ہے جس کی ذات پر اُسے کامل یقین ہے ۔

ایک مکالمہ

الف: گرمیوں کا مہینا جارہا ہے۔ ہم ایک قدم اور قبر کی طرف بڑھا چکے ہیں۔ دوپہر کو بگولے اڑتے ہیں۔ غریبوں کے محلّوں میں لوگ دھڑا دھڑ مر رہے ہیں۔

ب: سنا ہے بڑی سخت وبا پھیلی ہے۔

الف: ہاں۔ وبا پھیلی ہے اور لوگ مرتے ہیں۔ اگر نہ مریں تو دنیا کی آبادی اور بڑھ جاتے اور مزید گڑبڑ پھیلے۔

ب: پہلے ہی کیا کم گڑبڑ ہے؟

الف: خدا سے امید ہے پچاس لاکھ تو مر ہی جائیں گے۔

ب: اتنے بہت سے؟

الف: تب بھی کمی نہیں آئے گی، دنیا بھری پڑی ہے۔

ب: خصوصاً ایشیا۔

الف: زیادہ تر ان لوگوں کو مرنا چاہیے جو بالکل بے کار ہیں - تم نے ان کے مکان دیکھے ہیں؟

ب: نہیں!

الف: ناقابل یقین - یہ لوگ گندگی میں زندہ رہتے ہیں - مکھیوں اور بھنگوں کی طرح، اور مکھیوں کی طرح مرتے ہیں - ان کو شرم بالکل نہیں -

ب: انھوں نے خدا کی حسین دنیا کو تباہ کر دیا ——— اس قدر غلاظت!

الف: ہاں - میں نے ایک روز ان کے لیڈر سے کہا کہ شفق کی سرخی اور پھولوں کے حسن کو دیکھ کر ایمان تازہ کرے مگر وہ اسی طرح ٹرّاتا رہا -

ب: کوئی اچھی خبر سناؤ -

الف: اچھی خبریں بہت کم ہیں - تم کل کہتے تھے زلزلہ آنے والا ہے -

ب: جو بات کی - منحوس ——— میں تے استعارہ استعمال کیا تھا -

الف: "اولڈ آرڈر" ——— ابھی سالم اور محفوظ ہے؟

ب: جب تک عبدل موجود ہے اولڈ آرڈر محفوظ رہے گا -

الف: عبدل کا تمھیں ممنون ہونا چاہیے - میں اسے دیکھتا ہوں تو میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں -

ب: تم آج کل گرمیاں کہاں گزارتے ہو؟

الف: بڑا پرابلم ہے - پچھلے سال ویزا لے کر مسوری گیا تھا مگر وہاں جاکر اور بور ہوا - دنیا بدل چکی ہے -

ب: ٹھیک کہتے ہو -

الف: دنیا بدل گئی ہے اور ہم بھی - مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ دنیا کس طرح بدلی؟ کیا ہم اس کی کایا پلٹ کو نہیں روک سکتے ——— ؟ تم میرا مطلب

سمجھتے ہو ——— ؟

ب: ہاں! مگر تم بہت خوف زدہ ہو۔ اتنا گھبرانے کی بات نہیں۔ اب بھی کچھ نہیں کھویا بلکہ کچھ بھی نہیں کھویا۔

الف: لڑکیاں تک بدل گئی ہیں۔ میرا مطلب سمجھتے ہو؟

ب: ہاں! لیکن ہمیں ان کا ممنون ہونا چاہیے۔

الف: میں بیگمات کا ممنون ہوں۔

ب: آہ بیگمات ———! بڑی دلآویز ہستیاں ہیں۔

الف: ان کے دم قدم سے یہ آرڈر قائم ہے۔ عبدل اور بیگمات اور ———

ب: اور ینگ جمی ———

الف: اور ینگ جمی ——— (رُک کر) وہ کون ہے؟

ب: ینگ جمی میرا چھوٹا بھائی ہے۔ تم کو اس سے ضرور ملنا چاہیے۔ اولڈ آرڈر کا نیا ورژن اس کے دم قدم سے قائم ہے۔

الف: ینگ جمی کیا کرتا ہے؟

ب: سول سروس۔ اوکسفرڈ (انڈر کولمبو پلان) ایک سال امریکہ (فل برائٹ) اسپورٹس ——— ٹینس ——— مشغلے ——— سمفنی کے ایل۔پی ریکارڈ جمع کرنا۔ سابق سندھ کا بڑا ہوشیار سویلین سمجھا جاتا ہے۔

الف: آہ ——— میرے مرحوم چچا بھی بالکل ایسے ہی تھے۔ اوکسفرڈ۔ اسپورٹس میں ہاکی اور ٹینس۔ سمفنی کے ایل۔پی ریکارڈوں کے بجائے ان کو چیتے کے شکار کا شوق تھا۔ سی۔پی کے بڑے ذہین سویلین سمجھے جاتے تھے۔

ب: ینگ جمی نے ان کا تذکرہ اکثر اپنے سینیر افسروں سے سنا ہے۔ ان کو وہ اپنا آئیڈیل سمجھتا ہے۔ خصوصاً وہ واقعہ جب انھوں نے ———

الف: جب انھوں نے بارہ سنگھا پور میں کانگریسیوں کے جنگلی ہجوم پر گولیاں چلوائی تھیں ـــــ

ب: ہاں اور وہ واقعہ بھی جب انھوں نے سن بیالیس میں آدھے ضلع کو جیل بھیج دیا تھا۔

الف: آہ! وہ زمانے خواب و خیال ہو گئے جب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ شیر دل ہوتے تھے۔

ب: اب بھی وہ زمانے موجود ہیں۔ ہجوم کی ذہنیت کہاں بدلی۔ ہجوم ابدی ہے۔

الف: ہاں! ہجوم ابدی ہے!

ب: جس طرح جنگل اور شیر، چیتے اور شکاری ابدی ہیں۔

الف: میں ینگ جمی سے ضرور ملوں گا۔

ب: اور کوئی گپ شپ؟

الف: کیا سناؤں، سارے موضوع ختم ہو گئے۔ میرا دل اُچاٹ ہو چکا ہے۔

ب: کیا تمھارے لاشعور میں کوئی پیچیدگی ہے ـــــ؟ کیا تم کو اندھیرے اور گہرائی اور وسعت، اور سناٹے سے ڈر لگتا ہے یا مجمع اور تنگ جگہوں اور نیچی چھتوں اور اجنبیوں اور عورتوں اور بچوں سے تمھارا دم گھبراتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو ـــــ

الف: مجھے ہجوم سے نفرت ہے ـــــ باہر دیکھو، وقت کھسکتا جا رہا ہے۔ وقت کے لیے ساری تشبیہیں بے کار ہیں۔ وہ لنگڑا، یا اندھا، یا بے حس نہیں۔ وہ بہت مکار اور دغا باز اور چار سو بیس ہے۔ میں بوڑھا ہوتا جا رہا ہوں۔ دیکھو ایک سال اور گزر گیا۔ یہ جون کا مہینا ہے۔

ب: یہ جون کا مہینا ہے۔ یہ گیت کا موضوع ہو سکتا ہے۔ تم اس کا مرثیہ

بناتے ہو۔ تمھاری پریشانی کی کوئی ایک وجہ ہے ——— ؟

الف : مجھے لوگ "ٹائپ" سمجھتے ہیں۔ اخبار والے، مصنّف اور ڈرامانگار اور واعظ اور نقّاد ——— تم سمجھتے ہو، میں ٹائپ ہوں ؟ کمزور، بزدل، ڈرپوک، ہوشیار، چالاک، سمجھ دار، کامیاب انسان۔ جس نے نوجوانی میں خواب دیکھے اور دھکّے کھانے کے بعد صراطِ مستقیم پکڑی اور جسے اب بھی چین نہیں۔ کیونکہ اب اس کا ہاضمہ خراب ہے اور مستقل اکتاتا ہے اور عمر نکلتی جا رہی ہے۔ میں کیسا واہیات "ٹائپ" ہوں۔

ب : تمھارے بغیر دنیا کی گزر نہیں۔ تم دنیا کی مشین کو چلاتے ہو۔

الف : میں ——— ؟ میں ——— ؟

ب : ہاں ——— !

الف : لوگ جنھوں نے مجھے ٹائپ بنایا ہے کہتے ہیں کہ میں بے حس ہوں اور انسانیت کا مذاق اُڑاتا ہوں۔ اور جنگ میں میرا فائدہ ہے اور ———

ب : لوگ ٹھیک کہتے ہیں۔

الف : کارخانوں سے لوگ خالی ناشتے دانوں کی میلی پوٹلیاں باندھے چیونٹوں کی طرح لوٹ رہے ہیں۔ کلرکوں کی قطاریں سر جھکائے بجلی بارکوں کے سامنے بسوں کے انتظار میں کھڑی ہیں۔ دو گھنٹے سے یہ سب اسی طرح کھڑے ہیں یہ گھر کیوں نہیں جاتے ——— ؟ چائے خانوں میں دھواں بھرا ہے۔ فٹ پاتھ پر سونے والے جمع ہو رہے ہیں، شام ہو گئی۔

ب : اس وقت بھی لوگ مر رہے ہوں گے۔

الف : یقیناً۔ ہر لحظہ، ہر سیکنڈ لوگ مرتے ہیں۔

ب : اور خود سے نہیں۔

الف: مولانا عبدالمتین ندوی نے کہا ہے کہ سب مشیّتِ ایزدی ہے۔
ب: کہ چند انسان دوسرے انسانوں کو ماریں یا ان کی موت کا حیلہ بنیں؟
الف: سب اُس نیلی چھتری والے کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس کے حکم بنا پتّا نہیں ہل سکتا۔
ب: اور سُناؤ۔ کیا حال چال ہیں؟
الف: مجھے کچھ شکوک نے گھیرا ہے۔
ب: مکڑی بیٹھی جالا بُن رہی ہے۔ مکڑی بیٹھی جالا بُن رہی ہے۔
الف: اس مکڑی سے بچوں؟
ب: ہاں۔ حالات اتنے خراب نہیں۔ ابھی تمھارے لیے بہت کچھ باقی ہے۔
الف: شاید۔ مگر میں بہت ناخوش ہوں۔ میرے آغاز میں میرا انجام ہے وغیرہ...
ب: بکو مت۔
الف: باغ میں دوسری آوازیں گونج رہی ہیں۔ کیا ہم ان کا تعاقب کریں؟
جلدی کرو ——— جلدی ——— چڑیا نے کہا۔
ب: بکواس مت کرو!
الف: آگے بڑھو مسافرو۔ تم جو سوچتے ہو کہ سفر میں ہو۔ تم وہ نہیں جس نے بندرگاہ کو نظروں سے اوجھل ہوتے دیکھا۔ نہ تم وہ ہو جو دوسرے کنارے پر اترو گے۔ یہاں اور دوسرے کنارے کے درمیان وقت معطّل ہو چکا ہے!
ب: چُپ رہو، اور باہر دیکھو۔ رات ہو رہی ہے۔
الف: لوگ گھروں کو جا رہے ہیں۔ سر جھکائے حسبِ معمول، یہ سر اٹھا کر کیوں نہیں چلتے؟ تمھارا مطلب ہے ان کی قسمت میں کوئی خوشی نہیں؟ یہ یونہی

بچے جائیں گے؟

ب: اور مرے جائیں گے۔

الف: تم نے پھر موت کا خیال دلا دیا۔ میں خود ہر گھڑی موت کو یاد کرتا ہوں میرا دماغ چکرا تا ہے۔ میں اپنی رسّی کے آخری سرے پر ہوں۔ میرے آغاز میں ——

ب: مجھے تمھاری طرف سے فکر ہے۔

الف: مجھے ذرا ذرا سی بات پر غصّہ آتا ہے۔ اور غصّے کے لیے کیا کم باتیں ہیں۔ میرا خون کھولتا رہتا ہے۔ میں مجموعی طور پر زندگی سے بیزار ہوں!

ب: تم کیوں نہیں مانتے کہ جو ہونا ہے وہی ہو گا۔

الف: یہ بے وقوفی کی بات ہے۔ جو ہونا ہے ظاہر ہے وہی ہو گا، اور کوئی بات ہونے والی ہو گی تو ظاہر ہے وہ کوئی اور بات ہو گی۔ وہ نہ ہو گی جو ہونی ہے ——!

ب: بے کار میں میٹا فزیکل نہ بنو!

الف: تم سمجھتے ہو، دنیا کے مسائل اور پریشانی کی بنیادی وجہ نفسیاتی نہیں اقتصادی ہے؟

ب: پریس کی مشینیں گھڑگھڑ چل رہی ہیں۔ خبریں بھیانک ہیں، اس لنگڑے اخبار فروش کو دیکھو جو دیوانوں کی طرح چلا رہا ہے۔

الف: یہ سمبلز کی دنیا ہے۔ مجھے ہر شے میں کوئی نہ کوئی سمبل نظر آتا ہے۔ میں ہمہ وقت سطروں کے درمیان پڑھتا ہوں۔

ب: تم نے جو کچھ پڑھا ہے بھول جاؤ۔ ہمارے ماہرین تعلیم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ تعلیم بے کار ہے۔

الف: وہ ٹھیک کہتے ہیں ۔ ہمیں کتابوں کے بجائے بندوقوں کی زیادہ ضرورت ہے ۔ قوم کے نونہالوں کو کتابوں کی جگہ بندوقیں دو ——— تاکہ وہ مجاہد بنیں ——— مردِ مومن، شاہین ۔

ب: تعلیم ——— یہ سب غریبوں کی افیم ہے ۔ غریبوں کو افیم مت دو ! اسے کھا کر ان کا دماغ چکرا جاتا ہے ! ان کی عقل چرخ ہو جاتی ہے !!

الف: مگر یہ اتنا چلّاتے ہیں ۔

ب: چلّانے دو ۔ تم نے ان کُتّوں کو دیکھا ہے جو سرد راتوں میں چاند کے نیچے بیٹھ کر آسمان کی سمت منہ اٹھائے اٹھائے روتے ہیں ؟

الف: چاند کی تمنا میں ؟

ب: نہیں ۔ ان کو محض سردی لگتی ہے !

الف: میرے دادا نواب بہادر چھپسٹ گڑھ کے پاس درجنوں ایک سے ایک اعلا شکاری کُتّے تھے ۔ آہ جب مجھے اپنے محل کا خیال آتا ہے جو میں وہاں چھوڑ آیا ———

ب: بکو کومت ۔ اس من گھڑت محل سے چوگنے بڑے محلات تم یہاں بنوا چکے ہو ۔ مگر مچھ کے آنسو مت بہاؤ ——— !

الف: کیا تم مجھے تھوڑی سی جذباتی عیاشی نہ کرنے دو گے ؟

ب: تم کو کسی بات کا غم نہ ہونا چاہیے ۔ تم نے ایک ایسی دنیا بنائی ہے جس میں بچّے بھیک مانگتے ہیں اور نوجوان عورتوں کی عزت محفوظ نہیں، اور نوجوان لڑکے ٹی ۔ بی میں مبتلا ہیں ——— اور ———

الف: یہ دنیا ہمیشہ سے تھی ۔ میں نے اس میں محض چند کلی پھندنے لگا دیے ہیں ایسی الٹرا ماڈرن طرزِ تعمیر کی کوٹھیاں، ایسے کلب، ایسے جشن پہلے تم نے کبھی

خواب میں بھی دیکھے تھے —— ؟ اور طویل موٹروں کا یہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر —— !

ب : بیس سال پہلے ایک اسپین تھا۔ آج چاروں طرف اسپین ہیں۔

الف: میرا ایک عزیز دوست بھی اس زمانے میں کیمبرج میں پڑھتا تھا۔ لڑنے گیا تھا۔ لیکن اب تو اسے غائب ہوتے بھی زمانہ گزر گیا۔

ب : اب ہنسی اور آنسو دونوں بے کار ہیں۔ ہر چیز کا سمے بیت چکا ہے۔

الف: سنا ہے کلچر میں بڑی طاقت ہے۔ وہ ہمیں بچالے گی۔ آج کل اس کا بڑا چرچا ہے۔ اس میں کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔

ب : یورپ میں گوتھک اور بروک کیتھڈرل بمباری کا نشانہ بن گئے۔

الف: اصول کیا شے ہے۔ اصول کون طے کرے گا؟

ب : یہ سوال کسی دیدہ انیتنٹ سے کرو کہ کون کس کا فیصلہ کرے گا۔ مگر الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو چلا ہے!

الف: میں فیصلوں سے ڈرتا ہوں۔

ب : تم اپنے سے کمزوروں کی قسمت کا فیصلہ کرتے ہو۔

الف: اور مجھ سے زیادہ طاقت ور میری قسمت کا فیصلہ کرتے ہیں۔

ب : ایک وقت تھا کہ زندگی آسان تھی۔ گو ایک حد تک پراونشل تھی۔

الف: ہاں، زندگی میں الجھنیں نہ تھیں اور سیاسی حد بندیاں، مجھے وہ زمانہ یاد ہے، جب ۲ ستمبر ۱۹۳۹ء تک —— ہانگ کانگ سے ٹرین میں بیٹھو تو وہی ٹرین سیدھی لندن پہنچا دیتی تھی۔ زندگی آسان تھی۔

ب : ہاں! —— تب ہر شے اپنی اصلیت سے سو گنا بڑھی نہ ہوئی تھی —— لوگ جن کا ذہن سیکڑوں سے آگے نہ پہنچ سکتا تھا، اب لاکھوں اور کروڑوں

کے وارے نیارے کرتے ہیں۔ اب ہر تے انلار جلڈ ہے اور آؤٹ آف فوکس، شہر جل رہے ہیں۔ کھیتوں میں آگ لگی ہے۔ مگر کسی کو نہ شعلے نظر آتے ہیں، نہ دھواں۔

الف: اب کیا ہو گا؟

ب: پانسے تیار ہیں اور پھینکے جانے والے ہیں۔

الف: بارود کے دھویں سے میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔ مجھے ہر شے میں بارود کی مہک آ رہی ہے!

ب: ہیومینسٹ، کویکر، ویدانیتسٹ، تھیوسوفسٹ، برطانوی لبرل، لفٹ ونگ انٹلکچوئیل، امن پرست، روشن خیال مولانا جو رُوس میں اسلام پر مضمون لکھتے ہیں، اسکول ٹیچر، نفسیات کے ڈاکٹر، یونی ورسٹی کے پروفیسر جو کم تنخواہیں لے کر علم اوڑھنے بچھانے اسی طمانیت میں زندگیاں ختم کر دیتے ہیں کہ وہ غالباً نوبل پروفیشن میں تھے، اور وہ جن کو (چونکہ انھوں نے ہائیڈروجن بم کے خلاف احتجاج کیا) سنکی اور ہمسفر اور دشمن کے ایجنٹ اور مفسد سمجھا گیا اور بوڑھے یہودی سائنس دان، اور وہ بوڑھا مسلمان عالم جو قوم پرست ہے اور اعظم گڑھ میں، یا بہرائچ میں، یا گورکھپور میں چپ چاپ بیٹھا ہے، اور عورتیں جن کے لڑکے ——

کوریا میں
ڈین بین پھو میں
کینیا میں
ملایا میں
انڈونیشیا میں

اسرائیل اور اردن اور لبنان اور شام اور مصر اور ہندوستان
اور پاکستان کی سرحدوں پر
الجزائر میں
مراکش میں
سُرما ندی کے کنارے

مارے گئے اور مارے جارہے ہیں۔ ہر لحظہ، ہر منٹ، صبح، شام، اور ان سب نے نعرے لگاتے تھے کہ انھیں امن چاہیے۔ کیونکہ جب یورپ کی جنگ ختم ہوئی، جس میں آج مرنے والے لڑکوں کے باپ موت کے گھاٹ اترے تھے، اس وقت ان کی ماؤں سے کہا گیا تھا کہ تم نے دنیا کو محفوظ بنانے کے لیے یہ قربانی دی ہے۔ تاکہ تمھارے بچّے امن کی دنیا میں زندہ سلامت رہیں۔

الف: تم مجھ کو یہ سب کیوں سُنا رہے ہو؟

ب: اور یہ بچّے بڑے نہ ہونے پائے تھے کہ کِٹ بیگ کاندھوں پر لاد، مارچ کرتے نئی خندقوں کی طرف چل پڑے اور گو اس وقت آفیشل طور پر دنیا میں کوئی جنگ جاری نہیں ہے اور خوب صورت تھائی، اور جاپانی اور فرنچ اور پاکستانی اور ہندوستانی گائیڈ لڑکیاں نیویارک میں یو، این کی عمارت کی سیّاحوں کو سیر کرا رہی ہیں۔

الف: سڑکیں جگمگا اٹھیں۔ کاریں، بدوضع ہیبت ناک بسیں، موٹر رکشائیں، گرمی حبس، نئے دولت مندوں کی طمانیت، فیشن ایبل شاپنگ سنٹر، کے سیکنڈ ریٹ ماحول میں دم گھٹا جا رہا ہے۔ سینماؤں پر میری لین منرو کے قد آدم مجسّمے سب سے بلند تر ہیں۔ سیاہ فام مکرانی اور گووانی لڑکے جینز پہنے روک اینڈ رول

کی دُھنیں گنگنا رہے ہیں۔ بیگمات نے خوب صورت سوتی ساریاں پہننا شروع کر دی ہیں جو وہ "انڈیا" سے خرید کر لاتی ہیں۔ بالوں کے 'پونی ٹیل' بنائے شلواروں پر نیچی نیچی قمیصیں پہنے لڑکیاں سبزے پر بیٹھی کیا سوچتی ہیں (اگر وہ کچھ سوچتی ہیں) میں ان کے خیالات کے لیے ایک پینی PENNY دوں گا ——— !

ب : لاتعلق رہو۔ تجریدیہ اصل شئے ہے۔ تمھیں بیان میں جذباتی نہ ہونا چاہیے۔

الف : دنیا کی گاڑی اب چلائی نہیں جاتی۔ دنیا چاروں طرف سے ٹوٹ ٹوٹ کر میرے اِردگرد گر رہی ہے۔

ب : ہر وہ چیز جسے ہم بچپن سے غلط سمجھتے آئے تھے، صحیح ثابت کر دی گئی ہے صحیح غلط ہے اور غلط صحیح ——— جیو ہتیا مہا پاپ نہیں ہے۔ اسی کے ذریعے ملکوں کے نقشے بدلے جاتے ہیں۔ سرحدوں کی لکیریں بہت اہم ہیں۔ آدمی کی ان لکیروں کے سامنے کوئی حیثیت نہیں، اور مارو ——— مزید آدمیوں کو مارو ——— مارو ——— !

الف : کیا ہوا۔ کہیں بلوہ ہو گیا ——— غنڈہ گردی ——— پولیس کو فون کرو ——— یا ممکن ہے ڈاکو گھس آئے ہوں۔ یہ شہر مشرق کا سب سے 'کرپٹ'، دارالسلطنت ہے۔ اسے مشرق کا شکاگو ہونے کا فخر حاصل ہونے والا ہے۔ غیر ملکی جرنلسٹوں کو بلاؤ، تاکہ میں ایک بیان دوں!

ب : جان، جیرلڈ ایمبل اسٹین فرڈ کا کھلاڑی، فلاڈلفیا میں ایریا ٹریننگ لے کر پہنچا اب اس کو سب معلوم تھا۔ افغانوں کے رسم و رواج۔ ریاست چترال کا بجٹ، چاٹگام کی ٹریڈ یونینوں کا احوال۔ سندھ کے ہاریوں کی کہانی اور پیلس پالیٹکس کی ساری تفصیلات اسے ازبر تھیں۔ بالفاظِ دیگر وہ بڑا جدید قسم کا مڈل ایسٹ

ایکسپرٹ تھا۔ اس نے میرا امتحان لینا چاہا۔ اس نے سوال کیا ——
ہنگری کے متعلق تمھاری کیا رائے ہے ؟ الجزائر کے متعلق تمھاری کیا رائے
ہے —— ؟ میں نے جواباً پوچھا۔
ڈاکٹر عقاب آفاقی آٹھویں صدی کی فقہ پر ریسرچ کر کے اوکسفرڈ سے لوٹا
—— تم کھوکھلے انسان ہو —— تم سب جو اکٹھے ہو کر روتے ہو
—— کیا تم کو نہیں معلوم کہ اسلام میں سارے دکھوں کا علاج موجود
ہے —— ؟

لہذا میں نے جماعت اسلامی کا ایک مصوّر رسالہ پڑھنا شروع کیا۔ مگر غور سے پڑھا تو معلوم ہوا کہ اسے کامریڈ صفت حسن ایڈٹ کرتے ہیں تاکہ انقلاب اسلام کے راستے داخل ہو۔ مجبوری سب کچھ کرا دیتی ہے!

الف: مجھ میں اتنی ہمت کیسے ہوئی کہ میں دنیا کے معاملات میں کروڑوں انسانوں کی زندگیاں سنوارنے بگاڑنے میں اخلاقی اور سماجی اور مذہبی تصورات گھڑنے میں دخل دوں۔ انتہائی آفاقی اہمیت کے مسائل میں اپنی ٹانگ اڑاؤں۔ میں نے یہ سب کس طرح کیا۔ میں صرف ذاتی نفع چاہتا تھا۔ اور نام و نمود۔ کیونکہ انسان اگر اقتدار حاصل کرنے سے خائف ہے تو اسے چاہیے کہ سر گھٹا کر سادھو بن جائے۔ اقتدار، استحکام، طاقت، ضابطہ، نظام، ضمیر، اصول —— یہ الفاظ میرے سامنے سے ہٹاؤ ——
مجھے صرف بادل چاہییں اور پتّوں کی سرسراہٹ!

ب: مگر پانسا پھینکا جا چکا۔ اقتدار تمھارے حصے میں آیا ہے۔ تم طاقت ور ہو، اور تمھاری طاقت دوسروں کے لیے، ہر انسان کے لیے نقصان دہ ہے سوا تمھارے —— اس وقت جو تم یہاں بیٹھے ہو اور سامنے سبزے

پر لڑکیاں ہنس رہی ہیں اور بچے کھیل رہے ہیں اور موسیقی بج رہی ہے۔
عین اسی منٹ تمھاری وجہ سے صحراؤں میں اور جنگلوں میں اور بستیوں
میں بارود کے گولے پھٹ رہے ہیں اور انسانی جسموں کے پرخچے اُڑ رہے
ہیں ——— !

الف: یہ منظر کشی کرکے مجھے دھمکانے کی کوشش مت کرو۔

ب: میرے سامنے ایک پولیس افسر آتا ہے جو پچھلے اتوار کو موں مارتر کے
کیفے میں بیٹھا سارتر پڑھ رہا تھا اور آزادی کا حامی تھا۔

الف: اب میں بھی دیکھ رہا ہوں ——— وہ حکم دیتا ہے کہ اپنے کپڑے
اُتار دو ———

ب: اور وہ اپنے کپڑے اُتار دیتی ہے[1]

ابھی بیگمات دوسرا رقص کریں گی۔ سازندوں سے کہو۔ ارتھا کٹ کا کوئی
نغمہ بجائیں۔ یا سیمبا ——— بیگم صاحبہ کے لیے ایک شیری۔

الف: عبدل تم آگئے ——— مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا۔ مجھے بُرے بُرے
خواب دکھلائی دیتے ہیں۔ ہول آتا ہے ——— عبدل مجھے لگتا ہے تم
مجھ سے چھٹنے والے ہو ——— عبدل میرے لیے ایک کافی ———
بیگم صاحبہ کے لیے ڈرائی مارٹینی ——— عبدل کیا یہ بھی روایت
ہے کہ تمھارے دم سے اولڈ آرڈر قائم ہے؟ جیسے یہ روایت ہے کہ کسان
آزاد اور خوش باش ہیں۔ طالب علم مفلس اور ذہین ——— لڑکیاں

---

[1] الجزائر میں ہر فرانسیسی فوجی یا پولیس افسر ہر الجیرین عورت کو حکم دے سکتا تھا کہ
وہ اپنے سارے کپڑے اتار کر ثابت کرے کہ اس نے اسلحہ یا بم نہیں چھپائے ہیں۔

باعصمت اور وفادار - میں تمھارے چہرے پر جُھرّیاں دیکھ رہا ہوں۔ تمھاری داڑھی بالکل سفید ہوگئی ہے - کیا تم کو بخشش کم ملتی ہے حالانکہ تمھارے نئے امریکن صاحب لوگ تمھارے پرانے انگریز صاحب لوگوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ دریا دل ہیں ——— کیا یہ بھی ایک روایت ہے ———؟

ب : سایے کی طرح چلتا ہوا عبدل بیگم صاحبہ کے لیے ڈرائی مارٹینی لینے چلا گیا۔ پینٹری میں جاکر وہ اپنے آبدار سے کہے گا کہ بڑے صاحب آج معمول سے زیادہ اُداس ہیں!

الف : ——— جب میں باتیں کرتا ہوں مجھے لگتا ہے، میں کسی مردہ زبان میں بول رہا ہوں - لوگ مجھے سمجھ نہیں سکتے۔ سنسکرت، یا پہلوی، یا لاطینی الفاظ کے معنی بدل گئے ہیں۔

ب : والٹس بیگم صاحبہ کا پسندیدہ رقص ہے - آج کل لوگ سوا اور تھری ہنڈرڈ میں کون سا ناچ ناچ رہے ہیں؟

الف : بہت سے لوگ ہیں (اور تمھیں پتا ہے کہ کون) جن کو نہ میری طرح ڈراونے خواب آتے ہیں نہ جن کا دل ہولتا ہے - حالانکہ وہ بھی وہی سب کر رہے ہیں جو میں کرتا ہوں - تمھارا خیال ہے یہ محض اوور ورک کا نتیجہ ہے؟

ب : بیگم صاحبہ کو ایک اور ڈرائی مارٹینی دو۔

الف : غدّار اور جاسوس اور مجرم اور قاتل اور جیلر اور پھانسی کی رسّی اور کوٹھری کی سلاخیں اور بے عزتی کی زندگی، اور بے عزتی کی موت اور جگ ہنسائی اور رسوائی اور اس طرح کے تصوّرات کا گویا ایک بیلے ہے

جو رات کو دیوار پر میرے سامنے ہوتا ہے۔ اتنے قتل ہوئے ——
—— اتنوں پر مقدمہ چلا۔ کس نے کس کو گھوس دی۔ کس نے کون سا جال پھیلایا۔ جج رشوت کھا گیا۔ وکیل قتل کر دیا گیا۔ غلط آدمی کو جیل ہو گئی۔ مجرم ولایت سے نئی کار خرید لایا۔ علیٰ ہذا القیاس میرے دماغ میں ہر وقت سنسنی خیز اخبار چھپتے رہتے ہیں۔ میرے ذہن کی ٹیلیکس پر عجیب عجیب خبریں آتی ہیں۔ مجھے لگتا ہے حفاظت کہیں نہیں ہے۔ میں ہمہ وقت خطرے میں ہوں۔ مکانات، روپیا، شہرت، عزت، تجربے سب لایعنی ہیں۔ خصوصاً ذاتی جایداد یعنی پرائیویٹ پراپرٹی بالکل پانی کا بلبلا سمجھو اسے۔ نہ جانے کس وقت میں مر جاؤں اور یہ سب دھرا رہ جائے کس وقت، میں زندہ ہی ہوں مگر میرے ہاتھوں سے یہ سب نکل جائے۔ بڑا دل دہلتا ہے۔ حفاظت نہیں ہے۔

ب: آبادیوں کی آبادیاں، ملک کے ملک کنسنٹریشن کیمپوں میں تبدیل کر دیے گئے۔ پہلے ایک بیلسن تھا اب ہر طرف بیلسن ہیں۔

الف: میں تو صرف اتنا چاہتا تھا کہ جب میں جانے لگوں تو طمانیت کے ساتھ اتنا کہہ سکوں کہ شکریہ دنیا والو، میں ایک اچھی دعوت میں آیا تھا۔ شکریہ ——!

ب: ان لوگوں سے کہو جو سال کے سال، سالِ نو کی مبارک باد کے کارڈ تیار کرتے ہیں کہ ایک بڑا الاؤ بناؤ اور ساری تہنیتیں، ریاکاری کی ساری "بہترین خواہشوں" سمیت اس الاؤ میں جھونک دو۔

الف: اس کھڑکی میں سے جھانکتا میں اپنے آپ کو دیکھ رہا ہوں، آج کی رات میں یہ ہوں۔

ب : بہت سے لوگ تاریخ کی باتیں کرتے ہیں اور فلسفے کی اور اخلاقیات اور مذہب کی اور میں ان کو حیرت سے دیکھتا ہوں۔

الف : عمر، خالد، طارق، اورنگ زیب، ٹیپو، سراج الدّولہ، سید احمد، جمال الدین، سرسیّد، شہزادہ علی خاں، بادشاہی مسجد، شالیمار باغ، ملتان کے مقبرے، مغل شہنشاہ، مزید مسجدیں، اسلام اسلام اسلام۔

ب : بیگم صاحبہ فرانس سے انٹیریر ڈیکوریشن میں ڈگری لے کر آئی ہیں۔ پھولوں کی آرائش کے فن پر ان کا مطالعہ وسیع ہے۔

الف : اپنی حماقتوں کو اپنی ڈھال اپنا عَلَم اپنا نقارہ بنا کر میں (اور ہم سب، تم جانتے ہو کہ کون) مارچ کر رہا ہوں۔ لفٹ رائٹ یہاں تک کہ مجھے خود یقین ہو چلا ہے کہ میں دنیا کا اہم ترین عقل مند ترین انسان ہوں۔ میں باقی دنیا پر فیصلے صادر کرتا ہوں۔ میری رائے حرف آخر ہے۔ کون ہے جو میرے مُنہ آئے۔ تاریخ کے اہم فیصلے ہمیشہ احمقوں نے کیے ہیں۔

ب : بیگم صاحبہ آپ کو شاعری سے دل چسپی ہے ؟ خوب۔ آئیے میں آپ کو چند اشعار سناؤں۔ پسند نہ آئیں تو تکلفاً تعریف نہ کیجیے گا۔ کیونکہ اشعار میرے نہیں۔ بیگم صاحبہ!

جہاں الفاظ پھنکارتے ہوئے ناگ ہیں یا مکھیاں جو مسجد مندر
اور مردہ گھروں میں بھنبھناتے ہوئے، انسانوں کی غلطی سے دیوانہ

وار

اپنا پیٹ بھرتی ہیں
لیکن پھر بھی ہر لاش ابدی ہے
جہاں برگد کا درخت اپنے بچوں کی قسمت پر رو رہا ہے ——

اور فٹ پاتھوں پر خون اور زخموں کے پھول کھلتے ہیں
چنانچہ بدھ ستوپوں اور مغل مقبروں اور مدراؤں' اور
ساریوں اور مقدس صحیفوں کے منتروں میں چھپے ہوئے
سارے حسن کے باوجود جو روح کی تاریک رات کو
روشن کرتا ہے۔
انجرات کے اس مہلک بھنور میں ہماری مختصر سی رات
کو جگہ نہ مل سکی۔
یہ بھنور جہاں جیتے ہوئے' مسکراتے ہوئے'
مارتے اور مرتے ہوئے'
ان کی زندگی کی تمنا موت کی تمنا سے تقریباً ہم کنار
رہتی ہے۔
اور یہ سارا رنگ و بو ایک مسلسل بے کیفی میں تبدیل ہو
جاتا ہے۔ جہاں نہ عود سلگتا ہے
نہ کنول کھلتے ہیں۔
یہ حقیقت تھی جسے اب ہم نے دیکھا
یہ قیامت تھی۔ اس تاریک غار میں جو کیڑے رینگ رہے
ہیں وہ ہم ہیں۔
ہم ہمیشہ تھے۔
اور ہم نے ہمیشہ آلتی پالتی مار کر صرف ماورا پر دھیان
کیا۔
لیکن اب یہ منظر ہمارے بہت قریب ہے۔ ہمارے سامنے

ہے[1]

الف : تم نے بیگم صاحبہ کی طبیعت مکدر کر دی۔ تم ایسی باتیں کیوں کرتے ہو؟ کیا تمھیں خوفِ خدا نہیں، کیا تم یہ نہیں جانتے کہ تم اپنے حق میں کانٹے بو رہے ہو، اور سب دروازے تم پر بند ہو جائیں گے؟ تم جو اس ڈرامے میں حصہ لینے سے انکار کرتے ہو جو ہم زرتار شامیانوں کے نیچے ایک بہت بڑی بھیڑ دھسان خلقت کی خاطر اسٹیج کر رہے ہیں۔ اتنے سارے اسٹیج ہم نے بنائے ہیں۔ یہ پارلیمنٹ ہے۔ یہ یونیورسٹیاں ہیں۔ یہ کابینہ ہے۔ یہ عدالتیں ہیں، ہم نے اگر یہ ڈراما کامیابی سے نہ کھیلا تو ہماری بھیڑ دھسان خلقت کا دل ٹوٹ جائے گا اور وہ چونی واپس کرنے کا مطالبہ کرے گی۔ ابھی سے وہ اکثر وقتاً فوقتاً ہوٹنگ کرنے لگی ہے — تم اگر ہمارے ساتھ شامل نہ ہو گے تو تم پہ چوکسی سے نگرانی کی جائے گی شاید تم کو معلوم نہیں کہ میں ہی تمھارا جج ہوں، میں ہی گواہ۔ میں تم کو کسی لمحے بھی مجرم ثابت کر سکتا ہوں۔ اب دودھ کا دودھ، پانی کا پانی الگ ہو چکا ہے۔ میرے ہاتھ میں ترازو ہے۔ میں ہمہ وقت فیصلے صادر کر رہا ہوں۔ منتظر رہو، نہ جانے کس وقت جلاد آکر تمھارا دروازہ کھٹکھٹائے۔ وقت بہت کم ہے۔ جو کچھ کہنا ہے کہہ لو، تم دنیا کے نام کوئی پیغام کوئی وصیت چھوڑنا چاہتے ہو؟ عنقریب تمھارا ہم سب کا خاتمہ ہے۔

ب : مائی لارڈ۔ آپ کو جج کس نے مقرر کیا ہے اور آخری فیصلہ کس کی عدالت سے ہوگا؟

---

[1] لوئی مک نیس کی ایک نظم کا اقتباس۔

الف: خود میں نے۔ اور آخری عدالت بھی میں ہی ہوں گا۔ خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گِلِ کوزہ ——— میں سب کچھ ہوں اور جن میرے مظاہر بیکراں ہیں ——— میں ایمان دار ہوں۔ تمھارے ایمان میں فتور ہے۔ میں محب وطن ہوں۔ ملک کے لیے کٹ مروں گا۔ خون کا آخری قطرہ سب سے پہلے میں ہی بہاؤں گا۔ تم غدّار ہو۔ میرے آدرش بلند ہیں۔ تم کمینے ہو۔ مجھے حق ہے کہ میں آرام و آسایش سے رہوں۔ کیونکہ میرے کاندھوں پر بڑی عظیم ذمہ داریاں ہیں۔ یہ زمینیں، یہ دریا، یہ وادیاں یہ پہاڑ، یہ کھیت، یہ باغات، یہ شاہراہیں، یہ کارخانے، یہ بازار، یہ کھلیان، یہ کوٹھیاں، یہ بنکوں کی عمارات، یہ سب میری ہیں۔ میں ان کا اصل مالک اور حق دار ہوں۔ مجھے غصہ نہ دلاؤ ورنہ میں تم کو ——— میں تم کو ——— اوہ ——— میں کہتا ہوں تم اپنی اوقات کیوں بھول گئے۔ واپس جاؤ ——— نیچے اترو ——— اور نیچے ——— وہی جگہ تمھاری ہے۔ یہ محلے، یہ کوٹھریوں کی قطاریں، یہ بستیاں، یہ ٹاٹ اور چٹائیوں اور بانسوں اور ٹوٹی کھٹیوں کے انبار ——— کیا یہ سب تمھارے لیے کافی نہیں ———؟ اور تم کیا چاہتے ہو گورنمنٹ ہاؤس میں رہوگے؟ کیا گورنمنٹ ہاؤس تمھارے باپ کا ہے؟ گورنمنٹ ہاؤس میرے باپ کا ہے ———!

ب: میں ایک شخص کو جانتا ہوں جو فوج میں لفٹنٹ کرنل ہے لیکن ولی اللہ ہو گیا ہے ———!

الف: اچھا ———؟

ب: ہاں! ——— اور وہ کہتا ہے کہ تصوف کی، یا جو کچھ بھی وہ ہوتا ہے، اس کی

ساری منازل طے کر چکا ہوں۔ اس کا قول ہے کہ وہ پچھلے پندرہ سال سے رات کو نہیں سویا۔ اور رات بھر جاگتا ہے۔ یعنی عابد شب زندہ دار ہے۔ پورا پرم ہنس سمجھو اسے ——— اور اب اس میں اتنی طاقت ہے کہ اپنی چشم باطن کے ذریعے انسانوں کی جو اصلیت ہے اسے دیکھ لیتا ہے یعنی کسی میس کی بار میں جاتا ہے تو اسے اسٹولوں پر سؤر اور گھوڑے اور خچر اور چوہے بیٹھے نظر آتے ہیں۔ ڈرائنگ روم کے صوفوں پر اسے بکریاں اور بلیاں اور گدھیاں اور ہتھنیاں اور سیار دکھلائی دیتے ہیں۔

الف : اللہ اکبر ——— کیسا قیامت خیز تصور ہے!

ب : جب وہ مجھ سے بات کرتا ہے تو اسے میری ظاہری انسانی شکل کے بجائے میری اصل صورت نظر آتی ہے۔ گو اس نے مجھے آج تک بتایا نہیں کہ یہ کیسی صورت ہے۔

الف : حد ہے۔ ہماری فوج کی یہ حالت ہو گئی ——— ؟

ب : ہاں۔ صوفی اور ولی اللہ تو ہر جگہ پیدا ہوتے آئے ہیں۔

الف : میں اپنے آپ کو گیدڑ سمجھتا ہوں۔

ب : میں تم کو گدھ کہوں گا جو ڈریس سوٹ پہنے ایک لمبی سی شاہ بلوط کی ڈائننگ ٹیبل کے سرے پر بیٹھا اونگھ رہا ہے اور منتظر ہے اور اس کے پنجوں میں ———

الف : تشبیہ کو آگے نہ لے جاؤ۔ ورنہ میرے وحشت ناک خوابوں میں اضافہ ہوگا

ب : سارا ملک پارسیوں کا ایک عظیم الشان، وسیع، لق و دق برج خموشاں ہے نیچے چونے اور تیزاب کا کھڈ ہے اور ہماری لاشیں پٹاپٹ اس میں گر رہی ہیں اور ہم اس کھاد میں تبدیل ہو رہے ہیں جس سے تمہارے لان کی مٹی

کو زرخیز کیا جائے گا۔ تم مجھے اس آتش پرست پروہت کی مانند نظر آتے ہو جو سرتاپا سفید کپڑوں میں ملبوس میری لاش پر دہی لگا رہا ہے۔ میری لاش تو ایسی ہے کہ کتا بھی اسے سونگھ کر چھوڑ دے۔

الف : بڑا زبردست جھکڑ چل رہا ہے۔ زرد اور سُرخ اور سیاہ ریت میری آنکھوں میں جا گھسی ہے۔ میرا دماغ اب کام نہیں کرتا ——— کوئی ہے جو آکر مجھے بچائے۔

ب : ہم ایک ایسی دنیا میں زندہ ہیں جس میں ہر شخص ایک دوسرے پر جاسوسی کر رہا ہے۔ دوست دوست پر، افسر ماتحت پر، بھائی بھائی پر، تم کس کو مدد کے لیے پکارو گے؟

الف: جہاں ہم اور تم وقت میں خیمہ زن ہیں اور بڑی بھاری سیاہ آندھی اٹھی ہے اور بگولے چکّر کاٹ رہے ہیں ——— تمھیں پتا ہے میں نے ایک زمانے میں خواب دیکھے تھے۔ مدّتوں چپکے چپکے دیکھا کیا۔

ب : پتا ہے۔ ہم میں سے زیادہ تر لوگوں نے اپنے خوابوں کو یونہی کھو جانے دیا ہے۔

الف : جنگل کی طرف ایک پہاڑی راستہ جاتا ہے۔ دونوں طرف دیواروں کی گھاٹیاں ہیں جن پر نیلا کہرا منڈلا رہا ہے اور سرخ مکانوں کی چھتیں، اور بارش سے بھیگے ہوئے پتھر پر ایک بڑھیا بیٹھی ہے۔ وہ راہ گیروں کو خاموشی سے دیکھتی ہے۔ ایک اسکول کا لڑکا نیلے موزے پہنے بھاری بستہ پیٹھ پر لادے سیٹی بجاتا، سیب کھاتا چڑھائی پر چڑھ رہا ہے ——— معصوم ——— بھولا بھالا ——— بارہ سالہ لڑکا ——— میں اکثر جاگتے میں وہاں واپس جانا چاہتا ہوں۔

ب : دیواروں کے پیچھے تارا ہال ہے۔ چاروں طرف کوہستانی گلاب مہک رہے

ہیں۔ رات گئے میں انجانی موسیقی سننے کے لیے پچھلے برآمدے کی سیڑھیوں پر کھڑا ہوں۔ جو بٹاویا کے ریڈیو اسٹیشن سے آرہی ہے۔ یہ ۴۷ء ہے۔ میں متحیّر ہوں آسمان پر تارے کھلے ہیں۔ ہوا میں پہاڑی صندل کی مہک ہے۔ مجھے بھی نہیں معلوم کہ ابھی مجھے دنیا میں کیا کیا جھیلنا ہے ——

میں وشوا بھارتی جانا چاہتا ہوں۔ میں صرف وشوا بھارتی جانا چاہتا ہوں۔

الف : اب میرا خواب سنو —— ! مگر رہنے دو، سب بے کار ہے۔

الف اور ب : (اکٹھے) ہم مجرم ہیں۔ کیونکہ ہم نے اپنے خواب کھو جانے دیے۔

الف : اور دوسروں کے خوابوں میں رخنہ اندازی کی۔

ب : تم کو یہ حق کس طرح پہنچتا تھا کہ تم دوسروں سے کہو کہ اس طرح کے خواب دیکھو، اس طرح کے نہیں!

الف : اب میری مدد کے لیے کون آئے گا؟

ب : مجھے معلوم نہیں۔

الف : میں اور تم دونوں ایک دوسرے کے جاسوس ہیں۔ ہم دو سانپ ہیں۔ ہم دو بچھو ہیں۔ ہم دونوں دو قسم کے کتّے ہیں۔ ایک کوکر اسپینل رونٹیک، اداس آنکھیں نیم وا کیے صوفے پر بیٹھا ہے۔ دوسرا گلی کا کتا سڑک کے کنارے بھوک سے بلبلا رہا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وقت مقررہ پر ہڈیاں ایک کے آگے ڈال دی جاتی ہیں۔ دوسرا اسی طرح بلبلاتا رہتا ہے۔

ب : بیگم صاحبہ آپ کو ارتھا کٹ کی آواز پسند آئی؟

الف : جھکڑ تیز ہو گیا ہے۔ اب تو کان پڑے آواز نہیں سنائی دیتی۔ عجیب عجیب شکلوں کے لوگ جن کے منہ کالے ٹوپ میں چھپے ہیں اور مجھے اچھی طرح نظر نہیں آتے، بگولوں پر چڑیلوں کی طرح سوار چکر کاٹ رہے ہیں۔

ب : میں ان کو پہچانتا ہوں ــــــــ تمھیں بھی ان کو پہچاننا چاہیے۔
الف : ہاں! میرے سامنے حسین فاطمی اور ہنگری والے اور اخوان المسلمین والے اور بے شمار چینی، اور روسی اور جاپانی اور حبشی اور کورین اور ملایائی اور جانے کون کون ایک قطار میں رسّیوں سے لٹک رہے ہیں اور جھکڑ میں ان کی ٹانگیں ہل رہی ہیں۔
ب : حسین فاطمی بڑا وجیہہ نوجوان تھا۔
الف : ہاں! مجھے وہ نظر آرہا ہے۔ وہ تو مسکراتا ہے۔ مجھے اس کی مسکراہٹ سے ڈر لگ رہا ہے۔
ب : کیا ہنگری والا بھی مسکرا رہا ہے؟
الف : ہاں! اور باقی سب قہقہے لگا رہے ہیں۔ یہ لوگ مارے جانے پر اس قدر خوش کیوں ہیں؟
ب : یہ تم نہیں سمجھ سکتے۔ کیونکہ انھوں نے اپنے خوابوں کو کھونے نہیں دیا۔
الف : میں جانتا ہوں۔ اب میں کسے بلاؤں گا جو مجھے ان ہولناک تصورات سے نجات دلائے گا ــــــــ؟

عبدل ــــــــ عبدل ــــــــ عبدل ــــــــ!

ب : ینگ جمی بھی ٹینس کورٹ سے واپس آگیا ہے۔
الف : ہائی ــــــــ جمی ــــــــ عبدل۔ صاحب کے لیے ایک ڈرائی مارٹینی۔

(پردہ)

پت جھڑ کی آواز

صبح میں گلی کے دروازے میں کھڑی سبزی والے سے گوبھی کی قیمت پر جھگڑ رہی تھی۔ اوپر باورچی خانے میں دال چاول اُبالنے کے لیے چڑھا دیے تھے۔ ملازم سودا لینے کے لیے بازار جا چکا تھا۔ غسل خانے میں وقار صاحب چینی کی چلمچی کے اوپر لگے ہوئے مدّھم آئینے میں اپنی صورت دیکھتے ہوئے گنگنا رہے تھے اور شیو کرتے جاتے تھے۔ میں سبزی والے سے بحث کرنے کے ساتھ ساتھ سوچنے میں مصروف تھی کہ رات کے کھانے کے لیے کیا کیا تیار کیا جائے۔ اتنے میں سامنے ایک کار آن کر رُکی۔ ایک لڑکی نے کھڑکی میں سے جھانکا اور پھر دروازہ کھول کر باہر اُتر آئی۔ میں پیسے گن رہی تھی۔ اس لیے میں نے اُسے نہ دیکھا۔ وہ ایک قدم آگے بڑھی۔ اب میں نے سر اٹھا کر اس پر نظر ڈالی۔

"ارے ——— تم ——— !" اس نے ہکّا بکّا ہو کر کہا اور وہیں ٹھٹھک کر رہ گئی۔ ایسا لگا جیسے وہ مدّتوں سے مجھے مُردہ تصور کر چکی ہے، اور اب میرا بھوت

اس کے سامنے کھڑا ہے۔

اس کی آنکھوں میں ایک لحظے کے لیے جو دہشت میں نے دیکھی اس کی یاد نے مجھے باولا کر دیا ہے۔ میں تو سوچ سوچ کے دیوانی ہو جاؤں گی۔

یہ لڑکی (اس کا نام تک ذہن میں محفوظ نہیں، اور اس وقت میں نے جھینپ کے مارے اس سے پوچھا بھی نہیں، ورنہ وہ کتنا بُرا مانتی) میرے ساتھ دِلّی کے کوئین میری میں پڑھتی تھی۔ یہ بیس سال پہلے کی بات ہے۔ میں اس وقت کوئی سترہ سال کی رہی ہوں گی۔ مگر میری صحت اتنی اچھی تھی کہ اپنی عمر سے کہیں بڑی معلوم ہوتی تھی، اور میری خوب صورتی کی دھوم مچنی شروع ہو چکی تھی دِلّی میں قاعدہ تھا کہ لڑکے والیاں اسکول اسکول گھوم کے لڑکیاں پسند کرتی پھرتی تھیں، اور جو لڑکی پسند آتی تھی اس کے گھر "رقعہ" بھجوا دیا جاتا تھا۔ اسی زمانے میں مجھے معلوم ہوا کہ اس لڑکی کی ماں، خالہ وغیرہ نے مجھے پسند کر لیا ہے (اسکول ڈے کے جلسے کے روز دیکھ کر) اور اب وہ مجھے بہو بنانے پر تُلی بیٹھی ہیں۔ یہ لوگ نور جہاں روڈ پر رہتے تھے اور لڑکا حال ہی میں ریزرو بنک آف انڈیا میں دو ڈیڑھ سو روپے ماہوار کا نوکر ہوا تھا۔ چنانچہ "رقعہ" میرے گھر بھجوایا گیا۔ مگر میری امّاں جان میرے لیے بڑے اونچے خواب دیکھ رہی تھیں۔ میرے والدین دِلّی سے باہر میرٹھ میں رہتے تھے اور ابھی میرے بیاہ کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ لہٰذا وہ پیغام فی الفور نامنظور کر دیا گیا۔

اس کے بعد اس لڑکی نے کچھ عرصے میرے ساتھ کالج میں بھی پڑھا۔ پھر اس کی شادی ہو گئی اور وہ کالج چھوڑ کر چلی گئی۔ آج اتنے عرصے بعد لاہور کی مال روڈ کے پچھواڑے اس گلی میں میری اس سے مڈبھیڑ ہوئی۔ میں نے اس سے کہا —— اوپر آؤ —— چائے وائے پیو۔ پھر اطمینان سے بیٹھ کر

باتیں کریں گے۔ لیکن اس نے کہا میں جلدی میں کسی سسرالی رشتے دار کا مکان تلاش کرتی ہوئی اس گلی میں آنکلی تھی ۔ انشاء اللہ پھر کبھی ضرور آؤں گی ۔ اس کے بعد وہیں کھڑے کھڑے اس نے جلدی جلدی نام بنام ساری پرانی دوستوں کے قصے سناتے ۔ کون کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے سلیمہ بریگیڈیر فلاں کی بیوی ہے ۔ چار بچے ہیں ۔ فرخندہ کا میاں فارن سروس میں ہے ۔ اس کی بڑی لڑکی لندن میں پڑھ رہی ہے ۔ ریحانہ فلاں کالج میں پرنسپل ہے ۔ سعدیہ امریکہ سے ڈھیروں ڈگریاں لے آئی ہے ۔ اور کراچی میں کسی اونچی ملازمت پر براجمان ہے کالج کی ہندو ساتھیوں کے حالات سے بھی وہ باخبر تھی ۔ پربھا کا میاں انڈین نیوی میں کموڈور ہے ۔ وہ بمبئی میں رہتی ہے ۔ سرلا آل انڈیا ریڈیو میں اسٹیشن ڈائرکٹر ہے اور جنوبی ہند میں کہیں تعینات ہے ۔ لوتیکا بڑی مشہور آرٹسٹ بن چکی ہے اور نئی دلّی میں اس کا اسٹوڈیو ہے، وغیرہ وغیرہ ۔ وہ یہ سب باتیں کر رہی تھی مگر اس کی آنکھوں کی اس دہشت کو میں نہ بھول سکی ۔

اس نے کہا ——— " میں سعدیہ، ریحانہ وغیرہ جب بھی کراچی میں اکٹھے ہوتے ہیں تمھیں برابر یاد کرتے ہیں ۔"

" واقعی ——— ؟ " میں نے کھوکھلی ہنسی ہنس کر پوچھا ——— معلوم تھا مجھے کن الفاظ میں یاد کیا جاتا ہوگا ۔ تجھل پائیاں، ارے کیا یہ لوگ میری سہیلیاں تھیں؟ عورتیں دراصل ایک دوسرے کے حق میں چڑیلیں ہوتی ہیں ۔ کٹنیاں، حرّافائیں، اس نے مجھ سے یہ بھی نہیں دریافت کیا کہ میں یہاں نیم تاریک سنسان گلی میں اس کھنڈر ایسے مکان کے شکستہ زینے پر کیا کر رہی ہوں ۔ اسے معلوم تھا ۔

عورتوں کی انٹیلیجنس سروس اتنی زبردست ہوتی ہے کہ انٹرپول بھی اس کے آگے پانی بھرے، اور پھر میرا قصہ تو الم نشرح ہے ۔ میری حیثیت کوئی قابلِ ذکر نہیں

گمنام ہستی ہوں۔ اس لیے کسی کو میری پروا نہیں۔ خود مجھے بھی اپنی پروا نہیں۔

میں تنویر فاطمہ ہوں۔ میرے ابا میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ معمولی حیثیت کے زمیندار تھے۔ ہمارے یہاں بڑا سخت پردہ کیا جاتا تھا۔ خود میرا میرے چچازاد، پھوپھی زاد بھائیوں سے پردہ تھا۔ میں بے انتہا لاڈوں کی پلی چہیتی لڑکی تھی۔ جب میں نے اسکول میں بہت سے وظیفے حاصل کر لیے تو میٹرک کرنے کے لیے خاص طور پر میرا داخلہ کوئین میری اسکول میں کرایا گیا۔ انٹر کے لیے میں علی گڑھ بھیج دی گئی۔ علی گڑھ گرلز کالج کا زمانہ میری زندگی کا بہترین دَور تھا کیسا خواب آگیں دَور تھا۔ میں جذبات پرست نہیں لیکن اب بھی جب کالج کا صحن، روشیں، گھاس کے اونچے پودے، درختوں پر جھکی بارش، نمایش کے میدان میں گھومتے ہوئے کالے برقعوں کے پَرے، ہوسٹل کے پتلے پتلے برآمدوں چھوٹے چھوٹے کمروں کی وہ شدید گھریلو فضائیں یاد آتی ہیں تو جی ڈوب سا جاتا ہے۔ ایم۔ ایس۔ سی کے لیے میں پھر دلّی آ گئی۔ یہاں کالج میں میرے ساتھ بھی سب لڑکیاں پڑھتی تھیں۔ ریحانہ، سعدیہ، پربھا، فلانی ڈھماکی، مجھے لڑکیاں کبھی پسند نہ آئیں۔ مجھے دنیا میں زیادہ تر لوگ پسند نہیں آتے۔ بیش تر لوگ محض تضیعِ اوقات ہیں۔ میں بہت مغرور تھی۔ حسن ایسی چیز ہے کہ انسان کا دماغ خراب ہوتے دیر نہیں لگتی۔ پھر میں تو بقول شخصے لاکھوں میں ایک تھی۔ شیشے کا ایسا جھلکتا ہوا رنگ سرخی مائل سنہرے بال۔ بے حد شان دار ڈیل ڈول بنارسی ساری پہن لوں تو بالکل کہیں کی مہارانی معلوم ہوتی تھی۔

یہ جنگ کا زمانہ تھا، یا شاید جنگ اسی سال ختم ہوئی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں۔ بہر حال دِلّی پر بہار آئی ہوئی تھی ——— کروڑپتی کاروباریوں اور حکومت ہند کے اعلا افسروں کی لڑکیاں ——— ہندو، سکھ، مسلمان ———

لمبی لمبی موٹروں میں اُڑی اُڑی پھرتیں نت نئی پارٹیاں، جلسے، ہنگامے، آج اندرپرستھ کالج میں ڈراما ہے، کل میرانڈا ہاؤس میں، پرسوں لیڈی اردن کالج میں کونسرٹ ہے۔ لیڈی ہارڈنگ اور سینٹ اسٹیونز کالج ——— چیمسفرڈ کلب، روشن آرا، امپیریل جم خانہ۔ غرض کہ ہر طرف الف لیلہ کے باب بکھرے پڑے تھے۔ ہر جگہ نوجوان فوجی افسروں اور سول سروس کے بن بیاہے عہدے داروں کے پرے ڈدلتے نظر آتے۔ ایک ہنگامہ تھا۔

پربھا اور سرلا کے ہمراہ ایک روز میں دلجیت کور کے یہاں جو ایک کروڑ پتی کنٹریکٹر کی لڑکی تھی کنگ ایڈورڈ روڈ کی ایک شان دار کوٹھی میں گارڈن پارٹی کے لیے مدعو تھی۔

..یہاں میری ملاقات میجر خوش وقت سنگھ سے ہوئی۔ یہ جھانسی کی طرف کا چوہان راجپوت تھا۔ لمبا تڑنگا کالا بھجنگ، لانبی لانبی اوپر کو مڑی ہوئی نوکیلی مونچھیں، بے حد چمکیلے اور خوبصورت دانت، ہنستا تو بہت اچھا لگتا۔ غالب کا پرستار تھا، بات بات پر شعر پڑھتا، قہقہے لگاتا اور جھک جھک کر بے حد اخلاق سے سب سے باتیں کرتا۔ اس نے ہم کو دوسرے روز سینما چلنے کی دعوت دی۔ سرلا، پربھا وغیرہ ایک بددماغ لڑکیاں تھیں اور خاصی قدامت پسند، وہ لڑکوں کے ساتھ باہر گھومنے بالکل نہیں جاتی تھیں۔ خوش وقت سنگھ، دلجیت کے بھائی کا دوست تھا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کیا جواب دوں کہ اتنے میں سرلا نے چپکے سے کہا ——— "خوش وقت سنگھ کے ساتھ ہرگز سینما مت جانا ——— سخت لوفر لڑکا ہے" ——— میں چپ ہو گئی۔

اس زمانے میں نئی دلّی کی دو ایک آوارہ لڑکیوں کے قصے بہت مشہور ہو رہے تھے اور میں سوچ سوچ کر ڈرا کرتی تھی۔ شریف گھرانوں کی لڑکیاں اپنے

ماں باپ کی آنکھوں میں دھول جھونک کر کس طرح لوگوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی ہیں۔ ہوسٹل میں ہم اکثر اس قسم کی لڑکیوں کے لیے قیاس آرائیاں کیا کرتے یہ بڑی عجیب اور پُراسرار ہستیاں معلوم ہوتیں۔ حالانکہ دیکھنے میں وہ بھی ہماری طرح ہی کی لڑکیاں تھیں۔ ساریوں اور شلواروں میں ملبوس۔ طرحدار، خوبصورت پڑھی لکھی ——— !

"لوگ بدنام کر دیتے ہیں جی ———" سعدیہ دماغ پر بہت زور ڈال کر کہتی ——— "اب ایسا بھی کیا ہے۔"

"دراصل ہماری سوسائٹی اس قابل ہی نہیں ہوئی کہ تعلیم یافتہ لڑکیوں کو ہضم کر سکے" ——— سرلا کہتی۔

"ہوتا یہ ہے کہ لڑکیاں احساس توازن کھو بیٹھتی ہیں" ریحانہ رائے دیتی۔

بہر حال کسی طرح یقین نہ آتا کہ یہ ہماری جیسی، ہمارے ساتھ کی چند لڑکیاں ایسی ایسی خوف ناک حرکتیں کس طرح کرتی ہیں۔

دوسری شام میں لیبارٹری کی طرف جا رہی تھی کہ نکلسن میموریل کے قریب ایک قرمزی رنگ کی لمبی سی کار آہستہ سے رُک گئی۔ اس میں سے خوشونت سنگھ نے جھانکا اور اندھیرے میں اس کے خوبصورت دانت جھلملائے۔

"اجی حضرت! یوں کہیے کہ آپ اپنا اپوائنٹمنٹ بھول گئیں!"

"جی ——— !" میں نے ہڑبڑا کر کہا۔

"حضور والا ——— چلیے میرے ساتھ فوراً۔ یہ شام کا وقت لیبارٹری میں گھُس کر بیٹھنے کا نہیں ہے۔ اتنا پڑھ کر کیا کیجیے گا ———؟"

میں نے بالکل غیر ارادی طور پر چاروں طرف دیکھا اور کار میں دبک کر بیٹھ گئی۔

ہم نے کناٹ پلیس جاکر ایک انگریزی فلم دیکھی۔
اس کے اگلے روز بھی۔
اس کے بعد ایک ہفتے تک میں نے خوب خوب سیریں اس کے ساتھ کیں۔
وہ میڈنز میں ٹھہرا ہوا تھا۔
اس ہفتے کے آخر تک میں میجر خوشوقت سنگھ کی مسٹریس بن چکی تھی۔

میں لٹریری نہیں ہوں، میں نے چینی، جاپانی، روسی، انگریزی یا اُردو شاعری کا مطالعہ نہیں کیا۔ ادب پڑھنا میرے نزدیک وقت ضائع کرنا ہے ـــ پندرہ برس کی عمر سے سائنس میرا اوڑھنا بچھونا رہا ہے۔ میں نہیں جانتی کہ مابعد الطبیعاتی تصورات کیا ہوتے ہیں۔ MYSTIC کشش کے کیا معنی ہیں۔ شاعری اور فلسفے کے لیے نہ میرے پاس فرصت جب تھی نہ اب ہے۔ میں بڑے بڑے مبہم، غیر واضح اور پُر اسرار الفاظ بھی استعمال نہیں کر سکتی!

بہرحال پندرہ روز کے اندر اندر یہ واقعہ بھی کم و بیش کالج میں سب کو معلوم ہو چکا تھا۔ لیکن مجھ میں اپنے اندر ہمیشہ سے بڑی عجیب سی خود اعتمادی تھی میں نے اب پروا نہیں کی۔ پہلے بھی میں لوگوں سے بول چال بہت کم رکھتی تھی۔ سرلا وغیرہ کا گروہ اب مجھے ایسی نظروں سے دیکھتا گویا میں مریخ سے اُتر کر آئی ہوں یا میرے سر پر سینگ ہیں۔ ڈائننگ ہال میں میرے باہر جانے کے بعد گھنٹوں میرے قصّے دہرائے جاتے۔ اپنی انٹلیجنس سروس کے ذریعے میرے اور خوشوقت سنگھ کے بارے میں ان کو پل پل کی خبر رہتی۔ ہم لوگ شام کو کہاں گئے ـــ رات نئی دلّی کے کون سے بال روم میں ناچے (خوشوقت معرکے کا ڈانسر تھا۔ اس نے مجھے ناچنا بھی سکھا دیا تھا) خوشوقت نے مجھے کیا کیا تحائف کون کون سی دکانوں سے خرید کر دیے۔

خوش وقت سنگھ مجھے مارتا بہت تھا اور مجھ سے اتنی محبت کرتا تھا جو آج تک دنیا میں کسی مرد نے کسی عورت سے نہ کی ہوگی۔

کئی مہینے گزر گئے۔ میرے ایم۔ ایس۔ سی پر یویس کے امتحان سر پہ آگئے اور میں پڑھنے میں مصروف ہوگئی۔ امتحانات کے بعد اس نے کہا ——— "جانِ من ——— دِلرُبا! چلو کسی خاموش سے پہاڑ پر چلیں ——— سولن، ڈلہوزی، لینسڈاؤن ——— میں چند روز کے لیے میرٹھ گئی اور ابّا سے یہ کہہ کر (امّاں جان کا جب میں تھرڈ ایر میں تھی تو انتقال ہوگیا تھا) دِلّی واپس آگئی کہ فائینل ایئر کے لیے بے حد پڑھائی کرنی ہے"، شمالی ہند کے پہاڑی مقامات پر بہت سے شناساؤں کے ملنے کا امکان تھا اس لیے ہم دور جنوب میں اوٹی چلے گئے وہاں مہینا بھر رہے۔ خوشوقت کی چھٹی ختم ہوگئی تو دِلّی واپس آکر تیمار پور کے ایک بنگلے میں ٹِک گئے۔

کالج کھلنے سے ایک ہفتہ قبل خوشوقت کی اور میری بڑی زبردست لڑائی ہوئی۔ اس نے مجھے خوب مارا۔ اتنا مارا کہ میرا سارا چہرہ لہولہان ہوگیا، اور میری باہوں اور پنڈلیوں پر نیل پڑ گئے۔ لڑائی کی وجہ اس کی وہ مردار عیسائی منگیتر تھی جو جانے کہاں سے ٹپک پڑی تھی اور سارے میں میرے خلاف زہر اگلتی پھر رہی تھی۔ اگر اس کا بس چلتا تو مجھے کچّا چبا جاتی۔ یہ چار، دبیس لڑکی جنگ کے زمانے میں فوج میں تھی اور خوشوقت کو برما کے محاذ پر ملی تھی۔ خوشوقت نے جانے کس طرح اس سے شادی کا وعدہ کر لیا تھا۔ لیکن مجھ سے ملنے کے بعد اب وہ اس کی انگوٹھی واپس کرنے پر تُلا بیٹھا تھا۔

اس رات تیمار پور کے اس سنسان بنگلے میں اس نے میرے آگے ہاتھ جوڑے اور رو رو کر مجھ سے کہا کہ میں اس سے بیاہ کر لوں، ورنہ وہ مر جائے گا۔ میں نے

کہا ہرگز نہیں۔ قیامت تک نہیں۔ میں اعلیٰ خاندان سیّد زادی، بھلا اس کالے تمباکو کے پنڈے ہندو جاٹ سے بیاہ کرکے خاندان کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگاتی۔ میں تو اس حسین وجمیل کسی بہت اونچے مسلمان گھرانے کے چشم وچراغ کے خواب دیکھ رہی تھی جو ایک روز دیر یا سویر براتے لے کر مجھے بیاہنے آئے گا۔ ہمارا آرسی مصحف ہوگا۔ میں سہرے جلوے سے رخصت ہوکر اس کے گھر جاؤں گی۔ بجلی بسنت نندیں دروازے پر دہلیز روک کر اپنے بھائی سے نیگ کے لیے جھگڑیں گی۔ میراثنیں ڈھولک لیے کھڑی ہوں گی۔ کیا کیا کچھ ہوگا۔ میں نے کیا ہندو مسلم شادیوں کا حشر دیکھا نہیں تھا۔ کیتوں نے ترقی پسندی یا جذبۂ عشق کے جوش میں آکر ہندوؤں سے بیاہ رچاتے اور سال بھر کے اندر جوتیوں میں دال بٹی۔ بچوں کا جو حشر خراب ہوا وہ الگ —— نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے۔ میرے انکار پر خوشوقت نے جوتے لات سے مار مار کر میرا بھرکس نکال دیا اور تیسرے دن اس ڈائن کالی بلا کیتھرین دھرم داس کے ساتھ آگرے چلا گیا جہاں اس نے اس بدذات لڑکی سے سول میرج کرلی۔

جب میں نئی ٹرم کے آغاز پر ہوسٹل پہنچی تو اس حلیے سے کہ میرے سر اور چہرے پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ ابّا کو میں نے لکھ بھیجا کہ لیبارٹری میں ایک تجربہ کررہی تھی، ایک خطرناک مادّہ بھک سے اڑا اور اس سے میرا منہ تھوڑا سا جل گیا۔ اب بالکل ٹھیک ہوں۔ فکر نہ کیجیے!

لڑکیوں کو تو سارا قصّہ پہلے ہی معلوم ہوچکا تھا۔ لہٰذا انھوں نے اخلاقاً میری خیریت بھی نہ پوچھی۔ اتنے بڑے اسکینڈل کے بعد مجھے ہوسٹل میں رہنے کی اجازت نہ دی جاتی مگر ہوسٹل کی وارڈن خوشوقت سنگھ کی بہت دوست تھی۔ اس لیے سب خاموش رہے۔ اس کے علاوہ کسی کے پاس کسی طرح کا ثبوت بھی نہ تھا۔ کالج کی لڑکیوں کو لوگ

یوں بھی خواہ مخواہ بدنام کرنے پر تُلے رہتے ہیں۔

مجھے وہ وقت اچھی طرح یاد ہے، جیسے کل کی بات ہو۔ صبح کے دس گیارہ بجے ہوں گے۔ ریلوے اسٹیشن سے لڑکیوں کے تانگے آ آکر پھاٹک میں داخل ہوئے تھے۔ ہوسٹل کے لان پر برگد کے درخت کے نیچے لڑکیاں اپنا اپنا اسباب اُتروا کر رکھوا رہی تھیں۔ بڑی سخت چل پوں مچا رکھی تھی۔ جس وقت میں اپنے تانگے سے اُتری وہ میرا ڈھاٹے سے بندھا ہوا سفید چہرہ دیکھ کر ایسی حیرت زدہ ہوئیں جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ میں نے سامان چوکیدار کے سر پر رکھوایا اور اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ دوپہر کو جب میں کھانے کی میز پر آن کر بیٹھی تو ان قطاماؤں نے مجھ سے اس اخلاق سے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کیں جن سے اچھی طرح یہ ظاہر ہو جائے کہ میرے حادثے کی اصل وجہ جانتی ہیں اور مجھے ندامت سے بچانے کے لیے اس کا تذکرہ ہی نہیں کر رہی ہیں۔ ان میں سے ایک نے جو اس چنڈال چوکڑی کی گرو اور ان سب کی استاد تھی، رات کو کھانے کی میز پر فیصلہ صادر کیا کہ میں نفسیات کی اصطلاح میں Nympho - Maniac ہوں (مجھے میری جاسوسوں کے ذریعے یہ اطلاع فوراً اوپر پہنچ گئی، جہاں میں اس وقت اپنے کمرے میں کھڑکی کے پاس ٹیبل لیمپ لگائے پڑھائی میں مصروف تھی) اور اس طرح کی باتیں تو اب عام تھیں کہ ایک مچھلی سارے جل کو گندا کرتی ہے۔ اسی لیے تو لڑکیوں کی بے پردگی آزادی خطرناک اور اعلا تعلیم بدنام ہے وغیرہ وغیرہ۔

میں اپنی حد تک سو فی صدی ان آراء سے متفق تھی۔ میں خود سوچتی تھی کہ بعض اچھی خاصی بھلی چنگی اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیاں آوارہ کیوں ہو جاتی ہیں۔ ایک تھیوری تھی کہ وہی لڑکیاں آوارہ ہوتی ہیں جن کا "آئی۔کیو" بہت کم ہوتا ہے۔ ذہین انسان کبھی اپنی تباہی کی طرف جان بوجھ کر قدم نہ اٹھائے گا۔ مگر میں نے تو

اچھی خاصی سمجھ دار تیز و طرار لڑکیوں کو لوفری کرتے دیکھا تھا۔ دوسری تھیوری تھی کہ سیر و تفریح، روپے پیسے، عیش و آسایش کی زندگی، قیمتی تحائف کا لالچ، رومان کی تلاش، ایڈونچر کی خواہش، یا محض اکتاہٹ، یا پردے کی قید و بند کے بعد آزادی کی فضا میں داخل ہو کر پرانی اقدار سے بغاوت۔ اس صورت حال کی چند وجوہ ہیں۔ یہ سب باتیں ضرور ہوں گی ورنہ اور کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

میں فرسٹ ٹرمنل امتحان سے فارغ ہوئی تھی کہ خوشوقت پھر آن پہنچا۔ اس نے مجھے لیبارٹری فون کیا کہ میں نرولا میں چھ بجے اس سے ملوں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ وہ کیتھرین کو اپنے ماں باپ کے یہاں چھوڑ کر سرکاری کام سے دِلّی آیا تھا۔ اس مرتبہ ہم ہوائی جہاز سے ایک ہفتے کے لیے بمبئی چلے گئے۔

اس کے بعد اس سے ہر دوسرے تیسرے مہینے ملنا ہوتا رہا۔ ایک سال نکل گیا اب کے سے جب وہ دِلّی آیا تو اس نے اپنے ایک جگری دوست کو مجھے لینے کے لیے موٹر لے کر بھیجا۔ کیونکہ وہ لکھنؤ سے لاہور جاتے ہوئے پالم پر چند گھنٹے کے لیے ٹھہرا تھا۔ یہ دوست دِلّی کے ایک بڑے مسلمان تاجر کا لڑکا تھا۔ لڑکا تو خیر نہیں کہنا چاہیے اس وقت بھی وہ چالیس کے پیٹے میں رہا ہوگا۔ بیوی بچوں والا۔ ناٹا کا سا قد۔ بے حد غلط انگریزی بولتا تھا۔ کالا۔ بدقطع۔ بالکل چڑیمار کی شکل۔ ہُوش صفت۔

خوشوقت اب کی مرتبہ دِلّی سے گیا تو پھر کبھی واپس نہ آیا کیونکہ اب میں فاروق کی مسٹریس بن چکی تھی۔

فاروق کے ساتھ اب میں اس کی "منگیتر" کی حیثیت سے باقاعدہ دِلّی کی اونچی سوسائٹی میں شامل ہو گئی۔ مسلمانوں میں تو چار شادیاں جائز ہیں لہٰذا یہ کوئی بہت بُری بات نہ تھی۔ یعنی مذہب کے نقطۂ نگاہ سے کہ وہ اپنی اَن پڑھ، ادھیڑ عمر کی پردے کی بُو بُو کی موجودگی میں ایک تعلیم یافتہ لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا جو

چار آدمیوں میں ڈھنگ سے اٹھ بیٹھ سکے۔ اور پھر دولت مند طبقے میں سب کچھ جائز ہے۔ یہ تو ہماری مڈل کلاس کے قوانین ہیں کہ یہ نہ کرو، وہ نہ کرو ـــ طویل چھٹیوں کے زمانے میں فاروق نے بھی مجھے خوب سیریں کرائیں۔ کلکتہ، لکھنؤ، اجمیر، کون جگہ تھی جو میں نے اس کے ساتھ نہ دیکھی۔ اس نے مجھے ہیرے جواہرات کے گہنوں سے لاد دیا۔ ابا کو لکھ بھیجتی تھی کہ یونی ورسٹی کے طالب علموں کے ہمراہ ٹور پر جا رہی ہوں۔ یا فلاں جگہ ایک سائنس کانفرنس میں شرکت کے لیے مجھے بلایا گیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ مجھے اپنا تعلیمی ریکارڈ اونچا رکھنے کی دُھن تھی۔ فائنل امتحان میں میں نے بہت ہی خراب پرچے کیے اور امتحان ختم ہوتے ہی گھر چلی گئی۔

اسی زمانے میں دلّی میں گڑبڑ شروع ہوئی اور فسادات کا بھونچال آ گیا۔ فاروق نے مجھے میرٹھ خط لکھا کہ تم فوراً پاکستان چلی جاؤ۔ میں تم سے وہیں ملوں گا۔ میرا پہلے ہی سے یہ ارادہ تھا۔ ابا بھی بے حد پریشان تھے اور یہی چاہتے تھے کہ ان حالات میں اب میں انڈیا میں نہ رہوں جہاں شریف مسلمان لڑکیوں کی عزتیں مستقل خطرے میں ہیں۔ پاکستان اپنا اسلامی ملک تھا۔ اس کی بات ہی کیا تھی۔ ابا جایداد وغیرہ کی وجہ سے فی الحال ترک وطن نہ کر سکتے تھے۔ میرے بھائی دونوں بہت چھوٹے تھے اور اماں جان کے انتقال کے بعد ابا نے ان کو میری خالہ کے پاس حیدر آباد دکن بھیج دیا تھا۔ میرا رزلٹ نکل چکا تھا اور میں تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوئی تھی۔ میرا دل ٹوٹ گیا۔ جب بلووں کا زور ذرا کم ہوا تو میں ہوائی جہاز سے لاہور آ گئی۔ فاروق میرے ساتھ آیا۔ اس نے یہ پروگرام بنایا تھا کہ اپنے کاروبار کی ایک شاخ پاکستان میں قائم کر کے لاہور اس کا ہیڈ آفس رکھے گا۔ مجھے اس کا مالک بنائے گا اور وہیں مجھ سے شادی کر لے گا۔ وہ دلّی سے ہجرت نہیں

کر رہا تھا۔ کیونکہ اس کے باپ بڑے احراری خیالات کے آدمی تھے۔ پلان یہ تھا کہ وہ ہر دوسرے تیسرے مہینے دِلّی سے لاہور آتا رہے گا۔ لاہور میں افراتفری تھی حالانکہ ایک سے ایک اعلا کوٹھی الاٹ ہو سکتی تھی، مگر فاروق یہاں کسی کو جانتا نہ تھا۔ بہر حال سنت نگر میں ایک چھوٹا سا مکان میرے نام الاٹ کرا کے اس نے مجھے وہاں چھوڑ دیا اور میری دوسراتھ کے لیے اپنے ایک دُور کے رشتے دار کنبے کو میرے پاس ٹھہرا دیا۔ جو مہاجر ہو کے لاہور آئے تھے اور مارے مارے پھر رہے تھے ——

میں زندگی کی اس یک بیک تبدیلی سے اتنی ہکا بکا تھی کہ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا سے کیا ہو گیا۔ کہاں غیر منقسم ہندستان کی وہ بھرپور، دلچسپ رنگا رنگ دُنیا، کہاں ۱۹۴۷ء کے لاہور کا وہ تنگ و تاریک مکان۔ غریب الوطنی —— اللہ اکبر —— میں نے کیسے کیسے دل ہلا دینے والے زمانے دیکھے ہیں!

میں اتنی خالی الذہن ہو چکی تھی کہ میں نے تلاشِ ملازمت کی بھی کوئی کوشش نہ کی۔ روپے کی طرف سے فکر نہ تھی کیونکہ فاروق میرے نام دس ہزار روپیا جمع کرا گیا تھا (صرف دس ہزار۔ وہ خود کروڑوں کا آدمی تھا۔ مگر اس وقت میری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ اب بھی نہیں آتا)۔

دن گزرتے گئے۔ میں صبح سے شام تک پلنگ پر پڑی فاروق کی رشتے کی خالہ یا نانی جو کچھ بھی وہ بڑی بی تھیں۔ ان سے ان کی ہجرت کے مصائب کی داستان اور ان کی سابقہ امارت کے قصے سنا کرتی اور پان پہ پان کھاتی، یا ان کی میٹرک میں پڑھنے والی بیٹی کو الجبرا، جیومیٹری سکھلایا کرتی۔ ان کا بیٹا فاروق کی برائے نام بزنس کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔

فاروق سال میں پانچ چھے چکر لگا لیتا۔ اب لاہور کی زندگی رفتہ رفتہ نارمل

ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی آمد سے میرے دن کچھ رونق کے کٹتے۔ اس کی خالہ بڑے اہتمام سے دلّی کے کھانے اس کے لیے تیار کرتیں۔ میں مال کے ہیر ڈریسر کے یہاں جا کر اپنے بال سیٹ کرواتی۔ شام کو ہم دونوں جم خانہ کلب چلے جاتے اور وہاں ایک کونے کی میز پر بیئر کا گلاس سامنے رکھے فاروق مجھے دلّی کے واقعات سناتا۔ وہ بے تکان بولے چلا جاتا۔ یا پھر دفعتاً چپ ہو کر کمرے میں آنے والی اجنبی صورتوں کو دیکھتا رہتا۔ اس نے شادی کا کبھی کوئی ذکر نہیں کیا۔ میں نے بھی اس سے نہیں کہا۔ میں اب اُکتا چکی تھی۔ کسی چیز سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب وہ دلّی واپس چلا جاتا تو میں ہر پندرھویں دن اپنی خیریت کا خط اور اس کے کاروبار کا حال لکھ بھیجتی اور لکھ دیتی کہ اب کی دفعہ آئے تو کناٹ پلیس یا چاندنی چوک کی فلاں دکان سے فلاں فلاں قسم کی ساریاں لیتا آئے کیونکہ پاکستان میں اچھی ساریاں ناپید ہیں۔

ایک روز میرٹھ سے چچا میاں کا خط آیا کہ ابّا کا انتقال ہو گیا۔ ع

جب احمدِ مرسل نہ رہے کون رہے گا

میں جذبات سے واقف نہیں ہوں مگر باپ مجھ پر جان چھڑکتے تھے۔ ان کی موت کا مجھے سخت صدمہ ہوا۔ فاروق نے مجھے بڑے پیار کے دلاسے بھرے خط لکھے تو ذرا ڈھارس بندھی۔ اس نے لکھا ——— نماز پڑھا کرو۔ بہت بُرا وقت ہے۔ دنیا پر کالی آندھی چل رہی ہے۔ سورج ڈیڑھ بلم پر آیا چاہتا ہے۔ پل کا بھروسا نہیں۔ سارے کاروباریوں کی طرح وہ بھی بڑا سخت مذہبی اور توہّم پرست آدمی تھا۔ پابندی سے اجمیر شریف جاتا — نجومیوں، رمّالوں، پنڈتوں، سیانوں، پیروں، فقیروں، اچھے اور بُرے شگونوں، خوابوں کی تعبیر، غرض کہ ہر چیز کا قائل تھا۔ ایک مہینا میں نے نماز پڑھی۔ مگر جب میں سجدے میں جاتی تو دل چاہتا، خوب زور زور

سے ہنسوں۔

ملک میں سائنس کی خواتین لیکچراروں کی بڑی زبردست مانگ تھی۔ جب مجھے ایک مقامی کالج والوں نے بے حد مجبور کیا تو میں نے پڑھانا شروع کر دیا۔ حالانکہ ٹیچری کرنے سے مجھے سخت نفرت ہے۔ کچھ عرصے بعد مجھے پنجاب کے ایک دُور افتادہ ضلع کے گرلز کالج میں بلا لیا گیا۔ کئی سال تک میں نے وہاں کام کیا۔ مجھ سے میری طالب علم لڑکیاں اکثر پوچھتیں ——— "ہائے اللہ مس تنویر۔ آپ اتنی پیاری سی ہیں۔ آپ اپنے کروڑپتی منگیتر سے شادی کیوں نہیں کرتیں؟"

اس سوال کا خود میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

یہ نیا ملک تھا۔ نئے لوگ، نیا معاشرہ۔ یہاں کسی کو میرے ماضی کا علم نہ تھا۔ کوئی بھی بھلا مانس مجھ سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو سکتا تھا لیکن بھلے مانس، خوش شکل، سیدھے سادے شریف زادے مجھے پسند ہی نہیں آتے تھے (میں کیا کرتی؟)۔ دِلّی کے قصّے دِلّی میں رہ گئے۔ اور پھر میں نے تو یہ دیکھا ہے کہ ایک سے ایک حرّافہ لڑکیاں اب ایسی پارسا بنی ہوئی ہیں کہ دیکھا ہی کیجیے۔ خود ایڈتھ ہری رام اور رانی خاّن کی مثال میرے سامنے موجود ہے۔

اب فاروق بھی کبھی کبھی آتا۔ ہم لوگ اس طرح ملتے گویا بیسیوں برس کے پرانے شادی شدہ میاں بیوی ہیں جن کے پاس سارے نئے موضوع ختم ہو چکے ہیں۔ اب سکون اور آرام اور ٹھہراؤ کا وقت ہے۔ فاروق کی بیٹی کی حال ہی میں دِلّی میں شادی ہوئی ہے۔ اس کا لڑکا آکسفرڈ جا چکا ہے۔ بیوی کو مستقل دمہ رہتا ہے فاروق نے اپنے کاروبار کی شاخیں باہر کے کئی ملکوں میں پھیلا دی ہیں۔ نینی تال میں نیا بنگلہ بنوا رہا ہے۔ فاروق اپنے خاندان کے قصّے، کاروبار کے معاملات مجھے تفصیل سے سنایا کرتا اور میں اس کے لیے پان بناتی رہتی۔

ایک مرتبہ میں چھٹیوں میں کالج سے لاہور آئی تو فاروق کے ایک پُرانے دوست سید وقار حسین خان سے میری ملاقات ہوئی۔ یہ بھی اپنے پُرانے وقت کے اکیلے تھے۔ اور کچھ کم کم رُو نہ تھے۔ دراز قد، موٹے تازے، سیاہ توا ایسا رنگ عمر میں پینتالیس کے لگ بھگ۔ اچھے خاصے دیوزاد معلوم ہوتے۔ ان کو میں نے پہلی مرتبہ نئی دلّی میں دیکھا تھا جہاں ان کا ڈانسنگ اسکول تھا۔ یہ رام پور کے ایک شریف گھرانے کے اکلوتے فرزند تھے۔ بچپن میں گھر سے بھاگ گئے۔ سرکس، کارنیول اور تھیٹر کمپنیوں کے ساتھ ملکوں ملکوں میں گھومے۔ سنگاپور، ہانگ کانگ، شنگھائی، لندن، جانے کہاں کہاں۔ اَن گنت قومیتوں اور نسلوں کی عورتوں سے وقتاً فوقتاً شادیاں رچائیں۔ ان کی موجودہ بیوی اڑیسہ کے ایک مارواڑی مہاجن کی لڑکی تھی جس کو یہ کلکتے سے اُڑا لائے تھے۔ بارہ پندرہ سال قبل میں نے اسے دلّی میں دیکھا تھا۔ سانولی سلونی سی پستہ قد لڑکی تھی۔ اس کی شکل پر عجیب طرح کا الم برستا۔ مگر سُنا تھا کہ بڑی پتی ورتا عورت تھی۔ میاں کی بدسلوکیوں سے تنگ آ کر اِدھر اُدھر بھاگ جاتی۔ لیکن چند روز کے بعد پھر واپس موجود۔ خان صاحب نے کناٹ سرکس کی ایک بلڈنگ کی تیسری منزل میں انگریزی ناچ سکھانے کا اسکول کھول رکھا تھا جس میں وہ اور ان کی بیوی اور دو اینگلو انڈین لڑکیاں گویا اسٹاف میں شامل تھیں۔ جنگ کے زمانے میں اس اسکول پر ہُن برسا۔ اتوار کے روز ان کے یہاں صبح کو "جیم سیشن" ہوا کرتے۔ ایک مرتبہ میں بھی خوش وقت کے ساتھ وہاں گئی تھی۔ سُنا تھا کہ وقار صاحب کی بیوی ایسی مہاستی انسویا کی اوتار ہیں کہ ان کے میاں حکم دیتے ہیں کہ فلاں فلاں لڑکی سے بہناپا گانٹھو اور پھر اسے مجھ سے ملانے کے لیے لے کر آؤ۔ اور وہ نیک بخت ایسا ہی کرتی۔ ایک بار وہ ہمارے ہوسٹل میں آئی اور چند لڑکیوں کے سر ہوئی کہ اس کے ساتھ بارہ کھمبا روڈ چل کر چائے پییں۔

تقسیم کے بعد وفا رصاحب بقول شخصے لُٹ لٹا کر لاہور آن پہنچے تھے اور مال روڈ کے پچھواڑے ایک فلیٹ الاٹ کروا کے اس میں اپنا اسکول کھول لیا تھا۔ شروع شروع میں کاروبار مندا رہا۔ دلوں پر مُردنی چھائی تھی۔ ناچنے گانے کا کسے ہوش تھا۔ اس فلیٹ میں تقسیم سے پہلے آریہ سماجی ہندوؤں کا میوزک اسکول تھا لکڑی کے فرش کا ہال، پہلو میں دو چھوٹے کمرے، غسل خانہ اور باورچی خانہ، سامنے لکڑی کی بالکنی اور شکستہ ہلتا ہوا زینہ "ہند ماتا سنگیت مہا ودیالہ" کا بورڈ بالکنی کے جنگلے پر اب تک ٹیڑھا ٹنگا ہوا تھا۔ اسے اُتار کر "وفارز اسکول آف بال روم اینڈ ٹیپ ڈانسنگ" کا بورڈ لگا دیا گیا۔ امریکی فلمی رسالوں سے تراش کر جین کیلی، فریڈ آسٹیر، فرینک سیناٹرا، ڈورس ڈے وغیرہ کی رنگین تصویریں ہال کی بوسیدہ دیواروں پر آویزاں کر دی گئیں اور اسکول چالو ہو گیا۔ ریکارڈوں کا تھوڑا سا ذخیرہ خان صاحب دلّی سے ساتھ لیتے آئے تھے۔ گراموفون اور سیکنڈ ہینڈ فرنیچر فاروق سے روپیا قرض لے کر انھوں نے یہاں خرید لیا۔ کالج کے منچلے لونڈوں اور نئی دَولت مند سوسائٹی کی تازہ تازہ فیشن ایبل بیگمات کو خدا سلامت رکھے۔ دو تین سال میں ان کا کام خوب چمک گیا۔

فاروق کی دوستی کی وجہ سے میرا اور ان کا کچھ بھاوج اور جیٹھ کا سا رشتہ ہو گیا تھا۔ وہ اکثر میری خیر خبر لینے آجاتے، ان کی بی بی گھنٹوں میرے ساتھ پکانے، رِیندھنے، سینے پرونے کی باتیں کیا کرتیں۔ بے چاری مجھ سے بالکل جیٹھانی والا شفقت کا برتاو کرتیں۔ یہ میاں بیوی لاولد تھے۔ بڑا اُداس، بے رنگ، بے تُکا سا غیر دلچسپ جوڑا تھا۔ ایسے لوگ بھی دنیا میں موجود ہیں ——— !

کالج میں نئی امریکہ پلٹ نک چڑھی پرنسپل سے میرا جھگڑا ہو گیا۔ اگر وہ سیر تو میں سوا سیر۔ میں خود ابوالحسن تانا شاہ سے کون کم تھی۔ میں نے استعفا کالج کمیٹی کے سر پہ

مارا۔ اور پھر سنت نگر لاہور واپس آگئی۔ میں پڑھاتے پڑھاتے اُکتا چکی تھی۔
میں کوئی وظیفہ لے کر پی۔ایچ۔ڈی کے لیے باہر جا سکتی تھی۔ مگر اس ارادے کو
بھی کل پر ٹالتی رہی۔ کل امریکنوں کے دفتر جاؤں گی جہاں وہ وظیفے بانٹتے ہیں۔
کل برٹش کونسل جاؤں گی۔ کل ایجوکیشن منسٹری میں اسکالرشپ کی درخواست بھیجوں گی
مزید وقت گزر گیا۔ کیا کروں گی کہیں باہر جا کر ——؟ کون سے گڑھ جیت
لوں گی ——؟ کون سے کدّو میں تیر مار لوں گی ——؟ مجھے جانے کس چیز
کا انتظار تھا ——؟ مجھے معلوم نہیں!

اس دوران میں ایک روز وقار بھائی میرے پاس حواس باختہ آئے اور کہنے
لگے —— "تمھاری بھابی کے دماغ میں پھر سودا اٹھا۔ وہ ویزا بنوا کر انڈیا واپس
چلی گئیں۔ اور اب کبھی نہ آئیں گی۔"

"یہ کیسے ——؟" میں نے ذرا بے پروائی سے پوچھا۔ اور ان کے لیے
چائے کا پانی اسٹوو پر رکھ دیا۔

"بات یہ ہوئی کہ میں نے انھیں طلاق دے دی۔ ان کی زبان بہت بڑھ گئی
تھی۔ ہر وقت ٹر ٹر —— ٹر ٹر ——" پھر انھوں نے سامنے کے کھرّے پلنگ پر
بیٹھ کر خالص شوہروں والے انداز میں بیوی کے خلاف شکایات کا ایک دفتر کھول دیا
اور خود کو بے قصور اور حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف رہے۔
میں بے پروائی سے یہ ساری کتھا سُنا کی۔ زندگی کی ہر بات اس قدر بے رنگ،
غیر اہم، غیر ضروری اور بے معنی تھی ——!

کچھ عرصے بعد وہ میرے یہاں آکر بڑبڑائے:
"نوکروں نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ کبھی اتنا بھی تم سے نہیں ہوتا کہ آکر
ذرا بھائی کے گھر کی حالت ہی درست کر جاؤ۔ نوکروں کے کان اینٹھو۔ میں اسکول بھی

چلاؤں اور گھر بھی ——" انھوں نے اس انداز سے شکایتاً کہا گویا ان کے گھر کا انتظام کرنا میرا فرض تھا۔

چند روز بعد میں اپنا سامان باندھ کر وقار صاحب کے کمروں میں منتقل ہو گئی اور ناچ سکھانے کے لیے ان کی اسسٹنٹ بھی بن گئی۔

اس کے مہینے بھر بعد پچھلے اتوار کو وقار صاحب نے ایک مولوی بلوا کر اپنے دو چرکٹوں کی گواہی میں مجھ سے نکاح پڑھوالیا۔

اب میں دن بھر گھر کے کام میں مصروف رہتی ہوں —— میرا حُسن و جمال ماضی کی داستانوں میں شامل ہو چکا ہے۔ مجھے شور و شغف پارٹیاں ہنگامے مطلق پسند نہیں۔ لیکن گھر میں ہر وقت "چاچا" اور "کلپسو" اور "راک اینڈ رول" کا شور مچا رہتا ہے۔ بہر حال یہی میرا گھر ہے!

میرے پاس اس وقت کئی کالجوں میں کیمسٹری پڑھانے کے اَوفر ہیں مگر بھلا خانہ داری کے دھندوں سے کہیں فرصت ملتی ہے۔ نوکروں کا یہ حال ہے کہ آج رکھو' کل غائب۔ میں نے زیادہ کی تمنّا کبھی نہیں کی۔ صرف اتنا ہی چاہا کہ ایک اوسط درجے کی کوٹھی ہو۔ سواری کے لیے موٹر۔ تاکہ آرام سے ہر جگہ آجا سکیں۔ ہم چشموں میں بے عزتی نہ ہو۔ چار ملنے والے آئیں تو بٹھانے کے لیے قرینے کا ٹھکانہ ہو' اور بس!

اس وقت ہماری ڈیڑھ دو ہزار ماہوار آمدنی ہے جو دو میاں بیوی کے لیے ضرورت سے کہیں زیادہ ہے۔ انسان اپنی قسمت پر قانع ہو جائے تو سارے دکھ آپ سے آپ مٹ جاتے ہیں۔

شادی کر لینے کے بعد لڑکی کے سر کے اوپر چھپت سی پڑ جاتی ہے۔ آج کل کی لڑکیاں جانے کس رَو میں بہہ رہی ہیں۔ کس طرح یہ لوگ ہاتھوں سے نکل جاتی ہیں۔ جتنا سوچوں' عجیب سا لگتا ہے اور حیرت ہوتی ہے۔

میں نے تو کبھی کسی سے فلرٹ تک نہ کیا۔ خوشوقت، فاروق اور اس سیاہ فام پوزاد کے علاوہ جو میرا شوہر ہے، میں کسی چوتھے آدمی سے واقف نہیں۔ میں شدید بدمعاش تو نہیں تھی، نہ معلوم میں کیا تھی اور کیا ہوں ——— ریحانہ، سعدیہ، پربھا اور یہ لڑکی جس کی آنکھوں میں مجھے دیکھ کر دہشت پیدا ہوئی، شاید وہ مجھ سے زیادہ اچھی طرح مجھ سے واقف ہوں۔

اب خوشوقت کو یاد کرنے کا فائدہ ——— ؟ وقت گزر چکا۔ جانے اب تک وہ بریگیڈیر میجر جنرل بن چکا ہو، آسام کی سرحد پر چینیوں کے خلاف مورچہ لگائے بیٹھا ہو، یا ہندستان کی کسی ہری بھری چھاؤنی کے میس میں بیٹھا مونچھوں پر تاؤ دے رہا ہو، اور مسکراتا ہو، شاید وہ کب کا کشمیر کے محاذ پر مارا جا چکا ہو، کیا معلوم!

اندھیری راتوں میں میں آنکھیں کھولے چپ چاپ پڑی رہتی ہوں۔ سائنس نے مجھے عالمِ موجودات کے بہت سے رازوں سے واقف کر دیا ہے۔ میں نے کیمسٹری پر ان گنت کتابیں پڑھی ہیں۔ پہروں سوچا ہے، پر مجھے بڑا ڈر لگتا ہے ——— اندھیری راتوں میں مجھے بڑا ڈر لگتا ہے!

خوش وقت سنگھ! ——— خوش وقت سنگھ! تمھیں اب مجھ سے مطلب؟

ہاؤسنگ سوسائٹی

جنوری کی برفانی صبح کا کہرا درختوں پر سے چھٹنے لگا۔ دور گومتی کے اس پار ریت کے ٹیلوں کے پیچھے سورج نکل آیا تھا اور ندی کے ساحل پر بکھری ہوئی سیپیاں چمکنے لگی تھیں۔ شبّرو اشتیلیچی باورچی خانے کی چھولداری کے آگے، نم زمین پر اکڑوں بیٹھا سیاہ مسالے والی لمبی تختی پر نہایت فراٹے سے چھریاں صاف کر کر کے ایک طرف کو ڈھیر لگاتا جا رہا تھا اور سردی کم کرنے کے لیے گانے میں مصروف تھا ؎

تجلّی طور کی موسیٰ کلیما بن کے نکلیں گے
محمدؐ مصطفٰے محشر میں دولہا بن کے نکلیں گے

پھر اس نے دوسری قوالی شروع کی ؎

دیکھنا ساکی گھٹا گل جار پر چھائی نہ ہو

باپ رے باپ! ــــــ اتنا بڑا جاڑا ــــــ" دوارکا پرشاد "مخادیم"

نے چپراسیوں کی چھولداری میں سے نکل کر اظہارِ خیال کیا ـــــ
"آج آدمی رات تک کی دلیل ہو ہیئے ـــــ" شبروا نے جواب دیا'
اور چھریاں چمکانے میں جُٹا رہا۔
امرِیوں کے دھندلکے میں سے دو ہیولے نمودار ہوتے۔ کہر آلود فضا میں سورج کی کرنوں کا چوڑا راستہ بن گیا جو سورج سے شروع ہوکر عین شبروا کے سر پر آن کے ختم ہو رہا تھا۔ کرنوں کی زد میں آنکھیں میچتے ہوئے اس نے آگے آگے آتے ہوئے آدمی کو ذرا بلندی سے آواز دی ـــــ "بندگی ـــــ سلاما ئے کُم ـــــ"
اور دوارکا پرشاد سے مخاطب ہوا ـــــ "بڑے سبیرے سبیرے ڈالی لائے ہیں"
سیّد مظہر علی جھینگا پاسی کے سر پر مرغیوں کا جھوّا اٹھوائے نزدیک آ گئے ـــ خشک میوے اور تازہ پھلوں کی کنڈیاں انھوں نے خود اٹھا رکھی تھیں۔
دوارکا پرشاد انگوچھا کندھے پر ڈالتے کافی لمبا فاصلہ طے کر کے میم صاحب کے خیمے پر گئے اور باہر سے کہا ـــــ "حجور ـــــ کوئی جنے ڈالی لائے ہیں"
"واپس کر دو ـــــ!" اندر سے آواز آئی۔
چند منٹ بعد دوارکا پرشاد پھر خیمے میں گئے ـــــ "میم صاحب او کہت ہیں کی ـــــ"
"ٹھیک ہے ـــــ ٹھیک ہے ـــــ ہمارا سلام دوا اور ڈالی لوٹا دو ـــ!"
دوارکا پرشاد نے واپس آکر میم صاحب کے الفاظ دہرا دیے۔
"اچھا ـــــ!" سید مظہر علی نے مزید اصرار نہیں کیا اور سر جھکائے گاؤں کی سمت لوٹ گئے۔ انھوں نے سوتی اچکن پر گاڑھے کی چادر کا بُکّل مارا ہوا تھا۔ اور کنٹوپ پہن رکھا تھا اور ادھوڑی کے جوتوں کے ساتھ ہاتھ سے بُنے ہوئے سُرخ موزے پہنے تھے جن کی ایڑیاں نکل چکی تھیں۔ ان کے پیچھے پیچھے بڑا سا جھوّا سر پر اُٹھائے

جھینگا پاسی اُچکتا اور لنگڑاتا ہوا تیز تیز چلتا شبروا کو بہت قابلِ رحم سا معلوم ہوا۔ دونوں آدمی بہت قابلِ رحم معلوم ہوتے۔ اس نے تختی پر پوڈر چھڑکا اور "راجا ہریش چندر" نوٹنکی کی "چیز" الاپنے میں مصروف ہوگیا:

"ہم محلن کے باسی رے پنڈت
کت تک دُور توری کاسی۔ کِت تک دُور ——"

سورج کی روشنی تیز ہوئی۔ کیمپ میں چہل پہل شروع ہوگئی۔ آم کے باغ میں اجلاس لگ گیا۔ دور دور تک کھیت کی منڈیروں کے ساتھ ساتھ یکّے، ادّھے، بہلیاں اور سائکلیں کھڑی تھیں۔ اہلکار، عرضی نویس، محرّر، کسان، زمیندار، گواہ، موکّل درختوں کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ دو کہار ایک ڈولی اٹھائے اجلاس کی سمت آئے۔ ڈولی درخت کے نیچے رکھ دی گئی، اس کے اندر بیٹھی ہوئی عورت آہستہ آہستہ رونے لگی۔ مقدمے کی سماعت کا آغاز ہوا۔ عورت نے اپنا بیان دیا۔ پھر وہ سسکیاں بھر بھر کے رونے لگی۔

دوپہر ہوگئی —— شیشم کے جھنڈ میں سے ایک ہاتھی نمودار ہوا اور جھومتا جھامتا کیمپ کی جانب بڑھا۔ وسط کے بڑے خیمے کے سامنے پیادے نے نیچے اُتر کر دوارکا پرشاد کو آواز دی۔ دوارکا پرشاد پھر میم صاحب کے خیمے کی طرف لپکے۔

"نواب شمس آرا بیگم کا ہاتھی آوا ہے —— چھوٹی بٹیا کھاطر ——"

"واپس کردو ——!" میم صاحب نے حسبِ معمول جواب دیا۔ وہ اس وقت خیمے کے عقب میں آرام کرسی پر بیٹھی اپنے بیٹے کو الٰہ آباد خط لکھ رہی تھی۔ چھوٹی بٹیا دوسرے خیمے سے تیر کی طرح نکلیں "ماما —— ماما —— ماما ——!" انھوں

نے دہاڑنا شروع کیا ——— "ہم تو جمبو پر ضرور چڑھیں گے ——— ہم تو جمبو کو امرود کھلائیں گے ——— ماما ——— !" اتنا کہہ کر وہ زمین پر لوٹ گئیں

"اچھا ——— اچھا ——— جاؤ ——— مٹی میں مت لوٹو ——— !" میم صاحب نے جھنجھلا کر جواب دیا اور خط لکھنے میں منہمک ہو گئیں۔

چھوٹی بٹیا نے جھک کر اپنی سرخ جوتیوں کے بکل بند کیے اور گود میں اٹھائے جانے کے لیے دوارکا پرشاد کی طرف ہاتھ اٹھا دیے۔ مدار بخش خدمت گار نے جلدی سے پھول دار ریشمی چھتری لا کر دی۔ مہاوت نے ہاتھی کو گھٹنوں کے بل بٹھایا۔ دوارکا پرشاد بٹیا کو گود میں لے کر ہودے میں فروکش ہو گئے اور اپنی بڑی بڑی سفید مونچھوں پر بڑے وقار سے ہاتھ پھیرا۔ وہ کلکٹر صاحب کے چپراسی تھے۔ کوئی مذاق تھوڑا ہی تھا۔ نواب شمس آرا بیگم کا پیادہ ان سے بہت مرعوب نظر آرہا تھا۔ گھسی ہوئی زربفت کی جھول اور منقش ہودے والا ہاتھی اجلاس کے سامنے سے گزرتا پاربتی پور کی گڑھی کی سمت روانہ ہوا۔

عدالت میں ڈولی کے اندر سے پردہ نشین بی بی کی فریاد جاری رہی۔ ڈولی کے پیچھے تین طرف چھوٹی سی قنات لگا دی گئی تھی۔ قنات کے اندر ایک چودہ پندرہ سالہ لڑکی ہری چھینٹ کا تنگ پاجامہ پہنے، گلابی ململ کا دوپٹا سر سے لپیٹے زمین پر اکڑوں بیٹھی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے ڈولی کا پردہ پکڑ رکھا تھا اور دوسرے سے زمین پر لکیریں کھینچ رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ سہمی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگتی تھی۔ باہر اجلاس میں اس کا نام بار بار لیا جا رہا تھا۔ قنات کی درز میں سے جھانک کر اس نے باہر دیکھا۔ سامنے سے ہاتھی گزر رہا تھا۔ اس پر سنہرے بالوں والی ایک بہت چھوٹی سی بچی سوار تھی۔ بچی نے بھالو کی کھال ایسا بڑے بڑے بالوں والا کوٹ پہن رکھا تھا اور ایک سفید مونچھوں والے وردی

پوش بڑے میاں نے رنگ برنگی جھنڈی سے اس پر سایہ کر رکھا تھا - بالکل جیسے پریوں کی کہانیوں میں ہوتا ہے - ڈولی کے پاس بیٹھی ہوئی لڑکی حیرت سے جھانکتی رہی - یہاں تک کہ ہاتھی نظروں سے اوجھل ہوگیا - وہ سر جھکا کر گیلی مٹی پر انگلی سے تصویریں بنانے میں دوبارہ مشغول ہوگئی - اب کے سے اس نے ہاتھی کی تصویر بنائی - اس پر ہودے کی چار لکیریں کھینچیں اور اس میں تاج پہنے ہوئے شہزادی بٹھال دی - اس نے اپنے آپ سے کہا ——— "یہ شہزادی میں خود ہوں ——— میں بسنتی بیگم ——— !"

"مسماۃ ثریا سلطان عرف بسنتی بیگم نابالغ ———" عدالت میں اس کا نام پھر لیا جا رہا تھا - اس نے سہم کر ڈولی کا پردہ مضبوطی سے پکڑ لیا -

ہاتھی گانو سے باہر نکلا - آبادی کے سرے پر صدیوں پرانی خانقاہ تھی اور باؤلی ——— اور اس سے آگے بڑھ کر مخدوم زادہ شاہ منوّر علی کا مکان تھا - ہاتھی مکان کے برابر کی گلی میں سے گزرا - ہودے میں سے چھوٹی بٹیا کو مکان کا کچا آنگن نظر آیا جس میں لمبی سیاہ داڑھی اور سیاہ کاکلوں والے ایک بزرگ نارنجی رنگ کی کفنی پہنے ایک کھاٹ پر بیٹھے آسمان کو تک رہے تھے ——— کھچڑی داڑھی اور اداس شکل والے ایک اور بزرگ مونڈھے پر بیٹھے تھے - امرود کے پیڑ کے نیچے ایک لڑکی سرخ رنگ کا تنگ پاجامہ پہنے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے مسالہ پیس رہی تھی - اس نے چاندی کی میلی میلی چوڑیاں پہن رکھی تھیں - ہاتھی آگے بڑھ گیا -

دھوپ تیز ہوگئی۔ اجلاس لنچ کے لیے برخاست ہوا۔ لالہ حُسین بخش منصدی نے وہ مسل لپیٹی جس میں مسماۃ بُوٹا بیگم مدعیہ کی درخواست منسلک تھی۔

"منکہ مسماۃ بُوٹا بیگم، بالغ، قوم مسلمان، ذات سیّد، سکنہ موضع محمد گنج، تحصیل ہرونی ضلع سلطان پور، بیوہ سیّد زوّار حسینؒ جنت آرام گاہ، کاشت کار موضع ہذا کی ہوں۔ عرصہ تین سال کا ہوا، فدویہ کی اکلوتی دختر سیدہ ثریّا سلطان عرف بسنتی بیگم کے واسطے، جس کو اللہ تعالیٰ جل شانہ نے بہ طفیل جناب بتول پاک علیہ السلام دولتِ حسنِ صورت و سیرت و عصمت سے مالامال کیا ہے ۔۔ نواب سکندر قلی خان عرف نواب بھُورے تعلقہ دار بہرولی دردرگاہ کنڈ نے خواہش کتخدائی کی ظاہر کی۔ فدویہ نے پیغام نامنظور کیا۔ کس واسطے کہ نواب صاحب موصوف باوجود کثیر تعداد ازدواج منکوحہ ممنوعہ وغیر ممنوعہ ہونے کے بعمر پینسٹھ سال ازحد عادی جملہ فسق و فجور و لہو لعب کے ہیں۔ بعد چند روز مورخہ ۲۲ فروری ۱۹۳۷ء چار گھڑی رات گئے بذریعہ پیادگان مسلح اغوا بسنتی بیگم سلمہا بعمر ساڑھے تیرہ سال عمل میں آیا اور اس بانوئے معصوم و عفیفہ کو گڑھی درگاہ کنڈ میں قید کر دیا گیا۔ نواب شمس آرا بیگم تعلقہ دار پاربتی پور اس وقت تک فدویہ سے بہت موافق تھیں کس واسطے کہ ممدوحہ نے بعالم طفولت فدویہ سے درس قرآن حکیم لیا تھا اور فدویہ گڑھی پاربتی پور میں آنوجی کے عہدے پر مُدت مدید تک منصوب رہی تھی۔ علاوہ ازیں شوہر فدویہ کا گڑھی کے ذاکروں میں اسم تھا اور وہ مرحوم اخیر ایامِ زندگی تک باوجود فتور بصارت امام باڑہ ممدوحہ میں سوز خوانی کرتے رہے تھے۔ لہٰذا بیگم صاحبہ دام اقبالہا نے از طرف فدویہ رجوع عدالت کیا اور مقدمہ فوجداری واغوا نواب بھُورے پر

داخل کر دیا کہ مابین تعلقہ ہائے ممدوحہ و نواب صاحب پشت ہا پشت سے سلسلہ مقدمہ بازی بہ وجوہ گوناگوں جاری ہے۔

بعد چند روز بوقت نصف شب نقاب پوش ڈاکوؤں نے غریب خانہ میں کود کر فدویہ کے دُرِّ یتیم سید کرار حسین سلمہٗ کو بعمر اٹھارہ سال گنڈاسوں سے شہید کر دیا اور غائب ہو گئے۔

بعد ازاں عدالت حاکم پرگنہ کے روبرو میاں نوروز صاحبزادہ نواب شمس آرا بیگم نے بیان دیا ——— ازبسکہ بوجہ اس شغلہ جدید ورخنہ و فتنۂ ثانی کے یہ امراب از حد نازک و پیچیدہ ہو چکا ہے۔ بحکم جناب خلائق پناہ مسٹر رام برن بھارگوا حاکم پرگنہ مسماۃ بسنتی بیگم بذریعہ پولس گڑھی درگا کنڈ سے نکال کر میری تحویل میں دے دی گئی۔ مگر اب طاقت میاں نوروز کے دعوے باطل کے مقابلے کی اس اجل گرفتہ میں نہیں ہے اور فدویہ بحالت افلاس دلاچاری دبے کسی و اضطرار و اندوہ شدید حضور کیواں قدر نوشیرواں وقت ہمایوں شکوہ جناب کلکٹر صاحب بہادر سے فریادی ہے کہ مزید ابواب فساد و آتش افروزی اس ضمن میں بحکم خاص بند فرما دیں اور یہ امر کہ اعانت ارباب استحقاق کی منظور نظر فیض منظر ہے باعث ثواب وحسنات اور زیادتی نام ونشان آپ کا ہووے گا۔

دیگر عرض یہ ہے کہ گواہی میں فدویہ در ایں حالات پُر آشوب فقط سید مظہر علی کاشت کار ساکنہ محمد گنج کو پیش کر سکتی ہے جو گو کہ رعیت نواب شمس آرا بیگم کی ہیں لیکن بکمال صفائے باطن ———

دھوپ اب اُتر کر صحن کی دیوار پر آ چکی تھی۔ سید مظہر علی اپنے کھیتوں کا ایک

چکر لگا کر پھر مونڈھے پر آن بیٹھے۔ ان کے بڑے بھائی شاہ منور علی مدینہ اخبار سے منہ ڈھانپ کر کھاٹ پر لیٹ گئے۔ سید مظہر علی کی بی بی نے دن بھر دھوپ میں سرخ مرچیں سکھائی تھیں۔ جن کی دھانس سے سید مظہر علی کو دو تین چھینکیں آئیں جھینگا پاسی کی عورت دہلیز میں بیٹھ کر منظور النسا کی سر میں جوئیں دیکھنے لگی۔ منظور النساء کے سُرخ ٹول کے تنگ پاجامے کے پائینچے کیچڑ میں سنے ہوئے تھے کیونکہ وہ دن بھر اُسارے کے سامنے گیلی مٹی سے گھروندے بناتی رہی تھی۔

شاہ منور علی بے چینی سے اُٹھے ——— "اللہ غنی ——— !" انھوں نے زور سے نعرہ لگایا۔ مرغیاں کٹ کٹ کرنے لگیں۔ ڈیوڑھی کے دروازے کی کنڈی کھڑکی اور سید اختر علی اندر داخل ہوئے۔

"بھیا لوٹ آئے تحصیل سے ——— ؟" سید مظہر علی کی بی بی نے کہا۔

"السلام علیکم ——— !" نو وارد نے اپنے دونوں بڑے بھائیوں کو ذرا زور سے مخاطب کیا۔

"وعلیکم السلام! جیتے رہو ——— !" سید مظہر علی نے کہا۔ سید اختر علی نے صحن کے کونے میں رکھے ہوئے مرغیوں کے جھابے پر نظر ڈالی۔

"میم صاحب نے ڈالی واپس کر دی۔" سید مظہر علی نے کہا۔

"پُورے دس روپے اشرفی لال سے اُدھار لے کر ای ڈالی بے گئے رہے تمہری خاطر۔" بھاوج نے ٹاٹ پر سے مرچیں بٹورتے ہوئے فریاداً کہا۔

"ہمارے کام کا کیا ہوا ——— ؟" سید اختر علی نے ذرا ناگواری سے پوچھا

"ہم ٹھاکر صاحب کا سفارشی خط لے کر اجلاس سے قبل کلکٹر صاحب سے ملے تھے۔ انھوں نے کہا۔ ہمیں سفارش کی کوئی ضرورت نہیں۔ لکھنؤ درخواست بھجوا دیجیے۔ ہم جانسن صاحب سے بات کریں گے۔"

"جانسن صاحب شام کو پہنچیں گے۔ کل سویرے ہی شکار کے لیے چلے جائیں گے ہم کیمپ سے سب معلوم کرتے آتے ہیں۔ دو روپے لالہ حسین بخش کی نذر کیے۔"

"میم صاحب انگریز ہیں نا ——— ؟" سید مظہر علی نے دریافت کیا۔

"دادا انگریز تھے۔ مرزا پور میں نیل کی کاشت کرتے تھے۔ نواب صاحب وکرم پور کی لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ کلکٹر صاحب بہار کے کسی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں۔ میم صاحب کو میکے سے زمینداری ملی ہے۔ الہ آباد اور مسوری میں کوٹھیاں ہیں۔ دو لڑکے ہیں[1] ———" سید اختر علی نے جواب دیا۔

"اللہ کی شان ہے۔ وہ پاک پروردگار بعضے لوگن کو دنیا کی ہر نیامت عطا کرت ہے ———" بھاوج نے سوپ میں ارہر کی دال پھٹکتے ہوئے قناعت سے اظہارِ خیال کیا——— خاموشی چھا گئی

"خداوند تعالیٰ عاشق کو بہت لمبی جایداد عطا کرتا ہے۔ صبر کی جایداد ———" شاہ منور علی نے دفعتاً کہا اور اُٹھ کر باہر چلے گئے اور سنسان گلی میں سے گزرتے درگاہ کی منڈیر پر جا بیٹھے۔

"بھائی صاحب نے بھی تمھارے لیے اتنے چلے کھینچے ——— کچھ نہ ہوا۔" سید مظہر علی نے آہستہ سے کہا ——— "پچھلے چھ مہینے تک گومتی کنارے کٹی میں پڑے رہے۔ چلّے کے جاڑے تھے نمونیہ ہو گیا۔ منظور ریا حقّہ لے آؤ بٹیا ———!" اُنھوں نے لڑکی کو آواز دی۔ اس نے حقّہ تازہ کر کے باپ کے سامنے لا رکھا۔ سید مظہر علی نے جو بڑے بھائی کے سامنے حقّہ نہ پیتے تھے اب ایک کش لگایا۔ اور بات جاری رکھی ——— "ہم بہت ہاتھ پیر جوڑ کر گھر واپس لائے آج کل

---

[1] 'لڑکے' پورب اور اودھ میں اولاد کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

جناتوں کو قابو کرنے کا عمل کر رہے ہیں ——— ہم نے کلکٹر صاحب سے تمہارے لیے کہا کہ ہمارا چھوٹا بھائی وکیل ہے مگر قسمت کا ہیٹا ہے۔ ضلع کچہری میں وکالت کی، وہاں نہیں چلی۔ کانپور میں پریکٹس شروع کی، وہاں فاقوں کی نوبت آگئی۔ اپنے لڑکوں کو اعلا تعلیم دلوانا چاہتا ہے۔ سنا ہے لکھنؤ سکنڈ صاحب کے دفتر میں ایک ملازمت خالی ہوئی ہے۔ اگر حضور کرم گستری فرما کر اس کی سفارش کر دیں۔ وہ کہنے لگے۔ سیّد صاحب! ہم کس قابل ہیں۔ اللہ پر بھروسا رکھیے۔ وہ دیر یا سویر سب کی سنتا ہے۔"

"اب ہم تیرہ تیزی کے مہینے میں سندیلے جاتے کے شاہ مدار کے مزار پر چادر چڑھیں گے۔ بچے تم کا نوکری ملیہے ———" بھاوج نے سوپ دیوار پر ٹانگتے ہوئے کہا ———

سید اختر علی نے بیزاری سے بھاوج کو دیکھا اور گھڑونچی کی سمت نظر دوڑائی۔ بھاوج لپک کر گئیں اور جگر جگر کرتے مراد آبادی کٹورے میں گھڑے سے یخ ٹھنڈا پانی انڈیل کر دیور کو پیش کیا۔ وہ دیور سے ماں کی طرح محبت کرتی تھیں۔

سید مظہر علی نے دو پلی ٹوپی سر پر رکھی اور کھڑاؤں پہن کر عصر کی نماز کے لیے مسجد چلے گئے۔ سید اختر علی نے مدینہ اخبار اٹھا کر حقے کی نے اپنی طرف کر لی کیونکہ وہ بھی بڑے بھائی کے سامنے حقہ نہیں پیتے تھے۔ دور درگاہ کے منڈیر پر سے شاہ منور علی نے یا بدوح کا دل ہلا دینے والا نعرہ بلند کیا۔ اس وقت اس مکان اور اس فضا پر ایسی اداسی طاری تھی کہ کلیجہ پھٹتا تھا۔

باہر باڈلی کے نزدیک نیم تلے بھیڑ جمی تھی۔ نواب بھورے کا بھتیجا منّن خاں جو ڈاکوؤں میں مل گیا تھا۔ بستی کے چند بے فکروں کے ساتھ بیٹھا چوسر کھیل رہا تھا اور پاسا پھینکتے ہوئے بار بار جمشید کو چڑا رہا تھا ۔۔

مرغانِ چمن دیتے ہیں جا جبیل میں انڈے
مختار لوگ دیتے ہیں تعطیل میں انڈے

جمشید علی ایک طرف کو اُکڑوں بیٹھا بے دلی سے کھیل دیکھ رہا تھا جب مُمتن خاں نے تین چار بار اس کے باپ کی بے روزگاری پر اس طرح چوٹ کی تو غم و غصے سے بھنا کر اس نے مُمتن کو ایک تھپڑ رسید کیا، بساط الٹ دی اور باؤلی کی نالیاں پھلانگ کر لمبے لمبے قدم رکھتا خانقاہ کی طرف چلا گیا۔

کھنڈر کے پیچھے چھپ کر اس نے چھنگلیا سے پلکیں خشک کیں اور سامنے دیکھنے لگا۔ نرکٹ کی باڑ کے پیچھے قبرستان تھا جس میں ادھر ادھر روئی کے چند پیڑ کھڑے تھے اور روئی کے سفید سفید پھول سارے میں بکھرے ہوئے تھے۔ قبروں کے چاروں طرف اونچی اونچی گھاس تھی اور خار دار جھاڑیاں۔ اور ناگ پھنی اور کروندے اور تھوہر کے پودے۔ چھوٹے چھوٹے گہرے گہرے غار، ببول کے درخت، مٹی کی ڈھیریاں۔ سانپ کے بل۔ سفیدی سے لپے پتے مزار، کچی قبریں، دور کونے میں شیشم کے نیچے مجاور اور گورکن کے کچے گھر کھڑے تھے۔ گورکن کی بیوی نے رات کے کھانے کے لیے چولھا سلگا دیا تھا اور کہرے کو لپیٹتا ہوا دھواں آہستہ آہستہ اوپر اٹھ رہا تھا۔ ایک گوشے میں تین چار ٹوٹے ہوئے گھڑے بکھرے پڑے تھے ——— ایک قبر پر کسی نے چراغ جلا دیا تھا اور اس کی لَو سے کتبے کا طاقچہ سیاہ ہو چکا تھا۔ سڑک کی رُخ والی منڈیر کے نیچے چنبیلی کی خود رو جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ دو چرواہنیں اپنی بکریوں کو ہنکا کر گھر لے جاتی ہوئی ادھر سے گزریں اور چنبیلی کے سائے میں بنی ہوئی ایک نئی قبر کو دیکھ کر ایک چرواہن نے کہا ——— "سہاگن کی قبر ہے۔ جبھی چنبیلی رات کو ایسی مہکتی ہے ———!"
شام کے سناٹے میں سرد ہوا قبر پر جھکی بیری کی ٹہنیوں میں سرسرانے لگی۔

جمشید کو ڈر سا لگا۔ اس نے چپل جھٹک کر تلوے کے نیچے سے ایک کنکری نکالی اور مٹی کے تودوں اور اینٹوں کو پھلانگتا کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ شاید مہاوٹیں برسنے والی تھیں۔ آسمان پر بادل چھا گئے تھے۔ جمشید بغلوں میں ہاتھ دیے سوں سوں کرتا بہت دیر تک منڈیروں پر گھومتا رہا۔ ہاتھی پار بنی پور کی گڑھی کی طرف سے واپس آ رہا تھا۔ تالاب کے کنارے گولر کے نیچے کھڑے ہو کر جمشید نے بڑی دلچسپی سے ہاتھی کو دیکھا اور اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

چھوٹی بٹیا ہودے میں بیٹھی دوارکا پرشاد سے نل دمینتی کا قصہ سننے میں اس قدر محو تھیں کہ ان کی سرخ چھتری ان کے ہاتھ سے پھسل کر زمین پر گر گئی —

ہاتھی آگے بڑھ گیا۔

جمشید نے نقرئی موٹھ والی رنگ برنگی ریشمی چھتری زمین پر سے اٹھالی۔ اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اس نے مہاوت کو آواز دی مگر ہاتھی بڑھل کے درختوں میں غائب ہو چکا تھا۔ وہ چھتری ہاتھ میں لیے لیے گھر لوٹ آیا۔ صحن کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے چھتری بیٹھک کے ایک کونے میں کھڑی کر دی اور چکر لگا کر ڈیوڑھی کی طرف پہنچا۔ چپلیں اتار کر ان کی گرد جھاڑی۔ ان کو دیوار پر رکھا اور پھر ایک پاؤں تاند پر ٹکا کر آنگن میں کود گیا۔

اس کے تینوں او اس شکلوں والے بزرگ، بڑے ابا، چچا ابا اور ابا دالان میں تخت پر حسب معمول سر جھکائے بیٹھے تھے۔ چچی دال میں بگھار لگا رہی تھیں چچا ابا کی لڑکی منظور النسا بلا وجہ اچھلتی کودتی پھر رہی تھی اور زور زور سے الاپ رہی تھی ——

"ڈنڈا ہرا بیا گلی رووت ہے
ڈنڈے کی ماں روٹی پووت ہے"

اتنے میں مچی باورچی خانے سے نکلیں اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور زور کا تمانچہ لگایا ——— "جب دیکھو تب کھیل ——— اتنی بڑی ہو گئی جب دیکھو تب گدکڑے ——— دونوں وقت مِلت ہیں۔ اپنے ابا کے وضو کا پانی لگا ———"

منظور النسا بھائیں بھائیں کرکے رونے لگی اور پناہ لینے کے لیے باہیں پھیلا کر اپنے چچازاد بھائی کی طرف دوڑی جو اسی وقت دیوار پر سے اندر کودا تھا۔ جمشید نے بے پروائی سے اپنے چپل دیوار پر سے اتار کر اسے تھما دیے۔

"جا انھیں کوٹھری میں رکھ آ ———" اس نے لڑکی سے کہا منظور النسا نے فوراً رونا بند کر دیا اور گرد آلود بڑے بڑے چپلوں کو بڑے پیار سے باہوں میں سنبھالا۔ گویا وہ اس کی چہیتی گڑیاں تھیں اور اندر چلی گئی۔

جمشید مونڈھا کھینچ کر اپنے بزرگوں کے قریب بیٹھ گیا۔ جھینگا پاسی کی عورت سایبان میں سے گابے کھول کر ناند کی طرف لے جا رہی تھی۔ باہر گاؤں کے گھروں میں چراغ جل چکے تھے۔ سید مظہر علی کی بی بی نے دالان میں آکر روئی کے پردے چھوڑ دیے۔ مغرب کی اذان ہوئی ——— اندھیرا چھا گیا۔

شبروا مشعلچی نے سارے خیموں میں جا جا کر گیس کے ہنڈے۔ لیمپ اور لالٹینیں جمع کیں۔ ان کو باورچی خانے کی چھولداری کے سامنے لا کر ایک قطار میں رکھا۔ مدار بخش خدمت گار آئے اور اس قطار کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے اور انھوں نے جھاڑن سے شیڈ اور چمنیاں صاف کرنی شروع کیں۔ چھوٹی بٹیا ایک طرف سے اچھلتی کودتی آئیں اور اکڑوں بیٹھ کر بڑی دلچسپی سے یہ تماشا

دیکھنے لگیں۔ ان کو ہر شام یہ تماشا دیکھنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔
مدار بخش نے چمنیاں صاف کرنے کے بعد بتیاں روشن کرنا شروع کیں اور ہمیشہ کی طرح پہلا لیمپ روشن کرتے ہوئے انھوں نے زیر لب کہا ——
"چراغ روشن مراد حاصل صلوٰۃ صلوٰۃ سلام آلیکم یا منکر نکیر۔
دل میرا ایمان قبر میرا مکان ——"
"مدار بخش تمھارا مکان قبر میں کیوں ہے؟" چھوٹی بٹیا نے ایک بار پھر حیرت سے اپنا سوال دہرایا۔
"شبیر —— ! بلاقن کو بھیجو —— جنم جلی نے ابھی تک استری گرم نہیں کی ہے ——" دور کے خیمے سے میم صاحب کی آواز آئی۔ چھوٹی بٹیا کو استری کا تماشا بھی بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ تیر کی طرح بھاگتی ادھر پہنچیں ——
"ماما —— ماما —— بلاقن جنم جلی کیوں ہے؟" انھوں نے دریافت کیا۔
"بھاگ جاؤ یہاں سے —— !"
"نہیں —— بتائیے نا —— ماما —— !"
"ئی وہ جنم جلی ——" میم صاحب نے غصّے سے جواب دیا۔ دراصل اس وقت وہ دوارکا پرشاد سے مخاطب تھیں۔
"ماں باپ کو کھا گئی۔ میاں نے دوسری عورت کر لی۔ گھر بارہ باٹ ہو گیا مگر وہ بختی بھی کیا کرے۔ سب کرموں کا پھل ہے۔"
"ماما —— ماما —— کرموں کا پھل کیا ہوتا ہے —— ؟"
"بٹیا چلیے آپ کو کمشنر صاحب آد کرتے ہیں —— !" دوسرے چپراسی نے اندر آکر کہا۔ وہ اسی تیز رفتاری سے خیمے سے باہر نکل گئیں۔
کیمپ میں اس رات بڑا بندوبست تھا۔ چاروں طرف گیس کے ہنڈے

جھک جھک کر رہے تھے۔ چھوٹی بٹیا کو آج خاص طور پر اجازت مل گئی تھی کہ وہ بڑوں کے ساتھ کھانا کھائیں وہ خیمہ طعام میں اپنی اونچی کرسی پر بیٹھی "انکل جانسن" کو جمبو کی سواری اور گڑھی پاربتی پور کے پالتو ہرنوں اور بارہ سنگھوں کا قصہ سنا رہی تھیں۔ عمر کے لحاظ سے چھوٹی بٹیا کا قد بہت چھوٹا تھا اس لیے وہ اونچی کرسی پر بیٹھ کر ہی میز کے برابر آسکتی تھیں۔ میز کے سرے پر میم صاحب سُورت کے روپہلی "پارسی" بارڈر والی پیازی ریشمی ساری اور وائٹ وے کلکتہ کے یہاں خریدا ہوا اوور کوٹ پہنے روسٹ کاٹنے میں مشغول تھیں۔ سنہری مائل کتھئی بالوں کے گچھے مروجہ فیشن کے مطابق ان کی پیشانی اور کانوں پر چھائے ہوئے تھے اور انھوں نے کانوں میں انگریزی وضع کے بُندے پہن رکھے تھے جس میں طلائی زنجیروں کے سرے پر دو بڑے بڑے موتی لٹک رہے تھے۔ جب میم صاحب دورانِ گفتگو میں سر ہلاتیں تو یہ بُندے گھڑیال کے پنڈولم کی طرح ہلتے۔ میم صاحب انگریز نژاد تھیں مگر انگریزی انھیں واجبی ہی آتی تھی اور شادی سے پہلے میکے میں سخت پردے میں ان کی پرورش ہوئی تھی لیکن ان کی سفید رنگت اور ذرا ولایتی چہرے مہرے کی وجہ سے نوکر چاکر انھیں 'بیگم صاحب' کے بجائے ادب دا کے میم صاحب کہنے پر مصر تھے۔

میز کے نیچے انگیٹھی دہک رہی تھی۔ پرال پر بچھی ہوئی دری پر ملازمین قابیں اٹھائے دبے پاؤں اِدھر سے اُدھر جا رہے تھے۔ میم صاحب جانسن صاحب کو بسنتی بیگم کے اغوا کا قصہ سنانے لگیں۔ جانسن صاحب بہت نفیس اردو بولتے تھے۔

"مگر نواب بھورے بھی ایک گھاگ ہیں۔ پرانے سیار۔ ان کا کاٹا پانی نہیں مانگتا۔ ہمیں بے چاری بوڑھا بیگم پر بڑا ترس معلوم ہوتا ہے ـــــــ" میم صاحب

نے جانسن صاحب سے کہا۔

جنوری کی رات کی یخ بستہ ہوا تیز ہو گئی۔ خیمے کی دیواریں ہلنے لگیں۔ سن سن کرتے گیس کی روشنی ذرا مدھم پڑی تو شبراتی نے پھرتی سے اس میں ہوا بھر دی۔ مدار بخش نے لپک کر آخری کورس کے لیے پلیٹیں بدلیں۔ جب انھوں نے ایک قاب جانسن صاحب کے آگے پیش کی۔ جانسن صاحب نے نفی میں سر ہلایا۔ مدار بخش نے بڑی متانت سے ان سے کہا —— "پھنش —— " یعنی فنش —— یعنی یہ آخری کورس ہے۔ مدار بخش پُرتکلف دعوتوں کے موقعوں پر انگریز مہمانوں سے ہمیشہ انگریزی بولتے تھے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے سے ان کے دادا پردادا صاحب لوگ کے بنگلوں پر بولتے آئے تھے۔

جانسن صاحب نے میزبان خاتون سے ڈنر سروس کی تعریف کی اور میم صاحب نے انھیں بتایا کہ یہ روسی برتن انھوں نے پشاور سے منگوائے تھے جہاں ۱۹۱۷ء کے انقلاب سے پہلے کے مشہور روسی برتنوں کی ایک دکان تھی۔ اس کے بعد جانسن صاحب نے کلکٹر صاحب سے کل کے شکار کے متعلق تبادلہ خیالات کیا۔

خیمے کی ایک دیوار ذرا زور سے ہلی اور درز میں سے دو متجسس، متحیر آنکھوں نے اندر جھانکا۔

جمشید نے ایک بار پھر ہمت کی کہ اندر جا کر چھتری میم صاحب کو دے دے لیکن ایک بار پھر اس الف لیلوی منظر میں کھو گیا۔

اب بلّوری پیالے میز پر لائے گئے جن کے پانی پر گلاب کی سُرخ پنکھڑیاں تیر رہی تھیں مگر ان لوگوں نے یہ پانی پینے کے بجائے پیالوں میں اپنی اپنی انگلیاں

ڈبو دیں۔

جمشید نے سنہرے بالوں والی بچی کو دیکھا جس کے عین مغز کے اوپر بڑا سا سرخ ربن سجا تھا اسے اپنی چچا زاد بہن منظور النساء یاد آئی جو کانوں کے بہت سارے سوراخوں میں چاندی کی میلی میلی بالیاں پہنتی تھی اور موٹی جھوٹی مارکین، ڈوریے اور گاڑھے کے خاک آلود کپڑوں میں بھٹکتی رہتی تھی اور بڑی ہو کر اس کے پلّے بندھے گی اور وہ دونوں کان پور کی ایک تنگ و تاریک گلی میں اسی سفید پوشی اور تنگ دستی کی زندگی گزار دیں گے جیسی زندگیاں ان کے باپ اور چچا اور دادا اور پردادا نے گزاری تھیں جب کہ میم صاحب اور کلکٹر صاحب اور ان کی برادری والے اسی طرح معطّر پانی کے بلوریں پیالوں میں نفاست سے اپنی انگلیاں ڈبوتے رہیں گے۔

دیوار کا پردہ ہلتا دیکھ کر مدار بخش اچانک اس طرف متوجہ ہوئے۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا۔

اندر جانسن صاحب نے سگار سلگایا۔ میزبانوں کو شب بخیر کہا۔ بچّی کو پیار کیا اور لڑکھڑاتا ہوا چمکیلا، سفید نیپکن میز پر رکھ کے کرسی سے اٹھے۔ دوارکا پرشاد نے باہر سے لپک کر دروازے کا پردہ اٹھایا۔ جانسن صاحب بے حد لمبے تڑنگے انگریز تھے۔ وہ سر خم کر کے دروازے سے نکلے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے اپنے خیمے کی طرف چلے گئے۔ دوارکا پرشاد سرخ بانات کی اچکن پہنے پھر دروازے کے پاس اپنے اسٹول پر آن بیٹھے انھوں نے جمشید کے پیروں کی چاپ سن لی اور آہٹ پر کان لگا دیے۔ "کون ہے ــــ ؟" انھوں نے ڈپٹ کر پوچھا۔ جمشید ہڑبڑا کر سرپٹ بھاگا۔ بھاگتے میں وہ خیمے کے رسّوں سے اُلجھ گیا۔ دوارکا پرشاد اور دوسرے چپراسیوں نے اسے پکڑ لیا۔ چور۔۔ چور۔۔ وہ سب چلّائے اور اس کے ہاتھ سے چھتری چھین لی۔

"چور ــــ سرؤ ــــ چوٹّے" دوارکا پرشاد نے جمشید کے منہ پر

زور سے تھپڑ رسید کیا۔

"ہم چور نہیں ہیں ———" اس نے بھنّا کر کہا اور اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو آ گئے——— "ہم بٹیا کی چھتری دینے آئے تھے۔ ہمیں تالاب کے کنارے پڑی ملی تھی۔"

"سرؤ——— ہم کا پڑھاوت ہو بے ایمان!" دوارکا پرشاد گرجے اور تین چار تمانچے اور لگا دیے۔

"مدار بخش ——— !" اندر سے میم صاحب نے آواز دی۔ مگر مدار بخش بھی موقع واردات پر پہنچ چکے تھے۔

چھوٹی بٹیا نے دروازے میں سے جھانکا——— "ماما ——— ماما ——— ماما دوارکا پرشاد نے چور پکڑا ہے"۔ انھوں نے بے حد خوش ہو کر کہا۔

"یہ کیا ہلّا ہو رہا ہے ——— ؟" میم صاحب نے دروازے میں آکر دریافت کیا۔ دفعتاً جمشید نے آنسو خشک کیے اور میم صاحب کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔

"ہم چور اور بے ایمان نہیں ہیں۔ ہم سید جمشید علی ہیں۔ ہم درگاہ شریف کے شاہ منوّر علی کے بھتیجے ہیں۔ ہمارے چچا سید مظہر علی صبح آپ کو سلام کرنے" پھر اس نے جلدی سے الفاظ تبدیل کیے ———"آپ سے ملنے آئے تھے مگر آپ نے اُن کو باہر ہی سے لوٹا دیا ———!"

"شاہ منوّر علی ———" میم صاحب نے ذرا دلچسپی سے دُہرایا ———

"شاہ منوّر علی۔ ہم نے ان کی شہرت سنی ہے۔ وہ جنّاتوں کو قبضے میں کرتے ہیں نا؟"

"بڑے ابّا کے قبضے میں کوئی جنّات نہیں ہیں مسلسل افلاس اور احساسِ محرومی سے ان کے دماغ پر اثر ہو گیا ہے ———" جمشید نے تلخی سے جواب دیا۔ سردی کی وجہ سے اس کے دانت بجنے لگے اور اس نے ایک سسکی بھری۔

"اندر آجاؤ ——— باہر کیوں کھڑے ہو ———" میم صاحب نے کہا ——— "مدار بخش پلیٹ لگاؤ ———"

"جی نہیں۔ میں کھانا گھر سے کھا کر آیا ہوں"

میم صاحب نے اس کی بدلتی رنگت دیکھی۔ انھیں اپنا بیٹا سلمان یاد آگیا جو اسی طرح غیور اور خوددار تھا۔

وہ خیمے کے اندر آکر دروازے کے پاس کھڑا ہو گیا۔

"بیٹا۔ جمشید بھیا کا شکریہ ادا کرو۔ یہ اتنی سردی میں تمھاری چھتری دینے آئے ہیں ——— !"

چھوٹی بٹیا نے چھتری سنبھال کر چھوٹی سی آواز میں "تھینک یو" کہا۔

"اب گڈ نائٹ کہو ———"

"گڈ نائٹ ——— !" اور اس کے بعد وہ مُلاقن کے ساتھ باہر چلی گئیں۔

"تمھاری نواب شمس آرا بیگم سے قرابت داری ہے نا؟" میم صاحب نے دریافت کیا۔

"جی نہیں! ——— چچا ابّا ان کی زمین جوتتے ہیں۔ راجاؤں اور نوابوں سے ہماری کوئی قرابت داری نہیں ہے"

میم صاحب چونکیں۔ لہجے کی یہ تلخی انھیں بہت مانوس سی معلوم ہوئی۔ ان کا لاڈلا بیٹا سلمان یونیورسٹی سے گھر آکر اپنے دوستوں کے ساتھ جانے کیا کیا اڑایا کرتا تھا۔ جاگیردار طبقہ۔ برطانوی استحصال۔ زرعی انقلاب۔ ناقابلِ فہم الفاظ اور اصطلاحات۔

"کہیں پڑھتے ہو ——— ؟"

"کان پور میں پڑھتے ہیں سکینڈ ایئر میں ———"

"شاباش!"

"اب اجازت دیجیے!"

"کافی تو پی لو"

کافی ـــــ؟ کافی اس نے آج تک نہ پی تھی ـــــ "جی نہیں ـــــ" اس نے مضبوطی سے جواب دیا۔ "ہمارا گھر گاؤں کے آخری سرے پر ہے۔ پہنچتے پہنچتے بہت دیر ہو جائے گی ـــــ اچھا آداب عرض"۔ اتنا کہہ کر وہ خیمے سے نکلا اور تاریکی میں غائب ہو گیا۔

گھر پہنچ کر وہ دبے پاؤں دالان میں داخل ہوا۔ برابر چھوٹے سے دالان میں برابر برابر چارپائیوں پر تینوں بھائی سو رہے تھے۔ چچی اماں اور منظور النسا دوسری طرف تخت پر فرخ آبادی چھاپے کے میلے میلے لحافوں سے منھ ڈھانپے خوابیدہ تھیں۔ وہ آہستہ سے جاکر اپنی کھاٹ پر گر گیا۔ اور پتلا سا لحاف اوپر تک کھینچ لیا۔ زیادہ سردی لگی تو الگنی پر ٹنگی ہوئی لوئی بھی لحاف پر ڈال لی اور ٹانگیں سکیڑ کے کروٹ کے بل گڑی مڑی ہو کر سو گیا۔

تہجد کے وقت شاہ منور علی اُٹھے۔ اندھیرے میں ٹٹولتے ٹٹولتے اس کے سرھانے آئے۔ کچھ پڑھ کر اس کے ماتھے پر دم کیا۔ اپنے تکیے کے نیچے سے نکال کر ایک تعویذ اس کے بازو پر باندھا اور پھر جاکر اپنی چارپائی پر پڑ رہے۔ اس کی آنکھ کھل گئی تھی مگر وہ دم سادھے لیٹا رہا۔ اور اس کا جی چاہا کہ خوب روئے۔ کچھ دیر بعد چچی اماں اٹھیں اور انھوں نے لالٹین جلائی۔ منظور النسا بھی فوراً اٹھ بیٹھی۔ دونوں ماں بیٹیاں دُلائیاں سر سے اوڑھ کر باورچی خانے کی طرف چلی گئیں اور وہاں انھوں نے جمشید کے سفر کے لیے ناشتہ تیار کرنا شروع کیا۔ وہ پھر اونگھنے لگا۔ صبح کاذب

کے وقت مرغ نے صحن کی دیوار پر جاکر اذان دی - وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا - اس کے پاس گھڑی نہیں تھی - اس نے جلدی سے اندھیری گھپ کوٹھڑی میں جاکر اپنا ٹین کا بکس نکالا - دری میں بستر لپیٹا اور در میں جاکر آہستہ سے آواز دی:

" منظوریا ——— ! ہمارے چپل کہاں ہیں ؟"

منظور النسا بھاگی بھاگی آئی - دالان کی دیوار پر ٹنگی ہوئی تیل کی ڈبیا روشن کی - مچان پر سے چپل اتارے - اس کا کوٹ لائی - کھونٹی پر سے اس کا مفلر اتار کر دیا منہ دھونے کے لیے گرم پانی لے کر آئی اور لوٹا اور بیسن دالانی تخت کے کنارے رکھ دی -

چچی اماں نے ناشتہ دان بھر کر تخت پر رکھا اور چائے بنانے کے لیے پھر باورچی خانے میں چلی گئیں۔

" بھیاّ ——— تمہرے لیے پوری ہم خود بنا وا ہے " منظور النسا نے کہا۔

" اچھا " ——— جمشید نے جوتوں کے فیتے باندھتے ہوتے ذرا محبت سے اسے دیکھا اور اس کا دل پسیج گیا — بے چاری — بے چاری ——— بدنصیب لڑکی ——— اس نے دل میں کہا۔

ڈیوڑھی پر آکر گوبندوا نے آواز لگائی - اس کے باپ اور چچا جاگ اٹھے۔ چچی نے اس کے بازو پر امام ضامن باندھا - وہ گوبندوا کے یکے پر بیٹھ کر ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔

چنے کے کھیتوں پر کہرا ڈولتا تھا اور چاند کی روشنی پھیکی پڑ چکی تھی - بہت دور کلکٹر صاحب کے کیمپ میں اکاّ دکاّ روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں - دریا پار سے ریل کی سیٹی کی آواز سنائی دی - آم کے باغات ، خانقاہ ، تالاب ، ہنومان جی کا مندر، جھینگا پاسی کا جھونپڑا ، بڑے ابا ، چچا ابا ، چچی اماں ، منظور النسا ——— یہ سالے

ہیوے پیچھے ہٹتے ہوتے ایک بڑے دھندلکے میں غائب ہو گئے۔ اس رات کیمپ سے واپس آکر اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ کان پور لوٹ کر جی توڑ کر محنت کرے گا۔ فرسٹ ڈویژن لائے گا۔ مقابلے کے امتحان پاس کرے گا۔ اور ایک دن اس کے نام کے آگے لکھا جائے گا —— ایس۔ جے۔ علی، آئی، سی۔ ایس ——

پھر جب میں محمد گنج آؤں گا تو کسان کہیں گے۔ جنٹ صاحب دورے پر آئے ہیں۔ جنٹ صاحب۔ کلکٹر صاحب۔ کمشنر صاحب۔ کچے راستے پر یکے کو زور کا دھچکا لگا۔ اس نے جلدی سے یکے کا ڈنڈا پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے کوٹ کی جیب میں سے پاسنگ شو کی ڈبیا اور ماچس نکالی۔ جب اس نے ماچس جلائی تو گوبندوا نے مڑ کر اسے دیکھا۔

" ای کا کرت ہو —— ؟ " اس نے صدمے سے کہا۔

" گھر پہ نہ بتانا گوبند چاچا —— ! " جمشید نے بڑی لجاجت سے درخواست کی۔ آئی۔ سی۔ ایس کے سارے خواب گوبندوا کی تیوری پر بل دیکھ کر پل کی پل میں ہوا ہو گئے۔

" اچھا۔ نہ کہیا۔ مل سُہرن مارہ کے ای سب نہ سیکھو۔ " گوبندوا نے مریل گھوڑے کو دوبارہ چابک لگایا —— " چلت نہیں سُسر۔ تو ٹو کا سرگٹ چاہی ؟ "

جمشید نے ایک طویل کش لے کر ناک سے دھواں نکالا۔ اتنے میں سامنے سے گوبردھن چاچا آتے دکھائی دیے۔ وہ کندھے پر ہل رکھے بیلوں کی جوڑی ہنکاتے اپنے کھیت کی طرف چلے جا رہے تھے۔ جمشید نے گھبرا کر سگریٹ مٹھی میں چھپا لیا۔

گوبر چاچا نے اگر دیکھ لیا تو یکے سے اتار کر پچاس جوتے لگائیں گے۔ اور گنیں گے ایک نہیں !

گاؤں میں کس قدر دقیانوسیت ہے اس نے شدت کی جھنجھلاہٹ کے ساتھ

سوچا۔ ہندستان کے گانو ـــــ ہا ہا ہا ـــــ ہندستان کے گانو ـــــ
اسے معلوم نہ تھا کہ اس صبح وہ تقریباً آخری بار اپنے گانو سے جا رہا تھا۔ اس کے بعد وہ کبھی اس طرح محمد گنج نہ آئے گا۔ اس طرح گوبندوا کے یکّے پر نہ بیٹھے گا۔ گوبردھن چاچا سے خائف ہونے کی ضرورت اسے پھر کبھی محسوس نہ ہوگی۔

۲

کان پور پہنچ کر وہ اپنے گھر کی سیڑھیوں پر چڑھا۔ سامنے گلی کی دیوار پر "بھابھی" اور "پکار" کے اشتہار اور کانگریس کے جلسے کے پوسٹر لگے تھے بیٹھک کے دروازے پر چق پڑی تھی اندر اینٹوں کی فرش پر ایک میز اور موکلوں کے لیے تین چار کرسیاں رکھی تھیں۔ کونے میں قانون کی موٹی موٹی گرد آلود کتابیں الماری کے تختوں پر چنی ہوئی تھیں۔ ایک دیوار پر سید اختر علی کی تصویر لگی ہوئی تھی جس میں وہ بی۔اے ایل۔ایل۔بی کا گاؤن پہنے کیمرے کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ باقی دیواروں پر سر سید احمد خاں اور تاج محل کی تصاویر آویزاں تھیں۔ پنجتن پاک کے نام اور طغرے اور "فاعتبروا یا اولی الابصار" فریموں میں لگے تھے اور مدینہ منورہ کا ایک کلنڈر لٹک رہا تھا۔ ایک کونے میں تذکرہ غوثیہ کی جلد اور نظام المشائخ، دین و دنیا اور مدینہ کے فائل دھرے تھے۔ سلطان الہند خواجہ غریب نواز کی درگاہ کی ایک بڑی سی تصویر کارنس پر رکھی تھی۔ کئی برس قبل سید اختر علی نے اپنے حصے کے کھیت بیچ کر کان پور میں یہ مکان خریدا تھا اور پریکٹس شروع کی تھی۔ جمشید میلا سا سوتی پردہ اٹھا کر زنان خانے میں گیا۔ اندر پتلے اور لمبے کمرے کے چاروں دروازے دالان میں کھلتے تھے۔ کمرے میں اس کے تینوں چھوٹے بہن بھائیوں کی چارپائیاں بچھی تھیں۔ اس کی اپنی چارپائی کے سرھانے اس کی میز لگی تھی جس پر اس کی کتابوں کا انبار تھا۔

جن پر اخبار اور رسالوں کے کاغذوں کے کور چڑھے ہوئے تھے اور کڑھے ہوئے میلے میز پوش پر سیاہی کا بڑا سا دھبا لگ گیا تھا۔ ایک کونے میں اس کی سائیکل کھڑی تھی۔ اس کی اماں سِل میں مبتلا دالان میں لیٹی تھیں۔ چھوٹی بہن عالیہ باورچی خانے میں تھی ——

جمشید نے اسباب ایک چارپائی پر رکھا اور دالان کے تخت پر بیٹھ کر جوتوں کے فیتے کھولنے لگا۔

"بھیّا —— اگالو سے روپیا لائے ؟" عالیہ کی آواز پر وہ چونکا۔

"روپے ؟"

"ابا نے کہا تھا کہ چچا ابا سے لے کر روپیا بھیجیں گے۔ ان کو گئے اتنے دن ہو گئے۔ چھٹیوں میں تم بھی چلے گئے۔ یہاں سب پڑوسیوں کا قرضہ چڑھ گیا ہے۔"

"نہیں۔ ہم روپے نہیں لائے۔ مگر ابا کو جلد نوکری مل جائے گی شاید، ورنہ ہم کالج چھوڑ کر خود نوکری کر لیں گے —— ارے ارے —— رونی کیوں ہے گڑھیا ——!" اس نے عالیہ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اماں نے جو برسوں سے پلنگ پر پڑے پڑے حد سے زیادہ چڑچڑی اور بدمزاج ہو گئی تھیں۔ حسبِ معمول چیخنا چلانا اور کھانسنا شروع کر دیا۔ جمشید تخت کے کنارے چُپ چاپ بیٹھا رہا۔

الہ آباد سول لائنز کی ایک پرانے طرز کی کوٹھی کی برساتی میں ایک لمبی چوڑی ۱۹۳۵ء کے ماڈل کی سیلون کار تیزی سے آن کر رُکی اور ایک حساس شکل اور سانولی رنگت والا نوجوان بے حد اکسائٹیڈ انداز میں کار سے اتر کر اپنے کمرے میں گیا۔ جلدی جلدی میز کی درازیں کھولیں۔ کاغذات الٹ پلٹ کر ایک پرس تلاش کیا۔ سُرخ رنگ کا

ایک چھوٹا سا مڑا ہوا کارڈ جیب سے نکالا۔ ایک دفعہ اس کے اندر لکھا ہوا اپنا نام پڑھا اور بڑی احتیاط سے اسے پرس میں رکھ دیا۔

ملازم ڈاک لے کر آیا۔ ماما کی لکھائی لفافے پر دیکھ کر وہ محبت سے مسکرایا۔ اور خط پڑھنا شروع کیا ——— "ہم دورہ ختم ہوتے ہی سیدھے الہ آباد آرہے ہیں۔ اب تمھیں آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان کی تیاری کرنا ہے۔ ہماری عدم موجودگی میں نیازی بیگم تمھارے کھانے پینے کا بالکل خیال نہیں رکھتیں۔ اب تم ماشااللہ سے ———" خط ختم کرکے اس نے واپس لفافے میں رکھ دیا اور اُداسی سے مسکرایا۔ پھر وہ دریچے میں جا کر کھڑا ہوا۔ اور سگریٹ جلا کر سوچنے لگا ———

ہم بابا اور ماما کو یہ اطلاع کن الفاظ میں دیں کہ ہم ان کی ساری درخشاں اُمیدوں پر پانی پھیرنے والے ہیں ———

محمد گنج کی خانقاہ کی منڈیر پر بیٹھ کر سید مظہر علی نے خطِ شکست میں پوسٹ کارڈ لکھنا شروع کیا ———

برخوردار سعادت آثار راحت جان عزیزی جمشید میاں طولعمرہٗ

واضح ہو کہ تمھارے ابا چند در چند وجوہات کی بنا پر ہنوز محمدؐ گنج میں ہیں۔ کیمپ اٹھ چکا ہے۔ تمھارے ابا نے متعدد درخواستیں لکھ کر سکرٹری صاحب کے دفتر بہ مقام لکھنؤ روانہ کردی ہیں۔ اللہ بہتری کرے گا۔ دیگر احوال یہ ہے کہ بُوٹا بیگم کے مقدمے کی پیشی ملتوی ہوگئی ہے۔ کلکٹر صاحب نے بہ کمال مہربانی ان کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا ہے اور دوران مقدمہ بوٹا بیگم مع اپنی لڑکی کے شہر

الہ آباد میں کلکٹر صاحب کی سرپرستی میں رہیں گی۔ نواب شمس آرا بیگم نے حرف ہائے خلاف و نامعقول اس ضمن میں سب سے کہے ہیں نیز تمھارے ابا کہتے ہیں کہ اپنی سیکل فروخت کر دو ——

چھ مہینے بعد جمشید کو ایک اور پوسٹ کارڈ ملا۔

برخوردار نورچشمی سلمہ تعالیٰ ۔ یہ معلوم کر کے یک گونہ اطمینان ہوا کہ تم نے ٹیوشن شروع کر دیے ہیں۔ تمھارے ابا کے روزگار کی ہنوز کوئی صورت نہیں نکلی۔ اب وہ دن بھر خانقاہ میں بیٹھے رہتے ہیں۔ ہم کو فکر شدید اس امر کی ہے کہ خدانخواستہ ان کا خطرہ نہ ٹل جاوے کیونکہ کل شب وہ ہم سے کہتے تھے کہ ان کو بشارتیں ہو رہی ہیں۔ بھائی صاحب قبلہ کو بھی ان کی طرف سے ازحد تشویش لاحق ہے۔ اللہ سے دعا کرتے رہو وہ مسبّب الاسباب ہے۔

دو سال بعد پوسٹ کارڈ آیا:

"—— نورچشمی منظور النسا سلمہا اب اس لائق ہو چکی ہے کہ اُسے اس کے گھر بھیج دیا جاوے۔ لہٰذا عید کے چاند سے رخصت کر کے لے جاؤ۔ تمھارے ابا اب مستقل ندی کے کنارے کُٹی میں رہتے ہیں۔

دو روپے گز والی سرخ ساٹن کے غرارے اور ریشمی ململ کے سرخ دوپٹے قمیص میں ملبوس، گلے میں چاندی کا طوق، ملکہ وکٹوریہ کے روپوں والی ہُمیل، اور کانوں میں چاندی کے بالی پتے پہنے، لانبی چوٹی میں گوٹے کا موباف ڈالے، لمبا سا گھونگھٹ کاڑھے منظور النسا دلھن بنی برقعے میں لپٹی تانگے سے اُتری۔ اس کے جوڑے پر

جھوٹا لچکا ٹنکا تھا۔ اس نے ہاتھوں میں فیروز آباد کی سرخ ریشمی چوڑیاں اور چاندی کی پہونچیاں پہن رکھی تھیں۔ انگلیوں میں چاندی کے چھلّے تھے۔ ہتھیلیوں میں تیز سُرخ مِنہدی رچی تھی۔ بازوؤں پر چاندی کے جوشن بندھے تھے۔ سرخ ریشمی موزوں اور انگریزی گرگابی والے پیروں میں چھڑے اور چھاگل چھن چھن کر رہے تھے۔ تین موتیوں والی بڑی سی نتھ اس کا واحد طلائی زیور تھا۔ یہ سارے گہنے اس کی ماں کے جہیز کے تھے۔ صرف اس کے سات جوڑے۔ دولھا کا ریشمی اچکن کا جوڑا اور تانبے کے چار برتن اور مراد آبادی پان دان سید مظہر علی اشرفی لال مہاجن سے ادھار کر بنوا سکے تھے۔ تانبے کے باقی سات برتنوں پر جو ان کی بیوی نے منظور النسا کی پیدائش کے وقت سے سینت سینت کر پچھلی کوٹھری میں چن رکھے تھے دوبارہ قلعی کروادی گئی تھی۔ نیم تلے شادی کا کھانا ہوا تھا۔ آلو گوشت کا شوربا، تنوری روٹیاں اور زردہ مٹی کے کونڈوں رکابیوں اور سکوریوں میں نکال کر مہمانوں کے سامنے رکھا گیا تھا۔ تام چینی کی پھول دار رکابیاں صرف دولھا اور مولوی صاحب اور چند اور خاص خاص مہمانوں کے لیے تھیں۔ ہندو احباب کے لیے کچھ فاصلے پر پنڈت لچھمی نارائن نے برگد تلے اپنی نگرانی میں بھوجن بنوایا تھا جو لیٹے کے پتّوں پر پروسا گیا تھا۔ شہنائی بجی تھی۔ مہمانوں کو محظوظ کرنے کے فرائض جیپانی بھانڈ کے سپرد تھے۔ شادی کے خرچے میں سید مظہر علی کا بال بال قرضے سے بندھ گیا تھا۔ منظور النسا ان کی اکلوتی اولاد تھی اور وہ اس کی صورت دیکھ کر جیتے تھے۔ اُن کا جی چاہتا تھا کہ اشرفی لال کی سُود در سُود کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنی لاڈلی بچّی کے بیاہ میں دل کے سارے ارمان نکالیں۔ مگر قدم قدم پر ان کے افلاس کا بھوت سامنے آ کھڑا ہوتا اور وہ جی مسوس کر رہ جاتے۔ جب رخصتی کا وقت قریب آیا تو وہ گھر سے چلے گئے تھے۔ اور درگاہ کی منڈیر پر جا کر چپ چاپ بیٹھ گئے تھے۔

بیٹی کی سرخ پالکی نیم تلے رکھی گئی تو اسے وداع کرتے ہوئے انھوں نے بھرّائی ہوئی آواز میں جمشید سے کہا تھا ـــــ "بھیا! یہ بڑی بے زبان اور غریب بچّی ہے۔ تمھاری کنیز بن کر رہے گی۔ اس کا دل کبھی نہ دُکھانا۔"

سرخ رنگ کی سوتی چادر اوڑھے جس پر ابرق کے بڑے بڑے پھول چھپے تھے۔ منظور النسا پالکی میں سر جھکائے بیٹھی تھی۔ پھر اس کی پالکی اسٹیشن روانہ ہو گئی تھی۔ جھینگا پاسی اور اس کے لڑکوں نے جہیز کے ٹرنک اپنے سروں پر اٹھا رکھے تھے اور سب سے آگے آگے جامہ پہنے، سہرا باندھے، ہاتھ میں سرخ رومال لیے جمشید دولھا بنا گوبندوا کے یکّے پر بیٹھا تھا۔

تانگے سے اتر کر منظور النسا اپنے گھر میں داخل ہوئی۔ شہر کی پروردہ عالیہ نے اسے ناقدانہ نگاہوں سے دیکھا اور ذرا مُنہ بنا کے آواز دی ـــــ "اماں۔ دلھن بھابھی آگئیں" ـــــ منظور النساء کو دالان کے برابر والی کوٹھری میں بٹھال دیا گیا جو اس کا حجلۂ عروسی تھا۔ یہاں محلے والیوں کے سامنے اس کی مُنہ دکھائی ہوئی جو ایک ایک روپیا، دو دو روپے اس کے سامنے بچھے ہوئے سرخ رومال میں ڈالتی گئیں۔ ایک ہفتے تک وہ دن دن بھر بغیر ہلے جلے پلنگ پر سرنگوں بیٹھی رہی اور جب کوئی محلّے والی اس کا گھونگھٹ اٹھاتی تو وہ دستور کے مطابق فوراً آنکھیں بند کر لیتی۔

اس کے بعد منظور النسا نے آنکھیں کھولیں اور اپنے گھر کو دیکھا۔ یہ چھوٹا سا مکان اس کے لیے محل کے برابر تھا۔ اس میں برقی روشنی تھی۔ میز کرسیاں تھیں۔ چینی کے برتن تھے۔ کاغذی پھولوں سے سجے ہوئے نیلی کانچ کے گلدان طاقچوں میں رکھے تھے اور اس کی بجلی بسنت نند عالیہ اسکول میں انگریزی پڑھتی تھی۔

جمشید اب ایم۔ اے ـــــ میں تھا اور رات گئے تک ٹیوشن کر کے گھر کا

خرچ چلاتا تھا۔ اس نے بیٹھک کا کمرہ بھی کرایہ پر اٹھا دیا تھا اور کفایت کے خیال سے سگریٹ پینے چھوڑ دیے تھے۔ بائیس تیئیس سال کی عمر میں وہ تلخ مزاج، قنوطی اور ذہنی اور جذباتی طور پر بوڑھا ہو چکا تھا۔

منظور النسا نے گھر کا سارا کام مشین کی طرح سنبھال لیا۔ وہ دونوں وقت کا کھانا پکاتی۔ بڑی لگن سے ساس کی تیمارداری کرتی۔ ان کی جھڑکیاں اور طعنے سنتی' دیوروں کی خاطر کرتی اور عالیہ سے مرعوب رہتی۔ جمشید اس سے سیدھے منہ بات نہ کرتا۔ مگر اسے اس کا بھی کوئی غم نہ تھا۔ اس کا فرض اپنے شوہر کی خدمت کرنا تھا۔ اور وہ اپنے شوہر کی پرستش کرتی تھی۔

لیکن جب وہ پہلوٹھی کے بچّے کی پیدائش کے لیے محمد گنج گئی تو اس کے بعد جمشید نے اسے کان پور واپس نہ بلایا۔ اس نے سید مظہر علی کے تشویش ناک اور بعد میں المناک خطوں کا جواب دینا بھی چھوڑ دیا۔

جنگ شروع ہوتے تین سال گزر چکے تھے۔ وہ ملٹری اسٹورز کے محکمہ میں حوالدار کلرک ہو گیا۔ سال بھر میں اسے ترقی مل گئی اور وہ شہر کا مکان کرایے پر اٹھا کر گھر والوں سمیت چھاؤنی کے ایک کشادہ اور ہوادار کوارٹر میں منتقل ہو گیا۔ اب وہ چار سو روپے ماہوار پاتا تھا اور گھر میں کنٹین کے سامان کی ریل پیل تھی۔ آنکھوں کی کمزوری کی وجہ سے وہ ایمرجنسی کمیشن میں درخواست نہ دے سکتا تھا جس کا اسے بے حد افسوس تھا۔ اسی زمانے میں اس نے سگریٹ کا پورا ٹن بار رات بھر میں پھونک ڈالنے کے بعد منظور النسا کو طلاق لکھ بھیجی۔

جب منظور النسا کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی تھی تو سید اختر علی کو ان کی کٹّی سے

پکڑ کر منگوایا گیا تھا اور انھوں نے پوتی کے کان میں اذان دی تھی۔ شاہ منورعلی نے اَن گنت دعائیں پڑھ کر بچی پر پھونکی تھیں۔ محلّے کی عورتوں نے چاول کے کھم بنا کر اور گلگلے تل کے خدائی رات منائی تھی۔ نیم تلے چپاتی بھانڈ نے نقلیں دکھائی تھیں اور گانو کی البیلی پاتر حشمت ٹھمکی لگا لگا کر ــــــــ "کھسکے ڈیل کھسکے ڈیل ــــــــ" الاپتی سید مظہر علی کے نزدیک پہنچی تھی، جو احباب کے ساتھ کھاٹ پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے اور نواسی کی پیدائش کی خوشی میں انھوں نے بڑے رومال کی گرہ میں سے دو روپے نکال کر اُسے دیے تھے۔ اندر صحن میں جھینگا پاسی کی عورت گھونگھٹ کاڑھ کے اور کمر پر ہاتھ رکھ کے ناچی تھی۔ حیدری ڈومنی اور اس کی بہنوں نے "جچّہ گیریاں" گائی تھیں اور چونکہ منظور النسا بچی کی پیدائش میں مرتے مرتے بچی تھی، اس لیے چند روز بعد شکرانے کے طور پر بی بی کی صحنک بھی کی گئی تھی۔

جب بچی کا عقیقہ ہوا تو نانا نے اس کا نام فرحت النسا بیگم رکھا۔ شاہ منورعلی نے اسے گنڈے تعویذوں سے لاد دیا۔ صحن میں ڈھولک رکھی گئی۔ اور منظور النسا "آنکھ کے نشے" کا فالسئی جوڑا پہنے بچی کو گود میں لیے چارپائی پر بیٹھی سہیلیوں کو حسب معمول کانپور شہر کے حیرت ناک قصے سناتی رہی "سڑکوں پر ٹن ٹن کرتی ریلیں چلت ہیں۔ یہ بڑے بڑے کارخانے رات کو آنگن میں سو صبح کو دھواں دھار اُٹھو۔ ایک دفعے ہم ان کے ساتھ سینما بھی گئے رہے"۔

اسی وقت سمبھو دادا جو گانو کے ڈاکیے بھی تھے رجسٹری خط لے کر آئے

سید مظہر علی کی بی بی گم سم بیٹھی پالنے کی ڈوری ہلایا کیں۔ گانو بھر کی عورتیں

صحن میں جمع ہوگئیں ۔ نوزائیدہ بچی جس کے ماتھے پر نظر کا ٹیکہ لگا تھا اور کلائی میں سیاہ ڈوری بندھی تھی ۔ اسی طرح ہنس ہنس کر کلکاریاں مارتی رہی ۔ باہر نیم تلے توقیر میاں، گوبر چاچا، لالہ مجلس رائے، شیخ رمضان، مولوی محمد حسن، پنڈت لچھمی نارائن گوسائیں کاکا اور گوبندوا سر جھکا کر بیٹھ گئے ۔ شاہ منور علی خانقاہ کے اندر خاموش بیٹھے رہے ۔ انھوں نے صرف ایک نعرہ لگایا ——— " بڑی لمبی جاید اد اُس نے عطا کی ہے ——— شکر ہے ——— شکر ہے ——— شکر ہے ! "

سید اختر علی گومتی کے ساحل پر مراقبے میں مصروف رہے ۔ ان کو کسی نے یہ اطلاع نہیں دی ۔

کئی برس گزر گئے بچی کو اس کی نانی پال رہی تھیں ۔ منظور النسا پکانے ریندھنے کے بعد زیادہ تر خاموش بیٹھی آسمان کو تکا کرتی ۔ صبح صبح وضو کے لیے اُٹھتی تو کھِرنی کے درخت کے نیچے پڑے پر بیٹھ کر مناجاتیں پڑھتی :

تو ٔی سروری اور تو ٔی اکبری
مری بار کیوں دیر اتنی کری

کبھی وہ میلادِ اکبر کھول کر بیٹھ جاتی اور چپکے چپکے ہونٹ ہلاتی :

جب باغِ جہاں کے مالی نے کی دیکھا بھالی پھولوں کی
اک پھول اس میں سے چھانٹ لیا تھی جتنی ڈالی پھولوں کی

گرمیوں کے طویل دوپہروں کے سناٹے میں، جاڑوں کی رات کے سرد اندھیرے میں، برسات کی بھیگی دوپہروں میں اس کی آواز اس چھوٹے سے مکان میں گونجا کرتی :

تری ذاتِ پاک ہے اے خدا تری شان جلّ جلالہٗ
ترا نام عادل کبریا، تری شان جلّ جلالہٗ
جسے چاہے جیسا بنا دیا، تری شان جلّ جلالہٗ

اکثر وہ روٹیاں بیلتے بیلتے، فرحت النسا کی چٹیا کرتے کرتے، دھان پھٹکتے پھٹکتے وہ شعر گنگناتی، جو اُس نے مولوی محمد حسن کی بی بی سے سنا تھا:

دو پھول ساتھ پھولے قسمت جُدا جُدا ہے
اک قبر پہ چڑھا ہے اِک سہرے میں گندھا ہے

اس کے دل میں برچھی سی اتر جاتی اور وہ سوچتی۔ ان کے سہرے میں جانے اب کون سا پھول گندھے گا۔ روز وہ اس انتظار میں رہتی کہ اب شہر سے اطلاع آئے گی کہ جمشید نے کسی بی۔ اے پاس لڑکی سے شادی کر لی۔ مگر دن گزرتے گئے اور کچھ نہ ہوا۔ تب وہ یہ آس لگاتی کہ شاید جمشید اس سے رجوع کرلے۔ بیس برس کی عمر میں وہ چالیس سالہ دکھی عورت معلوم ہوتی تھی۔

سلمان مرزا کو بمبئی گئے عرصہ ہو چکا تھا۔ کبھی کبھار وہ الہ آباد آتا اور چند روز بعد پھر غائب ہو جاتا۔ قصرِ سلمان کے ایک سائڈ روم میں بوٹا بیگم مع اپنی لڑکی بسنتی کے گذشتہ چند برس سے رہ رہی تھیں۔ ان کا کیس چیف کورٹ تک گیا تھا اور وہ مقدمہ جیت کر نواب شمس آرا بیگم اور نواب بھورے دونوں کو نیچا دکھا چکی تھیں۔ اور اب دعائیں مانگتی تھیں کہ کسی شریف معمولی حیثیت کے برسرِ روزگار نوجوان سے بسنتی بیگم کا نکاح ہو جائے۔ قصرِ سلمان میں ان کی حیثیت ہاؤس کیپر کی سی تھی۔ وہ جمعرات کے روز مجلس بھی پڑھتی تھیں اور جب چھوٹی بٹیا مسوری کانونٹ سے چھٹیوں میں گھر آتیں تو ان کے ملبوسات کی دیکھ بھال بھی بوٹا بیگم کے ذمے تھی۔ وہ اٹھتے بیٹھتے کلکٹر صاحب کو دعائیں دیا کرتی تھیں۔ کلکٹر صاحب ریٹائر ہو چکے تھے اور اپنے کمرے میں آرام کرسی پر نیم دراز

تصوّف کی کتابیں پڑھا کرتے تھے۔ بسنتی بیگم اسکول جاتی تھی اور واپس آکر سائڈ روم میں بیٹھی آبی رنگوں سے تصویریں بناتی رہتی تھی۔

جس روز اسکول کی سالانہ نمائش میں اسے نقد سو روپے آرٹ کا پہلا انعام ملا۔ بوٹا بیگم سجدے میں گر کر دیر تک رویا کیں۔ مدتوں بعد پہلی مرتبہ ان کے ہاتھ میں سو روپے آئے تھے۔ ان کا چھوٹا موٹا زیور، گاؤں کی تین بیگھ زمین، محمد گنج کا آبائی مکان، سارا اثاثہ مقدمے کی نذر ہو چکا تھا۔ اب میم صاحب ان کو بیس روپے ماہوار تنخواہ دیتی تھیں۔ پان تمباکو کا خرچ، بسنتی بیگم کے اسکول کی فیس، کتابیں، اس کے کپڑے لتے یہ سب بھی میم صاحب نے اپنے ذمّے لے رکھا تھا۔ دونوں وقت کا کھانا بوٹا بیگم، بسنتی اور سلمان کی بوڑھی انّا نیازی بُوا کے لیے پچھلے برآمدے کے تخت پر چُن دیا جاتا تھا۔

عشا کی نماز کے بعد اکثر بوٹا بیگم اپنے جوانمرگ بیٹے کو یاد کر کے تڑپا کرتیں۔ اور آنسوؤں سے ان کی سجدہ گاہ تر بتر ہو جاتی۔ محرّم کے دنوں میں وہ علموں کی بلائیں لیتیں۔ ضریحوں اور تعزیوں کی دھول آنکھوں سے لگاتیں اور جناب علی اصغرؑ کے گہوارے اور ذوالجناح کے سامنے کھڑے ہو کر بلک بلک کر دعائیں مانگتیں:

"یا مولاؑ ——— یا مشکل کشا ——— یا سید الشہدا ——— یا امام مظلومؑ۔ بسنتی کا نصیبہ کھول دیجیے۔ بسنتی کو عزت و آبرو کے ساتھ کہیں ٹھکانے لگا دیجیے۔"

اس وقت سو روپے کا نوٹ بسنتی نے ان کو لا کر دیا تو انھیں پھریری سی چڑھی۔ یہ کثیر رقم ان کی دکھیاری بیٹی کی صلاحیت اور محنت کا صلہ تھا ———

"یا الٰہی اس کا مقدّر اچھا کرنا ——— !"

آنند موہن گھوش، اسکول کی ہیڈ مسٹریس کا چھوٹا بھائی تھا۔ نمائش میں بسنتی بیگم کی تصاویر دیکھنے کے بعد اس نے ایل۔ ایم سین کو لکھا ——— "اگر

میں آپ سے یہ کہوں کہ میں نے ایک تقریباً جینیئس کو ڈسکور کیا ہے تو آپ کو یقین نہ آئے گا۔"

اگلی مرتبہ لکھنؤ آرٹ اسکول کے پرنسپل ایل۔ ایم سین جب الہ آباد آئے تو مس ریبا گھوش نے اپنی ہونہار طالب علم کو اُن سے ملوایا۔

آئندہ سال میٹرک کے بعد بسنتی بیگم سرکاری وظیفے پر لکھنؤ آرٹ اسکول میں داخل ہو گئی۔ ابھی وہ تھرڈ ایر میں تھی کہ بوٹا بیگم سخت بیمار پڑیں اور اسے الہ آباد واپس آنا پڑا۔ یہاں وہ کالج میں داخل ہو گئی اور اس نے اپنے آپ کو بسنتی بیگم کہلوانا ترک کیا۔ کیونکہ یہ نام اس کے شدید دکھی بچپن کی یادگار تھا۔ ایف۔ اے کے بعد وہ اپنے پرانے اسکول میں ڈرائنگ ٹیچر ہو گئی۔ اس نے بوٹا بیگم سے کہا ——

"میں تیرہ برس کی عمر سے دھکّے کھا رہی ہوں۔ سات سال سے ہم لوگ اس محل میں رہ رہے ہیں۔ مجھے مفت کے ٹکڑے توڑتے اب شرم آتی ہے۔ مجھے سوا سو ماہوار کی نوکری مل گئی ہے۔ شام کے وقت میں ٹیوشن بھی کروں گی اور شہر میں مکان لے کر رہوں گی۔ سامان باندھ لیجیے —— !"

"—— اکیلی بٹیا کیسے رہیو —— ؟" بوٹا بیگم نے بھونچکّی ہو کر پوچھا۔

"اماں —— !" اس نے اُکتا کر بحث قطعی طور پر ختم کرتے ہوئے جواب دیا۔ "میں وہ بسنتی بیگم نہیں ہوں جسے نواب بھورے کے سپاہی اٹھا کر لے گئے تھے۔ اور دوسری بات یہ کہ میں اکیلی نہیں ہوں۔ ملک کے سارے عوام، سارا محنت کش طبقہ میرے ساتھ ہے۔" اس نے آنند موہن گھوش کے الفاظ دہرائے جس نے اس سے بے حد جوشیلے انداز میں کہا تھا۔

"سُوریہ —— دیش کی ساری جنتا، ساری ورکنگ کلاس تمہارے ساتھ ہے۔"

بُوٹا بیگم کے پلّے کچھ نہ پڑا کہ یہ نئی، حیرت انگیز بسنتی کیا کہہ رہی ہے۔ انھوں نے جا کر میم صاحب سے کہا ——

"میں سمجھتی ہوں"۔ میم صاحب نے آہستہ سے جواب دیا — "میرا بیٹا اسی طرح گھر کا عیش آرام چھوڑ کر گلیوں کی خاک چھاننے نکل گیا۔ یہ آج کل کی اولاد ہے ان کو سمجھانا لاحاصل ہے۔ یہ ہمیشہ اپنی من مانی کریں گے —— جمعرات کی جمعرات تو آتی رہیے گا نا ——؟ میں موٹر بھیج دیا کروں گی"۔

بُوٹا بیگم رونے لگیں۔

سلمان ایک روز الہ آباد آیا تو آنند موہن گھوش نے اس سے ثریا حسین کا ذکر کیا جو صحیح معنوں میں عوامی فن کار بن سکتی تھی۔ کیونکہ خود ایک کسان گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ شام کو آنند موہن گھوش سلمان کو پرانے کٹرے کے ایک چھوٹے سے مکان پر لے گیا اور دروازے پر دستک دی۔ بوٹا بیگم نے اندر سے جھانکا۔

"مس حسین ہیں؟" —— آنند موہن گھوش نے پوچھا۔

"کو ——؟"

"مس حسین ——"

بُوٹا بیگم کی سمجھ میں نہ آیا —— "بسنتی ——" انھوں نے آواز دی۔ وہ دروازے پر آئی۔

"ارے بسنتی بیگم!" —— سلمان نے حیرت اور مسرت سے کہا ——

"تم اتنی پُراسرار بن گئیں! میں یہاں مس حسین کے رعب میں کھڑا تھر تھر کانپ رہا ہوں!!"

ثریا نے خوش دلی سے قہقہہ لگایا ——— "آئیے، آئیے، اندر آجائیے"۔ بوٹا بیگم سر پر دوپٹا رکھ کر جلدی سے اندر دبک گئیں۔ ثریا دونوں لڑکوں کو ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گئی۔ جو اس کا اسٹوڈیو بھی تھا۔ سلمان نے چاروں طرف دیکھا ——— "حد ہے ——— ! کمال ہوگیا ——— !!" ——— اس نے قصر سلمان میں ثریا کو آتو جی کی لڑکی بسنتی کی حیثیت سے دیکھا تھا۔ جو اس سے کانا پردہ کرتی تھی اور عموماً اِدھر اُدھر دُبکی رہتی تھی۔ اس وقت وہ ہونہار آرٹسٹ ثریا حسین کے نگار خانے میں کھڑا تھا۔ اس وقت اس نے ثریا کو پہلی مرتبہ غور سے اور توجہ سے دیکھا اور اسے تعجب ہوا کہ وہ اب تک کہاں چھپی ہوئی تھی۔

سلمان اب پھر الہ آباد بھیج دیا گیا تھا۔ وہ ثریا کو اپنے ساتھ جلسوں، تقریبوں اور سیاسی اور ادبی محفلوں میں لے جانے لگا اور وہ اس کے دوستوں کے حلقے میں شامل ہوگئی۔

ثریا اس طبقے سے آئی تھی جو اُن نوجوانوں کے لیے مشعلِ راہ تھا۔ وہ خود اس بھیانک طریقے سے فیوڈل نظام کا شکار رہ چکی تھی۔ وہ سب اس سے دُرگا کنڈ کی گڑھی کے واقعات سنتے۔ جہاں اسے چھ مہینے تک قید رکھا گیا تھا۔ وہ اس قیامت کی رات کا ذکر کرتی جب ڈھاٹے باندھے ہوئے بدمعاشوں نے اس کے اکلوتے بھائی کو گنڈاسوں سے ہلاک کیا تھا۔ وہ اپنے اندھے اور عسرت زدہ باپ کو یاد کرتی جو ایسی درد بھری آواز میں مرثیے اور سوز پڑھتے تھے کہ سننے والوں کا کلیجہ دہل جاتا تھا۔ وہ ساتھیوں کے لیے ہیروئن اور سلمان کے لیے اس کا آدرش بن گئی۔ اسی زمانے میں اس نے پرائیویٹ طور پر بی۔اے بھی کر لیا۔

چھوٹی بٹیا اب کراسویٹ کالج میں تھیں۔ بوٹا بیگم ہر جمعرات کو قصر سلمان جاکر مجلسیں پڑھتیں مگر ثریا ان کے ساتھ بہت کم جاتی تھی۔ اس کی اور سلمان کی

دوستی کے متعلق خیال کر کے بوٹا بیگم کا دل ہلا جاتا تھا ——— "صاحب میم صاحب مجھے کتنا نمک حرام سمجھیں ———" وہ لرز لرز کر سوچتیں۔ ثریا سے کچھ کہنے کی ان کو ہمت نہ پڑتی تھی مگر قصرِ سلمان وہ جھینپی جھینپی آتیں۔ میم صاحب نے اس سلسلے میں کبھی کوئی ذکر اُن سے نہ چھیڑا۔

۱۹۴۷ء کے اپریل میں چھوٹی بٹیا نے ایف۔ اے کا امتحان دیا۔ اور اسی مہینے والدین کے ہمراہ حسب معمول مسوری چلی گئیں۔ سلمان الہ آباد ہی میں تھا جب تقسیم ہند کا اعلان کیا گیا۔

جنگ کے بعد وہ محکمہ ٹوٹ گیا جس میں جمشید ملازم تھا۔ وہ عمر بڑھ جانے کی وجہ سے آئی۔ سی۔ ایس اور پی۔ سی۔ ایس کے امتحانوں میں نہ بیٹھ سکتا تھا۔ تقسیم کے فوراً بعد وہ قسمت آزمانے کراچی روانہ ہو گیا۔

دن بھر جھڑی لگی رہی تھی۔ برساتی کا کالر اُونچا کیے تیز تیز قدم رکھتا سلمان مرزا ثریا کے گھر پہنچا۔ شام ہو چکی تھی۔ گلی میں مینڈک ٹرّا رہے تھے۔ پڑوس میں ریڈیو بج رہا تھا اور پنجاب اور دہلی سے نکلنے والے پناہ گزینوں اور شرنارتھیوں کے پیتے ان کے عزیزوں کو سنائے جا رہے تھے۔ فضا پر عجیب سی نحوست اور ویرانی طاری تھی۔ سلمان کے قدموں کی آہٹ پر ثریا نے سلاخوں والی کھڑکی میں سے

جھانکا۔ وہ اندر گیا۔ ثریا نے اس کے لیے کرسی کھڑکی کے نزدیک کھینچ دی۔
"ایک دم حبس ہو گیا ہے" ـــــ اس نے خالی خالی آواز میں کہا۔
سلمان نے کرسی پر ٹک کر گھڑی پر نظر ڈالی اور سگریٹ جلایا۔
"وقت بہت کم ہے" ـــــ اس نے متوازن آواز میں کہا ـــــ
"اور ہمیں معلوم ہے کہ کسی کرائسس میں تمھارے قدم کبھی نہ لڑکھڑائیں گے۔ تم ہمیشہ ہمارا ساتھ دو گی ـــــ ٹھیک ہے نا ثریا ـــــ؟" دفعتاً اس کی آواز میں بچوں کا سا لہجہ عود کر آیا۔ چھوٹی بٹیا کا سا لہجہ ـــــ!
"تقریر مت جھاڑو ـــــ!" ثریا نے اکتاہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ـــــ
"میں اتنے برسوں سے متواتر تمھاری تقریریں سُن رہی ہوں کرائسس ـــــ آدرش ـــــ اصول ـــــ اقدار ـــــ!"
"تم بھی ہمیں مایوس کر رہی ہو لڑکی ـــــ؟ ہمیں مایوس نہ کرنا ـــــ"
سلمان نے بھونچکا ہو کر بڑے کرب سے کہا۔
"مایوس! تم انسانوں کی طرف سے اب تک خوش فہمی میں مبتلا ہو ـــــ!"
گلی میں ریڈیو کی آواز گونجی ـــــ "شری نواب چند کھنہ کا خاندان ڈکوٹا کے ذریعے پشاور سے امرت سر پہنچ رہا ہے ـــــ جناب فضل دین وکیل کا خاندان خیریت کے ساتھ ہوشیار پور سے لاہور پہنچ چکا ہے ـــــ چودھری ٹیکا رام اور ان کے خاندان کے لیے ایک ڈکوٹا جہلم بھیجا جا رہا ہے ـــــ ایک بار پھر سُن لیجیے ـــــ!"
ثریا نے کھڑکی بند کر دی۔
"ثریا ـــــ!" سلمان نے اسی کرب کے ساتھ کہا ـــــ "تم تجریدی تصویریں بناتے بناتے حقیقت سے بالکل کٹ گئیں ـــــ"

"ایک اور مفروضہ! اور سلمان مرزا۔ میں تم سے آرٹ پر بحث کرنا نہیں چاہتی۔ یہ تمہارا میدان نہیں ——— !"

ہوا کے جھونکے سے کھڑکی کے پٹ زور سے کھل گئے۔

"میں یہاں بیٹھ کر روز شام کو خبریں سنتی ہوں مگر تمہارے گھر والوں کی خیریت اب تک نہیں سُنی ———" اس کی آواز میں خفیف سی بے رحمی تھی۔

"ایک بار پھر سُن لیجیے :——— جناب قمرالدین مرزا۔ بیگم مرزا اور مِس مرزا ———"

سلمان نے سانس روک لیا اور اس کا رنگ سفید پڑ گیا۔

"——— اتوار کے روز فوجی کونوائے کے ساتھ مسوری سے لاہور روانہ ہو گئے۔ ڈاکٹر ہری رام ملہوترہ، سردار خوشحال سنگھ اور لالہ گلاب چند ———"

کچھ دیر کمرے میں مکمل سکوت طاری رہا۔ سلمان اسی طرح ساکت و سامت بیٹھا تھا۔ ثریا نے فکرمندی سے اسے دیکھا۔ اسے اپنے کمینے پن پر پشیمانی ہوئی وہ جلدی سے اس کے لیے چائے بنا کر لے آئی۔

"ماما کا خط چند روز ہوئے آیا تھا" ——— سلمان نے چائے میں شکر گھولتے ہوئے آہستہ سے کہا ———" جس دن ان کی مسوری کی کوٹھی جلائی گئی اس کے اگلے روز انھوں نے لکھا تھا۔ وہ چھوٹی بٹیا کی وجہ سے بے حد پریشان تھیں۔ اب تک سیکڑوں نوجوان لڑکیوں کو اغوا کیا جا چکا ہے۔"

"گھبراؤ مت ——— !" ثریا نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا ———" وہ لوگ خیریت سے پہنچ جائیں گے۔"

کمرے کی بجلی فیل ہو گئی۔

"ہمیں ایک سگریٹ جلا دو۔"

ثریا نے فرش پر ٹٹول کر سگریٹ اور ماچس تلاش کی اور اس کے ہاتھ میں دے دی۔ سلمان نے سگریٹ جلایا۔ ثریا مونڈھے پر چپ چاپ بیٹھی رہی۔ کچھ دیر بعد سلمان نے آہستہ آہستہ کہا ——— "بابا بہار کے ایک قحط زدہ گاؤں میں ایک خانقاہ کے سایے میں فقر و فاقے سے مانوس صوفیوں کے ایک گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ پی۔سی۔ایس میں نامزد ہوئے اور با اقتدار متوسط طبقے میں شامل ہو گئے۔ مگر ذہنی لحاظ سے وہ ہمیشہ فقیر رہے ——— مجھے ماما اور چھوٹی بٹیا کی فکر ہے۔ انھیں بڑے شدید جذباتی صدموں کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

"تمھاری مسوری والی کوٹھی جلا دی گئی ——— ؟" ثریا نے پوچھا۔

"ہاں ——— !" اندھیرے میں سلمان کی آواز آئی ——— "جس نظام نے اس مذہبی عصبیت کو جنم دیا اسی عصبیت کے ہاتھوں اس سماج کے محل جلا دیے گئے۔ مگر ثریا محض اسی وجہ سے آج ان بنیادی تضادوں کو مزید تقویت حاصل ہوئی ہے۔ ماضی کی محل سرائیں جل کر راکھ ہوئیں۔ مگر ابھی اس ملبے کی بنیادوں پر دونوں ملکوں میں نئی بورژوازی کے نئے محل کھڑے ہوں گے ——— کل کے جاگیردار کی جگہ آج کا سرمایہ دار حاصل کرے گا۔ ہماری اصل جدوجہد کا آغاز آج سے ہو رہا ہے ——— !" اس نے ماچس جلا کر گھڑی دیکھی اور دفعتاً اُٹھ کھڑا ہوا ——— "ثریا! مجھے سرحد پار بھیجا جا رہا ہے ——— میرا ساتھ دو گی؟"

وہ خاموش رہی۔

"میرے ساتھ تمھیں زندگی بھر تکلیفیں اٹھانا پڑیں گی اور خدا جانتا ہے تم زندگی میں تھوڑے سے آرام، تھوڑی سی آسایش کی مستحق ہو، مگر میرے ساتھ تم کو دل کا چین ملے گا اور ذہنی سکون ——— اور میری انتہاء محبت ——— !"

"تم وہاں جا کر جانے کہاں کہاں مارے مارے پھرو گے۔ میں کہاں رہوں گی؟"

"تم سپاہی آدمی ہو ثریا! جنگ جاری ہے۔ صرف محاذ بدل جائیں گے۔"

وہ خاموش رہی۔

"ثریا ــــــ!"

وہ خاموش رہی۔

وہ دیوار سے ٹک گیا ــــــ "ثریا ــــــ!" اس نے آخری بار کہا۔

وہ پھر بھی چُپ رہی۔

کسی نے مقابل کے مکان میں لالٹین جلائی۔ اس کی مدھم سی روشنی کھڑکی میں سے آکر کمرے میں پڑنے لگی۔ سلمان نے ثریا پر نظر ڈالی اور ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کرلیں۔ گویا آخری بار اس کی تصویر اپنے دل میں محفوظ کرلینا چاہتا ہو۔ وہ سیدھا کھڑا ہوگیا اور اس نے بڑی نارمل آواز میں کہا ــــــ "اچھا بھئی ثریا ــــــ! اب ہم جاتے ہیں۔ صبح سویرے سفر پر روانہ ہونا ہے ــــــ ع زندگی منتظر ہے مُنہ پھاڑے، وغیرہ وغیرہ۔" اس نے ذرا ہنس کر اضافہ کیا ــــــ "خدا حافظ" اس نے ہاتھ آگے بڑھایا ــــــ

COME ON SHAKE HAND LIKE A MAN

وہ اسی طرح چُپ چاپ بیٹھی رہی۔

پھر وہ اپنی جگہ سے اُٹھی اور دفعتاً اس سے لپٹ گئی۔

"سلمان ــــــ سلمان ــــــ سلمان ــــ ــــ!" اس نے سلمان کے شانوں سے اپنا چہرہ رگڑتے ہوئے کہا ــــــ "میں وقتی طور پر قنوطی اور بزدل ہوگئی تھی۔ میں تمھارے ساتھ ہوں۔ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمھاری ساتھی ہوں۔ مجھ پر بھروسا رکھو۔ میں تمھیں کبھی مایوس نہ کروں گی ــــــ میں تمھیں کبھی دھوکا نہیں دے سکتی ــــــ!"

سلمان نے اسے اپنے بازوؤں کی گرفت میں لے کر اس کے گھنگھریالے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ پھر اس نے بہت آہستہ سے پوچھا۔

"وعدہ ——— ؟"

"وعدہ ———" ثریا نے آنسوؤں سے بھری آواز میں دُہرایا۔

"ملاؤ ہاتھ ——— !" سلمان نے کہا۔

BUT NOT LIKE A MAN ثریا نے بیک وقت روتے اور ہنستے ہوئے جواب دیا۔ اس کے دل میں مادرانہ شفقت کا سیلاب اُمنڈ آیا جو ہر لڑکی اپنے محبوب کے لیے محسوس کرتی ہے۔

"صلح ——— ؟" سلمان نے دوبارہ پوچھا۔

"صلح ——— ! سلمان - کریک داس ! کیا میرے وقتی ڈپریشن سے تم اتنا ڈر گئے؟ تمھیں معلوم ہے میں کتنی موڈی ہوں؟"

"کیا کہنے ہیں آپ کے! پکاسو کی خالہ نہیں تو ——— !! ——— اچھا یہ بتاؤ کہ کب تک آسکو گی ——— ؟"

"جیسے ہی اسکول نے استعفا منظور کیا۔ مجھے اپنی خیریت کی اطلاع پہنچتے ہی بھجوا دینا سلمان!"

وہ دروازے میں جا کر چند لمحوں تک نیم تاریک کمرے میں کھڑی اس تنہا باہمت لڑکی کو دیکھتا رہا اور جلدی سے گلی میں اُتر گیا۔

گلی کے موڑ پر پہنچ کر وہ ٹھٹھکا اور آخری مرتبہ اس چھوٹے سے مکان پر نظر ڈالی جسے اتنے برسوں تک اس نے اپنی جدوجہد کا سمبل اور اپنی آرزوؤں کا مرکز بنا رکھا تھا ——— یہاں کتنی شامیں اس نے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر جدلیاتی، مادیت اور انقلاب پر بحثیں کرتے گزاری تھیں۔ ثریا کو اپنی پسندیدہ

کتابیں لاکر دی تھیں - ٹالسٹائی - گورکی - رومن رولاں - جواہر لال نہرو - کرسٹفر کاڈویل - ہاورڈ فاسٹ (جن میں سے بیشتر کتابیں ثریا نے ابتدائی صفحوں سے آگے نہیں پڑھیں) اس نے ثریا کو اہم مضامین اور اسپین کی خانہ جنگی کے واقعات پڑھ کر سناتے تھے - وہ پڑھتا جاتا اور وہ ایزل کے سامنے کھڑی تصویریں بناتی رہتی - بعض مرتبہ وہ جھنجھلا کر کہتا:

"ثریا ——— ثریا ——— تم تو بالکل اسپ جہالت پر سوار ہو - سنو، لینن کا نظریہ آرٹ کے متعلق کیا ہے ———؟"

"ثریا ——— ! احمق نہ بنو - بالزاک پڑھا کرو ———"

"ثریا ——— اب کی ٹرم یونی ورسٹی جوائن کرو ——— !"

"ساری دنیا میری یونیورسٹی ہے !" وہ آنکھیں گھما کر بڑے ڈرامائی طریقے سے گورکی کا جملہ دہراتی - پھر وہ دونوں خوب ہنستے - ایک رات اس نے ثریا کو جیولیس فیوچک پڑھ کر سنایا تھا اور کتاب ختم کرنے کے بعد وہ رونے لگا تھا۔

مکمل ذہنی رفاقت، مکمل جذباتی ہم آہنگی ——— کس قدر خوب صورت اور مکمل ترین دوستی ان دونوں کی تھی ——— ثریا حسین اور سلمان مرزا ——— ساتھیوں کے حلقے میں کتنے احترام سے ان کا نام لیا جاتا تھا - اس نرم و نازک، ذہین، دلکش، بہادر کسان لڑکی میں سلمان کو اپنے خوابوں کی تعبیر مل گئی تھی مستقبل کی عورت، آنے والے سماج کی ہیروئن - جو محبوبہ، بہن، بیوی اور ماں، عورت کے ہر روپ میں مکمل ثابت ہو سکتی تھی - اسے کسی خاندانی جاہ و جلال کے چھننے، کسی محلسرا کے جلنے کا غیر شعوری تاسف بھی نہ ہو سکتا تھا - کیونکہ وہ اس طبقے کی ایک فرد تھی جسے اپنی زنجیروں کے سوا اور کچھ نہیں کھونا۔

اس کے پاس ریشمی ساری ایک نہ تھی - زیورات کے نام سے ناآشنا تھی

پاؤڈر، لپ اسٹک سے اسے کراہت محسوس ہوتی تھی۔ فیشن ایبل سوسائٹی کے ڈنر پارٹیوں کا تذکرہ اس کے لیے وحشت خیز تھا۔ وہ چھوٹی بٹیا کو خاصی قابلِ رحم ہستی سمجھتی اور ہمدردی کے ساتھ اکثر سوچا کرتی —— یا اللہ —— یہ بے چاری اپنی ساری زندگی موٹر میں سوار ہو کر ایک پارٹی سے دوسری پارٹی میں جاتے اور سوئمنگ اور رولر اسکیٹنگ کرتے گذار دیں گی۔

سلمان اکثر اپنی بہن سے کہتا —— "بٹیا چلو آج تمھیں ثریا کے یہاں لے چلیں۔ ڈھنگ کی چار باتیں ذرا تمھارے کان میں پڑیں گی —— !"

"ہرگز نہیں —— !" چھوٹی بٹیا جواب دیتیں —— "ایک بات تو یہ کہ آج ہمارے کالج میں فینسی ڈریس ہے۔ دوسرے یہ کہ ثریا باجی اس قدر بلندی سے ہم سے بات کرتی ہیں کہ ہمیں رونا آجاتا ہے —— قسم سے !"

"ثریا کو تم سمجھنا ہی نہیں چاہتیں اور تم بھی کیا کرو۔ اپنے طبقے کی نمائندہ لڑکی ہو !" وہ ہنس کر کہتا۔

اسی سال ثریا کی تصویریں آل انڈیا نمایش میں دہلی بھیجی گئیں۔ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے زیرِ اہتمام اس کا "ون مین شو" الہ آباد میں منعقد ہوا۔ اور ایل ایم سین نے لکھنؤ سے آکر اس کا افتتاح کیا۔ بڑے بڑے ادیب اور دانشور اس خستہ حال مکان میں اس سے ملنے آتے جس کا سارا فرنیچر چند مونڈھوں اور دو تین کرسیوں پر مشتمل تھا۔

سلمان کو اس ثریا پر کتنا فخر تھا۔ یہ اس کا جی ہی جانتا تھا۔ آج وہ اس ثریا کو ایک انجانی مدت کے لیے تنہا چھوڑ کر بہت دور جا رہا تھا۔

ثریا کے کمرے کی کھڑکی بند ہو گئی۔ اس نے دوسرا سگریٹ جلایا اور تیز تیز قدم رکھتا گھپ اندھیری رات میں گلی کے باہر نکل گیا۔

نئے ملک میں پہنچ کر سلمان سال بھر تک روپوش رہا۔ اُسے یہ معلوم نہ ہوسکا کہ اس کے گھر والے کہاں ہیں۔ ممکن ہے وہ لوگ بیاس عبور کرتے وقت ہی مار ڈالے گئے ہوں لیکن ایک رات اسے اطلاع ملی کہ اس کے والدین اور چھوٹی بہن لاڑکانہ میں مقیم ہیں۔ اپنے لیے حالات سازگار ہوتے ہی وہ لاڑکانہ پہنچا۔ پُرشور۔ گرد آلود بازار میں سے گزرتا سندھی عاملوں کے ان سالے مکانوں پر نظر ڈالتا، جن میں اب یو۔پی کے مہاجر آباد تھے۔ وہ بالآخر اس پتے پر پہنچ گیا جو اُسے اطلاع میں بتلایا گیا تھا۔

یہ کسی ہندو بنیے کا مکان تھا۔ دروازے پر ہنومان جی، لکشمی اور گنیش جی کی مورتیاں نصب تھیں۔ سیڑھیوں پر رنگ برنگے نقش و نگار بنے تھے۔ اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے اندر جھانکا۔ ماما صحن میں انگیٹھی رکھے کھانا پکانے میں مصروف تھیں۔ بابا پلنگ پر لیٹے کچھ پڑھ رہے تھے۔

وہ دبے پاؤں اندر آ گیا۔

"بھیّا ——— !" بابا نے دیوانِ حافظ ایک طرف رکھ کر تکیے کے سہارے بیٹھتے ہوئے کہا ——— "ہم تمھارے استقبال کے لیے اٹھ نہیں سکتے۔ کیونکہ ہمارے پاؤں مفلوج ہو گئے ہیں۔"

"بھیّا ——— !" کچھ دیر بعد ماما نے اس کے آگے کھانا چنتے ہوئے کہا۔ "اگر ممکن ہو تو کراچی میں مکان لے کر ہم لوگوں کو وہاں بُلا لو۔ یہاں ان کے علاج کی بڑی دِقّت ہے۔ دنیا بھر کی بیماریوں نے انھیں آن گھیرا ہے ———"

"پروونشل سروس والوں کی پنشن کے کاغذات ابھی سرکاری دفتروں میں اٹکے

پڑے ہیں۔ قصرِ سلمان متروکہ جایداد قرار دے دیا گیا۔ الہ آباد بنک نے اطلاع دی ہے کہ اکاؤنٹس انھوں نے منجمد کر لیے ہیں تا وقتیکہ دونوں ملکوں میں موو ایبل پراپرٹی کے سلسلے میں کوئی معاہدہ نہیں ہو جاتا۔ تمھاری ماما کی زمینیں زمینداری کے خاتمے کے ساتھ چلی گئیں وغیرہ وغیرہ۔" بابا نے بڑے اطمینان سے بتایا — انھوں نے اضافہ کیا ؎

"نہ عیش نہ دکھ درد نہ آرام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا"

چھوٹی بٹیا اسکول پڑھا کر لوٹیں۔ انھوں نے سلمان کو ہکا بکا ہو کر دیکھا۔ وہ بہت دبلا اور کالا ہو گیا تھا۔ چھوٹی بٹیا کی رنگت بھی صحرا کی دھوپ میں کمھلا چکی تھی۔ دونوں بھائی بہن ایک دوسرے سے لپٹ کر بچوں کی طرح رونے لگے۔

دوسرے روز چھوٹی بٹیا نے بھی سلمان سے کہا۔

"بھیا —— ! اگر ہو سکے تو ہمیں کراچی لے چلو۔ ہماری پڑھائی کا دوسرا سال برباد جا رہا ہے۔"

"کوئی جگہ وہاں سنا ہے۔ الٰہی بخش کولونی کہلاتی ہے۔ وہاں کوارٹروں کے کرایے سستے ہیں۔ وہیں انتظام کر لو۔ ہم سے پیسے لیتے جاؤ۔" ماما نے کہا۔

"پیسے ہیں —— ؟" سلمان نے دریافت کیا۔

"مسوری سے نکلتے وقت جو گہنے ساتھ تھے وہی اب تک فروخت ہو رہے ہیں۔ چھوٹی بٹیا گریجویٹ نہیں ہیں اس لیے ان کی تنخواہ بہت کم ہے ——" ماما نے جواب دیا۔

"بٹیا کو بی۔اے۔بی۔ٹی کر لینا چاہیے۔" بابا نے کہا۔

"بھیا جاتے ہی مکان ڈھونڈتا۔" ماما نے کہا۔

"جی اچھا۔"

"چائے پی لو۔"

"جی اچھا۔"

"کراچی میں اپنے کھانے پینے کا خیال رکھو۔"

"جی اچھا۔"

وہ مدتوں سے اس طرح کی اوائی توائی اور خطرناک زندگی گزار رہا تھا۔ میم صاحب بظاہر اس کی عادی ہو چکی تھیں مگر دل میں بُری طرح کڑھا کرتیں ان کے چاند سے بیٹے نے برسوں سے کیسی بھنگل گانٹھ رکھی تھی۔ یہ دیکھ کر ان کا دل خون ہو جاتا۔ ان کے کیسے کیسے ارمان خاک میں مل گئے۔ وطن میں تھیں تو سالے ہم چشم دُر دُر پھٹ پھٹ کرتے۔ خاندان کی بیبیاں الاہنا دیتیں ——
"انجمن آرا کا اکلوتا پوت —— آوارہ نکل گیا۔ روز دوڑ آتی ہے۔ تین بار چھ چھ مہینے کی کاٹ چکا ہے۔ ایسے لڑکے کو کون اپنی بٹیا دے گا؟"

وہ خود ثریا سے بیاہ کرنا چاہتا تھا۔ بے چاری لوٹا بیگم خود تو اللہ کا جی تھیں۔ لڑکی بڑی ہو کر ایسی بے تکی نکلی —— بھیا کو تو ایسی لڑکی چاہیے جو انٹلکچوئیل، سوشلسٹ، آرٹسٹ، وارلسٹ کچھ نہ ہو بلکہ ان کے آرام اور کھانے پینے کا خیال رکھے۔ میم صاحب نے ایک دفعہ اظہارِ خیال کیا تھا۔

"خیر ثریا باجی ایسی لمبی چوڑی انٹلکچوئیل بھی نہیں ہیں ——" چھوٹی بٹیا نے ذرا جل کر جواب دیا تھا۔

"بے چاری ثریا کے متعلق تم یہ خالص نندوں والی جلی کٹی باتیں نہ کرو گی تو اور کون کرے گا ——"، سلمان نے قہقہہ لگا کر کہا تھا۔

"ثریا باجی آ گئیں ——؟" چھوٹی بٹیا نے بیٹھے بیٹھے دفعتاً سوال کیا۔

معلوم نہیں ——" سلمان نے جواب دیا - پھر گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا
"ہم دوپہر کی ٹرین پکڑ لیں تو اچھا ہے - پرسوں صبح ایک اخبار کی ملازمت کا انٹرویو ہے - اتنی مایوس نہ ہو بٹیا - حالات اتنے خراب نہیں ہیں" —— اُس نے بہن کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور ماں باپ سے رُخصت ہوا۔

باہر جھکڑ چل رہا تھا - زرد رنگ کی جلتی جلتی ریت آنکھوں میں گھُسی جاتی تھی - تارکِ وطن ہندوؤں کے رنگ برنگے ٹائیلوں والے مکانوں کی چھتوں پر بادگیر کے جنگل کھڑے تھے، اور گرم ہوا بادگیر کے سوراخوں میں منڈلا منڈلا کر سیٹیاں بجا رہی تھی - گلیوں میں مہاجر چل پھر رہے تھے۔ روزانہ کھوکھرا پار عبور کر کے راجستھان - دلّی اور یو-پی کا ایک نیا پریشان حال قافلہ ان محلّوں میں چھاؤنی چھاتا - کیسی کیسی مصیبتیں اٹھا کر لوگ ہندستان سے نکلے تھے اور یہاں ان کو کیسی کیسی مصیبتیں اٹھانا تھیں —— سلمان نے اسٹیشن کے راستے پر چلنا شروع کیا - سرخ رنگ کی عبائیں پہنے سندھی عورتیں خچّروں پر بیٹھی سامنے سے گزر گئیں - چائے خانوں میں ثریا اور شمشاد بیگم کے ریکارڈ چیخ رہے تھے - ایک غلیظ سے ریسٹوراں کے آگے جس پر "کیفِ ڈی پیرس" کا بورڈ لگا تھا - رام پور کے چند مہاجر ٹین کی کرسیوں پر بیٹھے زور زور سے باتیں کرنے میں منہمک تھے۔

"ابے چھنّن خاں - میں نے کہا —— اکیلے اکیلے مکان الاٹ کرا لیا —— یاروں کو ہوا بھی نہ لگنے دی - میاں اگر تم نے اُڑائی ہیں تو ہم نے بھون بھون کھائی ہیں - ہمیں بتا بتاتے ہو —— چھمن میاں سے نہ کہہ دیا ہو تو ——"

"ایں جاؤ یار —— ! یہاں ریاضت حسین خاں بھی کسی سے ہیٹے نہیں ہیں - اپنی بات کرو اپنی —— !"

"کھال میں رہو کھال میں —— میں نے کیا —— "

وہ آگے بڑھتا گیا۔ بازار میں چوطرف غل مچا تھا۔ بھانت بھانت کی بولیاں رنگا رنگ لہجے۔ رنگ برنگ لباس۔ خوانچے والوں کی صدائیں۔ ہر شخص نئی سرزمین پر زندہ رہنے کے لیے از سرِ نو زندگی شروع کرنے کے لیے بُری طرح ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ سلمان نے سامنے کے منظر کو دیکھا اور سر اٹھا کر تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔

اسٹیشن پر بھی مہاجروں کی ریل پیل تھی۔ سلمان ان کو دیکھ کر سوچا کیا۔ یہ جانے کون کون لوگ ہوں گے۔ کہاں کہاں سے آئے ہوں گے۔ پورب اور بہار کے باشندے، جن کے چہروں پر امس اداسی تھی۔ گول مخملی ٹوپیوں اور مخملی واسکٹوں والے رام پور اور بریلی کے بانکے۔ مراد آباد کے برتن فروش۔ علی گڈھ کے قفل گر۔ فیروز آباد کے چوڑی والے۔ فرخ آباد کے رنگ ریز۔ لکھنؤ کے زردوز اور شاعر۔ دلّی کے کرخندار۔ اعظم گڈھ اور بنارس کے جولاہے۔ مرزا پور کے قالین باف۔ ان کی بُرقع پوش عورتیں اور بچّے۔

ٹرین آنے میں ابھی دیر تھی۔ وہ پلیٹ فارم پر بیٹھ کر اس گھمسان کا نظّارہ کرتا رہا۔ وقت گزارنے کے لیے (بک اسٹال سے کوئی رسالہ خریدنے کے لیے اُس کے پاس پیسے نہیں تھے) اس نے سندھی کی تیسری کتاب نکال لی۔

پیر الٰہی بخش کولونی کے اس دو کمروں کے مکان میں دونوں طرف کیچڑ اور گڑھے تھے۔ صحن کے پچھواڑے کوڑے کرکٹ کا ڈھیر لگا تھا۔ کمروں کی دیواریں بے حد میلی تھیں اور کواڑوں میں شیشے کی جگہ اخبار کے کاغذ اور گتّے چپکا دیے گئے تھے۔ آس پاس بھی زیادہ تر مہاجر آباد تھے جو زیادہ تر سرکاری ملازم تھے۔ ان کی زندگیاں خاصی بے آرام تھیں مگر ایک عجیب و غریب ولولہ اور قومی جوش سارے میں طاری تھا۔

چھوٹی بٹیا بی۔ اے کے لیے کالج میں داخل ہوگئیں۔ سلمان کو ان کی طرف سے بہت فکر تھی۔ اپنے 'ڈی کلاس' ہونے پر کڑھتے کڑھتے انھوں نے اپنی صحت تباہ کر لی تھی۔

ایک روز کالج سے لوٹ کر انھوں نے کہا:

" ماما ــــــ ماما ! ہمیں ایک کالا برقع بنوا دیجیے "

" کیا ــــــ ؟" سلمان نے چونک کر پوچھا۔ جو پلنگ پر لیٹا پانو ہلا ہلا کر اخبار پڑھ رہا تھا۔

" بس میں سب لوگ ہمیں بُری طرح گھورتے ہیں، ہمیں سخت شرم آتی ہے۔ بس اسٹاپ پر کھڑے ہوتے ہیں تو جی چاہتا ہے کہ زمین پھٹ جائے اور ہم اس میں سما جائیں۔ سب کی نظریں تیر کی ایسی ہمیں چبھتی ہیں۔ برقعے میں کسی کو پتا نہ چلے گا کہ کون جا رہا ہے " اتنا کہتے کہتے ان کی آواز بھرّا گئی۔

سلمان اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

" اور ایسی ایسی بسیں جن کو دیکھنے سے دل دہلتا ہے "۔ چھوٹی بٹیا نے پلکیں خشک کرتے ہوئے کہا۔

" ان بسوں میں تمھارے جیسے انسان ہی سوار ہوتے ہیں۔ بٹیا ! تم اور انسانوں سے قطعی مختلف نہیں ہو ــــــ " سلمان نے کہا۔

" بٹیا ــــــ !" بابا نے اپنی چارپائی سے کہا ــــــ " یہ تمھارا خیال ہے۔ تمھیں 'چھوٹی بٹیا' سمجھ کر کوئی نہیں دیکھتا۔ لوگوں کو تمھاری اتنی پروا نہیں ہے۔ انھیں اپنے ہی غم بہتیرے ہیں "

" لیکن بابا ! پرانے شناساؤں کے سامنے کتنی بے عزتی ہوتی ہے۔ ہماری رضیہ باجی وغیرہ ہمیں روز بس اسٹاپ پر کھڑا دیکھتی ہیں اور زن سے کار میں نکل

جاتی ہیں ——— اور آج ——— !"

"آج ——— ؟" سلمان نے پوچھا۔

"آج ہم گھنٹہ بھر بس کا انتظار کرنے کے بعد پیدل صدر کی طرف آرہے تھے تو وہ ٹیبل ٹینس چیمپین نہیں ہیں عالیہ سید ——— انھوں نے کار روک لی اور کہنے لگیں "دھوپ بہت تیز ہے ——— آیئے میں آپ کو لفٹ دے دوں ——— یہ شکر ہے کہ وہ ہمیں جانتی نہیں ———" اتنا کہہ کر وہ سُوں سُوں کرتی مُنہ دھونے کے لیے غسل خانے کی طرف چلی گئیں۔

کراچی پہنچ کر جمشید نے چند روز کی بھاگ دوڑ کے بعد ایک دوست کے اشتراک سے ایکسپورٹ امپورٹ کا کاروبار شروع کر دیا اور میکلوڈ روڈ پر ایک متروکہ دفتر حاصل کرلیا۔ وہ ہندو تاجروں کے انخلا کا زمانہ تھا۔اس لیے اسے اپنا کاروبار جمانے میں بہت آسانی رہی۔ جنوری ۱۹۴۸ء کے بلوے کے بعد ایک دومنزلہ کوٹھی عامل کولونی نمبر ۲ میں خالی ہوئی تو اس نے اپنے نام الاٹ کروالی۔ اس نے بڑی محنت اور توجہ سے اپنا کاروبار پھیلایا اور ڈیڑھ سال کے اندر اندر کراچی کی نئی دُنیا میں اس کے قدم مضبوطی سے جم گئے۔

دوسرے سال وہ کان پور گیا اور اپنی ماں سے کہا۔

"اصغر اور انور کے امتحان ختم ہو جائیں تو ان کو ساتھ لے کر چلی آیئے ورنہ عالیہ اور آپ میرے ساتھ ہی چلی چلیے ۔ یہ لوگ بعد میں آجائیں گے ۔مَیں نے ایک بہت اچھے سینے ٹوریم میں آپ کے داخلے کا انتظام کر دیا ہے۔"

"اور فرحت بٹیا کو دیکھے محمد گنج نہ جیہو ——— ؟"

"میرے پاس وقت نہیں ہے - میں مصروف آدمی ہوں - آپ لوگ فوراً میرے ہمراہ چلیے، ورنہ بعد میں آجائیے گا۔"

اگلے ہفتے وہ اپنی ماں اور بہن کو لے کر کراچی آگیا - عالیہ کان پور سے بی-اے کر چکی تھی - یہاں آکر اس نے ایم-اے میں داخلہ لے لیا - وہ کان پور کالج میں بھی ٹیبل ٹینس کے کئی مقابلے جیت چکی تھی - یہاں وہ بہت جلد یونیورسٹی چیمپین بن گئی -

جمشید نے نوعمری میں آئی-سی-ایس کہلانے کے جو خواب دیکھے تھے وہ اس کو اب تک نہ بھولے تھے - وہ لاکھوں میں کھیل رہا تھا مگر جانتا تھا کہ بڑے افسر کی شان ہی دوسری ہوتی ہے - اس نے طے کر لیا کہ چھوٹے بھائیوں کو سی-ایس-پی کے امتحانات دلوائے گا - بزنس مین کا ایک بھائی اعلا عہدیدار بھی ہو تو اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے ؟

اپنی بیٹی فرحت النسا کو اس نے آج تک نہ دیکھا تھا - کچھ دنوں سے اس کے خیال نے جمشید کو بُری طرح ستانا شروع کر دیا - اس کی بچی جو بہت دُور، کسی دوسری دُنیا میں، ایک پسماندہ گانو کے ایک غربت زدہ کچے گھر میں پروان چڑھ رہی تھی - اس نے ڈرتے ڈرتے چچا ابا کو خط لکھا - ویزا بنوایا اور ہندستان روانہ ہو گیا -

گیارہ برس کے طویل عرصے کے بعد جمشید محمد گنج پہنچا - (وہ ۱۹۴۸ء میں منظور النسا کو بیاہ لے جانے کے لیے آخری بار یہاں آیا تھا) اسٹیشن پر اُتر کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ گوبندوا یکہ لیے اسی طرح اس کا منتظر ہے گویا وہ دسہرے کی چھٹیوں میں اسکول سے گھر آیا ہو -

"بھیا آئے گئین ——— !" گوبندوا نے آگے بڑھ کر کہا -

"گوبند —— چاچا —— ؟" اس نے ذرا جھجکتے ہوئے چاچا کے لفظ کا اضافہ کیا —— "تم کیسے آئے —— ؟"

"چھوٹے ساہ جی بتائے رہن کی آج کی گاڑی سے آوت ہو"

جمشید نے یکّے پر چڑھتے ہوئے دقّت محسوس کی اور ذرا جھینپ کر اپنی قیمتی پتلون کی کریز پر نظر ڈالی۔

سید مظہر علی کے مکان پر تقریباً سارا گاؤں جمع تھا —— شمبھو دادا۔ شیخ رمضان۔ مولوی محمد حسن۔ توقیر میاں۔ پنڈت لچھمی نرائن۔ گوبردھن چاچا۔ رحمت بھیا۔ گوسائیں کاکا۔ اور جانے کون کون —— بچے جوان ہو گئے تھے، جوان ادھیڑ ہو چلے تھے اور بوڑھے قبروں میں پاؤں لٹکائے تھے۔ گوبند چاچا نے اسے گلے لگایا اور بھوں بھوں کر کے روئے۔ جھینگا پاسی کی خوشی کے مارے باچھیں کھلی جا رہی تھیں اور وہ احمقوں کی طرح منہ کھولے بھیا کو تک رہا تھا۔ ساری بستی میں اودھم مچی ہوئی تھی —— 'جمشید بھیا پاکستان سے آئے ہیں —— بڑے رئیس ہو گئے ہیں —— یہ بڑی سونے کی گھڑی لگائے ہیں —— بالکل جنٹ صاحب معلوم پڑتے ہیں ۔'

جمشید کی نظروں نے بہت سے مانوس چہروں کو تلاش کیا، جو اب موجود نہ تھے۔ چپاتی بھانڈ مر چکا تھا۔ سلامو ہبوڑن مر چکی تھی جو نکڑ پر سگریٹ پان بیچا کرتی تھی۔ نواب منّن خاں اب بھی ڈاکے ڈالتے تھے اور ان دنوں جیل گئے ہوئے تھے۔

منظور النسا کو جب سے معلوم ہوا تھا کہ جمشید آنے والے ہیں وہ جلے پاؤں کی بلّی کی طرح سارے گھر میں پھرتی رہی تھی۔ اس نے دالان اور کوٹھریوں کی تندہی سے صفائی کی تھی۔ گھر کے سارے برتن مانجھ مانجھ کر چمکا دیے تھے۔ جھینگا پاسی کی عورت کے ساتھ مل کر دالان اور آ سارا لیپا تھا۔ پلاؤ اور فیرنی کے لیے

چاول صاف کیے تھے۔ آدھی رات سے اٹھ کر صبح کا ناشتہ تیار کیا تھا۔ اس کے ماں باپ اُس کی یہ سرگرمی اور مصروفیت دیکھتے اور الم سے نظریں جھکا لیتے فرحت النسا کے لیے اس نے تین دن اندھیرا پڑے تک صحن میں بیٹھ کر ہاتھ سے نیا جوڑا سیا تھا۔

ٹرین کے آنے کا وقت ہوا تو منظور النسا نے لڑکی کو نہلا دھلا کر گوٹے لچکے کا نیا جوڑا پہنایا۔ اس کے بالوں میں تیل لگا کر مینڈھیاں گوندھیں۔ ناشتے کا سامان تخت پر چُنا اور خود اسی طرح بکھرے بالوں کو مَیلے دوپٹے میں سمیٹتی چہرے کا پسینا خشک کرتی کوٹھے پر چلی گئی۔ وہاں وہ چھت کی منڈیر سے لگ کر بیٹھ گئی۔ اور پرنالے کے موکھے میں سے اسٹیشن کی طرف سے آنے والی سڑک کو تکتی رہی۔ جب جمشید یکّے سے اُترا تو منظور النسا نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھا اور لرزتی رہی۔ جمشید نے سیّد مظہر علی کو جھک کر سلام کیا ——— گانو والوں کے گلے لگا اور اندر جا کر اپنی بیٹی کو لپٹا لیا۔

شاہ منوّر علی خانقاہ کے حجرے میں سے نکل آئے۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرا مگر مُنہ سے کچھ نہ بولے اور پھر خانقاہ واپس چلے گئے۔ سیّد اختر علی کو بلانے کے لیے بہت سے آدمی دَوڑے۔ مگر گومتی کے کنارے ان کی جھونپڑی خالی پڑی تھی۔ وہ غائب ہو چکے تھے۔

جمشید ہفتہ بھر وہاں رہا اور سارے وقت اس نے سیّد مظہر علی اور ان کے احباب کو کراچی کی ایسی ایسی محیّر العقول داستانیں سنائیں کہ ان لوگوں کے مُنہ کھلے کے کھُلے رہ گئے۔ بڑی مشکل اور محنت سے اس نے ان بوڑھوں کو ایکسپورٹ، امپورٹ، بلیک مارکیٹ، پگڑی، لائسنس، پرمٹ اور الاٹ منٹ کے معنی سمجھائے۔

"سمجھ گئے۔ پگڑی تو یوں جانو جیسیں ہم پہنچ کے یہاں صاحب لوگ کی ڈالی ہوتی

رہی ــــــ" شمبھو دادا نے سر ہلا کر کہا ـــــ "بجز بھینٹ نہ کہو، پگڑی کہہ لیو۔"

"ای سب تو ہم ہُو جانت ہیں" ــــ پنڈت لچھمی نرائن مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ اس پوری محفل میں محض وہی واقفِ اسرار تھے۔ کیوں کہ ان کا انگریزی داں بھانجا کئی برس سے دہلی میں ٹھیکے لے رہا تھا اور اب اس نے بمبئی میں بھی بزنس اور ایکسپورٹ امپورٹ شروع کر دی تھی۔ اور ایک مرتبہ اس نے محمد گنج آ کر اپنے ماما کو دہلی اور بمبئی کے بے انتہا محیر العقول داستانیں سنائی تھیں ــــ

"ہمرے گاؤں سے خالی دوئی ٹھو منئی بہُو نے قابل نکسے ہن۔" توقیر میاں نے فخریہ کہا ــــ "ایک تمہرا بھیگو اور ایک ای جمشیدوا۔"

"اسلامی دارالخلافہ ہے۔ کراچی میں مساجد تو ایک سے ایک شان دار بن گئی ہوں گی۔" مولوی محمد حسن نے کہا۔

"جی ــــ!" جمشید نے مختصر جواب دیا۔

"انگریزوں کو بڑی دِقّت پڑتی ہوگی۔ تمھارے کے یہاں۔" مولوی صاحب نے مزید اظہارِ خیال کیا۔

"کیوں ــــ؟" جمشید نے پوچھا۔

"ارے ام الخبائث جو ممنوع ہوگی۔ ماشاءاللہ سے اسلامی ملک ہے۔"

جمشید نے دل میں سوچا کہ اگر ان بے چاروں کو معلوم ہو جائے کہ ان کا عزیز بھتیجا کراچی جم خانہ میں روزِ شام کو گھڑوں وسکی لنڈھاتا ہے ــــ "جی نہیں ابھی تو ممنوع نہیں ہوئی ــــ" جمشید نے ذرا بے تعلقی سے جواب دیا۔

"ہمارے کے ہاں تو لگ گئی ہے پابندی" ــ مولوی صاحب نے کہا پابندی

سے کیا ہوت ہو —— پنڈت لچھمی نرائن نے جو واقف اسرار تھے، کہا ——
"پھیگو بتاوت رہا کی لوگ اب مُلک چھپ کے اور جیا ستی پیت ہیں دارُو ۔"

پابندی کیا شئے ہے ۔ جمشید نے فلسفیانہ انداز میں سوچا —— اخلاقی سیاسی، مذہبی پابندیاں —— گذر گیا اب وہ دورِ ساقی کہ چھُپ کے پیتے تھے پینے والے —— بنے گا سارا جہان میخانہ ہر کوئی بادہ خوار ہوگا ——، اس نے دل میں دہرایا ۔ مگر اب اس کا دماغ جانے کہاں سے کہاں نکل گیا تھا ۔ وہ پھر محمدؐ گنج کی درگاہ کے نیم تلے واپس لوٹا ۔

"بھیا تنک ای تو بتاؤ تمھارے کے ہاں قومی پہناوا کیا ہے —— ؟"
توقیر میاں نے سوال کیا —— "ہمارے کے یہاں تو افسران کو حکم مل گیا ہے، کی ولایت جائیں تو قومی پہناوا پہنیں"۔ وہ مدینہ (بجنور) اور قومی آواز (لکھنؤ) باقاعدگی سے پڑھتے تھے ۔

"پاکستان میں تو مستورات پردے میں رہتی ہوں گی ۔ اسلامی مُلک ہے"
مولوی صاحب نے کہا —— "ہمارے کے ہاں تو آزادی کی ہوا بہت چل گئی ہے" ——

شیخ رمضان اور توقیر میاں اور دوسرے مسلمان بوڑھے پاکستان کی باتوں کو بے حد عقیدت سے سُن رہے تھے ۔

"فرحت النسا کیا پڑھ رہی ہے ؟" جمشید نے موضوع گفتگو تبدیل کرنے کے لیے اپنے چچا سے استفسار کیا ۔

"ہم خود پڑھاتے ہیں ۔ اُردو اور قرآن شریف ۔ شمبھو بھیا انگریزی بھی پڑھا دیتے ہیں ۔ اے ۔ بی ۔ سی ۔ ڈی —— گوسائیں بھیا اسے ہندی پڑھا رہے ہیں" —— سیّد مظہر علی نے فخر سے بتایا ۔ جمشید کو ایسا محسوس ہوا جیسے

گاؤں کے لوگ اس کی بیٹی کو اپنی ذاتی ذمّے داری سمجھتے تھے - وہ یہ کہنے ہی والا تھا کہ اس کا ارادہ ہے کہ کراچی لے جانے کے کچھ عرصے بعد وہ فرحت النسا کو تعلیم کے لیے سوئٹزرلینڈ بھیج دے مگر اب چچا ابّا اور شمبھو دادا اور گوسائیں کاکا کو یہ بتاتے ہوئے اُسے بے حد شرم آئی - جیسے وہ ان افلاس زدہ لوگوں کا مذاق اڑانے والا ہو - اپنی پستی اور ان معصوم لوگوں کی بلندی کا اسے شدّت سے احساس ہوا - وہ سر جھکا کر چبوترے پر نیم کے تنکے سے لکیریں کھینچنے لگا -

منظور النسا کا اس سے پردہ تھا مگر جب تک وہ یہاں رہا وہ کواڑ کی درزوں میں سے چھُپ چھُپ کر متواتر اسے دیکھا کی - ایک بار اس کی ماں نے اُسے اس طرح جھانکتے دیکھ پایا تو وہ اس پر برس پڑیں ——— "اری جنم جلی! بھیّا اب تیرے لیے نامحرم آئیں - تیرا سامنا ہوگا تو گناہ ہوئیہے ——— پاپ ہوئیہے ———!"

"نامحرم آئیں - ہمرے چچا کے پوت تو ہوں" ——— منظور النسا نے غم و غصّے سے کھولتے ہوئے دبی زبان سے کہا -

"بے حیا ——— بے شرم ——— بے غیرت ———!" سید منظہر علی کی بی بی بکتی جھکتی مہمان کے لیے پلاؤ دم کرنے باورچی خانے میں چلی گئیں - منظور النسا وہیں کواڑ سے لگ کر زمین پر بیٹھ گئی اور بلک بلک کر آہستہ آہستہ روتی رہی -

جمشید فرحت النسا کو محمّد گنج سے اپنے ساتھ کراچی لے آیا - وہاں پہنچتے ہی اس کے لیے ایک اینگلو انڈین گورنس مقرر کی اور اسے ایک اعلا درجے کے پرائیویٹ اسکول میں داخل کر دیا گیا - عالیہ نے بھتیجی کی تعلیم و تربیت اپنے ہاتھ میں لے لی - اب وہ گھر پہ اور اسکول میں فیری کہلاتی تھی اور چند سال کے اندر اندر بڑی اسمارٹ اور تیز و طرار TEEN AGER بن چکی تھی جو تنگ موریوں

کی شلوار، بغیر آستین کی نہایت چست قمیص پہنتی تھی اور دوپٹے کے بجائے ایک قسم کا پٹا گلے سے پر لٹکائے رہتی تھی۔ اور راک این رول کی ماہر تھی۔ اپنے نانا کے آنگن کو اس نے کبھی بھولے سے بھی یاد نہیں کیا۔

عالیہ گاہے بہ گاہے سید مظہر علی کو یہاں کی خیر خبر سے مطلع کرتی رہی۔

—— آج بھیا نے نئی کار خریدلی۔ ماشاءاللہ سے چالیس ہزار کی آئی ہے۔

—— کل بھیا کاروبار کے سلسلے میں یورپ روانہ ہوگئے۔ یہ بھیا کا یورپ کا چوتھا سفر ہے!

—— میں اگلے مہینے نیویارک جارہی ہوں (یہ امریکہ میں ایک بہت بڑا شہر ہے)۔

—— فیری بٹیا اسکول کی لڑکیوں کے ساتھ مری گئی ہیں (یہ مغربی پاکستان میں ایک پہاڑی مقام ہے)۔

"—— میں یہ سطریں پُرسکون اور ہرے بھرے سلہٹ کے رسٹ ہاؤس میں بیٹھی لکھ رہی ہوں۔ سامنے ڈھلوان پر سُرما ندی بہہ رہی ہے۔ عقب میں درختوں سے گھری ایک بہت بڑی جھیل ہے۔ پہلو میں ندی کے سُرخ رنگ کے عظیم الشان اور بلند و بالا آہنی پُل پر سے راہ گیروں، سائیکل رکشاؤں اور اِکا دُکا موٹروں کا لامتناہی جلوس گزر رہا ہے۔ میں کھڑکی کے پاس پلنگ پر بیٹھ کر تم کو دن بھر یہ "خط" لکھتی رہوں گی۔ اور پھر اسے اپنے ٹرنک کی تہہ میں چھپا دوں گی۔ پچھلے برسوں میں مَیں نے اس طرح کتنے ان گنت مفصل خط، لکھ لکھ

کر بکس میں مقفل کر دیے ہیں یا تلف کر دیے ہیں ۔ ان مختصر اکّا دکّا سطور میں جو ہم دونوں فرضی ناموں سے ایک دوسرے کو بھیجتے ہیں ان کے رمز و کنایے، مبہم الفاظ، تلمیحات اور محتاط استعاروں میں تم سے باتیں کرنے کی کوشش کے بعد جب میرا دم گھٹنے لگتا ہے تو میں بیٹھ کر بے حد لمبے چوڑے کھرّے خط تمھیں لکھتی ہوں ۔ جب بھی تم سے "بلاکم و کاست" اور مفصل باتیں اور گپ شپ کرنے کو بے طرح جی چاہتا ہے تو میں کاغذ قلم لے کے بیٹھ جاتی ہوں اور سوچتی ہوں، کاش یہ پلندے تم تک پہنچ سکتے ۔ مگر مجھے یقین ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا، جب میں یہ سارے طولانی دفتر تمھیں پڑھنے کو دوں گی تاکہ RETROSPECT میں تم سے ہم کلام ہو سکوں ۔

ابھی سرکٹ ہاوس کا چھدری داڑھی اور لمبے لمبے دانتوں والا شفیق بُوڑھا بیرہ میرے لیے چائے لے کر آیا ہے، وہ مجھے اپنے گانو کے اور سلہٹ کے اولیاء کے بڑے دلآویز قصّے سنایا کرتا ہے ۔

رات کو سلہٹ کے بازار میں دُور دُور تک شمعیں جلتی ہیں ۔ بڑا عجیب، غیر حقیقی، پرستان کا ایسا نظارہ ہوتا ہے ۔ سرکٹ ہاؤس کے پہلو میں غدر کے وقت کے کسی انگریز فوجی افسر کی قبر ہے ۔ اس کے چاروں طرف سبز گھاس پر ایک گائے دن بھر چرا کرتی ہے ۔ یہاں پر کس قدر امٹ سکون ہے ۔ کل میں نے چائے کے باغوں میں گھوم کر دن بھر اسکیچ بنائے ۔

آج مجھے مشرقی پاکستان آئے پورے چھے سال ہو گئے ۔ لیکن ایسا لگتا ہے، جیسے کل کی بات ہو۔ ۱۹۴۹ء کے آخر میں، مجھے

مجھے تمہارے متعلق اطلاع ملی تھی کہ تم مشرقی پاکستان میں ہو۔ اس مبہم سی خبر کے بھروسے پر میں نے اسکول سے استعفا دیا اور ڈھاکے آگئی۔ یہاں پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ وہ اطلاع غلط تھی۔ یہاں میں نے وہی جدوجہد اور محنت کی زندگی بسر کرنا شروع کر دی جس کی وجہ سے تم کو مجھ پر اتنا فخر ہے اور جس سے میں اب بُری طرح تھک چکی ہوں۔ میرے کانوں میں تمھاری آواز گونجتی ہے خدا جانتا ہے ثریا، تم زندگی میں تھوڑے سے آرام، تھوڑی سی آسایش کی مستحق ہو —— کئی بار ایسا ہوا ہے کہ جب پدما کے گہرے پانیوں میں میری کشتی پہنچتی ہے تو بے اختیار میرا جی چاہتا ہے کہ ندی میں کُود کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لوں —— لیکن پھر تمھاری آواز میرے دل کے کانوں میں آتی ہے —— "تم بھی ہمیں مایوس کر رہی ہو لڑکی! —— ہمیں مایوس نہ کرنا —— بہادر لڑکی —— سپاہی لڑکی ——"

بعض اوقات میں سوچتی ہوں کہ یہ سب بکواس ہے، تمھارا دماغ خراب ہے، تم جھک مار رہے ہو۔ میرا دماغ خراب ہے، میں بھی جھک مار رہی ہوں۔ مگر پھر مستقبل کا بھروسا آڑے آتا ہے خود کو یقین دلاتی ہوں کہ ایک نہ ایک روز مجھے ضرور ہی زندگی میں خوشی ملے گی —— "امید" بھی کیا چیز ہے —— اگر نہ ہو یہ فریب پیہم، تو دم نکل جائے آدمی کا۔

آج کل اسکول میں چھٹیاں ہیں، جہاں میں آرٹ ٹیچر ہوں میں اپنی ایک سہیلی کے ہمراہ سلہٹ آئی ہوئی ہوں۔ اُس کا شوہر

یہاں دَورے پر آیا ہے۔ وہ دونوں کل سے مولوی بازار گئے ہوئے ہیں اور میں آج دن بھر تم سے باتیں کرتی رہوں گی۔

مشرقی بنگال کتنا خوبصورت ہے۔ یہاں کے لوگ کتنے پیارے ہیں۔ کبھی ایسا ہوگا کہ تم میرے ساتھ ہوگے اور میں تمھاری موجودگی میں ان جنگلوں اور ان ندیوں کی تصویریں بناؤں گی؟

تم نے اخباروں میں پڑھا ہوگا۔ یار لوگوں نے اُڑا دیا ہے کہ میرے فن کا " بنگالی پیریڈ" شروع ہوگیا ہے۔ بکواس! میں تو اپنی زندگی کا اہم ترین، خوبصورت ترین، پیریڈ شروع کرنا چاہتی ہوں اور تمھیں خوب معلوم ہے اس پیریڈ کا نام کیا ہوگا؟ ڈھاکے میں میری دو نمائشیں ہو چکی ہیں۔ تمھارے بغیر یہ سارا گورکھ دھندا مجھے کاٹنے کو دوڑتا ہے۔

آج میری اکتیسویں سالگرہ ہے یعنی آج سے اکتیس برس قبل میں اس " آنسوؤں کی وادی" میں روتی چلّاتی داخل ہوئی تھی جس ماحول میں مَیں نے آنکھیں کھولیں وہاں چاندی کے شمعدانوں کے بجائے شکستہ لالٹینیں تھیں۔ " ہیپی برتھ ڈے" کے سُروں کے بجائے گائے بیلوں کی گھنٹیاں تھیں اور چاکلیٹ کیک کے بجائے اوپلے تھے۔ میری اس دنیا میں سالگرہ کے جشن نہیں منائے جاتے تھے۔ تم جس طلسماتی دُنیا میں پیدا ہوئے وہاں تمھاری " برتھ ڈے" پر قصرِ سلطان میں دھوم کی فینسی ڈریس پارٹی منعقد کی جاتی تھی —!

بہر حال آج میں اس وقت پہلی بار اپنی سالگرہ منا رہی ہوں اور سالگرہ منانے کا طریقہ مَیں نے یہ سوچا ہے کہ مَیں تم کو اکتیس ۳۱ صفحے

کا خط لکھوں گی اور اس کے بعد اڑتیس صفحات کا اس میں مزید اضافہ کروں گی جو تمھاری عمر کے اعداد ہیں۔ اس حساب سے ہم دونوں کی مجموعی عمر اکھتر برس کی ہے یعنی تم اور میں ہم دونوں نے اکھتر برس اکٹھے گزارے ہیں۔ جوانی کے خواب اور ولولے اور جنوں خیزیاں ——— پختہ سالی کا جذباتی توازن، بڑھاپے کا آرام اور سکون اور رفاقت اور دردمندی ———

CALM OF MIND ALL PASSION SPENT

"پچھلے ہفتے یہاں آکر جب میں "قمر جہاں بیگم" کو ایک مختصر سا خط پوسٹ کرنے گئی تو مجھے ڈاک خانے کا راستہ معلوم نہ تھا اور میں سڑک پر چلتی ہوئی ایک سرکاری بنگلے میں داخل ہو گئی جسے دُور سے میں ڈاک خانہ سمجھتی تھی۔ میں سیدھے کمرے میں چلی گئی اور وہاں ایک شکستہ سا گاؤن پہنے ایک بنگالی وکیل مجسٹریٹ کے سامنے کھڑا جرح کر رہا تھا۔ میں ضلع کی عدالت میں گھس گئی تھی اس وقت مجھے دفعتاً خیال آیا کہ میرا اور تمھارا ——— ہم دونوں کا ——— عدالتوں سے کتنا تعلق رہا ہے!

تمھارا آخری خط مجھے چھ مہینے ہوئے ملا تھا جس میں تم نے صرف اتنا لکھا تھا ——— "پرسوں رات بابا کا انتقال ہو گیا۔ اگر تم اس وقت ہمارے پاس ہوتیں تو ہم اپنی آنکھیں تمھارے ہاتھوں میں چھپا لیتے اور خوب روتے ——— بابا نے کبھی اس کا شکوہ نہ کیا کہ اگر ان کا بیٹا کہیں افسری کر رہا ہوتا تو ان کو یہ مصائب نہ جھیلنے پڑتے ———"

اس کے بعد سے تم بالکل خاموش ہو۔ نظر بندی کی گذشتہ مدتوں میں تم مجھے برابر لکھتے رہے ہو۔ میں سوچ سوچ کر باؤلی ہوئی جا رہی ہوں ۔

اب سُرما ندی پر شفق کی سُرخی پھیل گئی ہے اور بازار میں موم بتیاں جھلملانے لگی ہیں ۔ اور ———"

جمشید اپنے ڈرائنگ روم میں چند مہمانوں کے لیے کاک ٹیل تیار کر رہا تھا۔ جب نوکر نے آکر اطلاع دی ———

" صاحب! کوئی بڑے میاں آئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ آپ کے والد ہیں "

" میرے والد ——— ؟" جمشید جلدی سے باہر گیا۔

نارنجی کفنی میں ملبوس سیّد اختر علی موٹر رکشا میں بیٹھے تھے ۔ چھوٹا سا ٹین کا بکس، دری میں لپٹا ہوا بستر اور لوٹا ان کے قدموں میں رکھا تھا ۔ انھوں نے آنکھیں اُٹھا کر جمشید کو دیکھا اور مسکرائے ۔

" ہمیں بشارت ہوئی تھی کہ پاکستان چلے آئیں " انھوں نے اطمینان سے کہا ۔

" میں یہ اہم اطلاع تمھیں بھجوا رہی ہوں کہ میں عنقریب کراچی پہنچنے والی ہوں ۔ یہ چند سطریں میں تم کو نرائن گنج جاتے ہوئے لانچ میں لکھ رہی ہوں۔ میں نے اتنا روپیا جمع کر لیا ہے کہ کراچی پہنچ سکوں اور جب تک وہاں کام نہ

ملے میں ـــــــ"

ایک روز چھوٹی بٹیا اسکول پڑھا کر لوٹیں تو انھوں نے چائے پیتے ہوئے حسب معمول صبح کے اخبار میں "ضرورت ہے" کا کالم پڑھنا شروع کیا ـــــــ ایک بڑی فرم میں ری سیپشن اسٹ کی جگہ خالی تھی۔

دوسری صبح اسکول سے چھٹی لے کر وہ اس پتے پر ویسٹ وہارف کی ایک نئی عمارت پر پہنچیں۔ تیسری فلور کی گیلری میں ایک اینگلو پاکستانی لڑکی نے ان سے پوچھا ـــــــ

"یس پلیز ـــــــ؟"

چھوٹی بٹیا نے بہت گھبراتے ہوئے بیگ سے اخبار کا تراشا نکالا۔

"امیدواروں کا انٹرویو کون کرتا ہے ـــــــ؟"

"ـــــــ مینجنگ ڈائرکٹر خود ـــــــ آپ کا ان سے اپوائنٹمنٹ ہے؟"

"نہیں!"

"اپنی درخواست مجھے دے دیجیے!"

"درخواست تو میں نے لکھی نہیں ـــــــ"

لڑکی کو چھوٹی بٹیا کی گھبراہٹ اور پریشانی دیکھ کر ترس آگیا۔

"آپ یہیں ٹھہریے۔ میں بوس سے کہتی ہوں"

چند منٹ بعد وہ واپس آئی اور چھوٹی بٹیا اس کے ساتھ ساتھ ایک اور خشک اور نیم تاریک جھل مل کرتی گیلری میں سے گزرتی ایک وسیع ایرکنڈیشنڈ کمرے میں داخل ہوئیں، جس میں بہت بڑا اسبز رنگ کا قالین بچھا تھا اور ہلکی سبزی مائل

سفید جھلملیوں والے طویل دریچے کے نیچے اور ایک طویل و عریض میز کے اس پار مینجنگ ڈائرکٹر گھومنے والی کرسی پر بیٹھا کاغذات پر دستخط کرنے میں مصروف تھا۔ وہ سانولی رنگت کا خاصا خوش شکل آدمی تھا۔ اس کی عمر چالیس بیالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ آنکھوں میں سنجیدگی اور ایک نوع کی سوچ تھی۔ دستخط کرنے کے بعد اس نے ڈکٹا فون میں کچھ کہا اور پھر لکھنے میں مصروف ہوگیا۔ اینگلو پاکستانی لڑکی چھوٹی بٹیا کو اندر پہنچا کر جا چکی تھی۔ وہ میز کے قریب جا کر کھڑی ہو گئیں مگر مینجنگ ڈائرکٹر اسی طرح کاغذات میں منہمک رہا۔ (یہ اس کی خاص تکنیک تھی تاکہ نووارد پر ظاہر ہو سکے کہ اس کا ایک ایک منٹ کتنا قیمتی ہے)۔

فائل بند کرنے کے بعد اس نے سر اٹھایا۔

"سلام علیکم!" ——— چھوٹی بٹیا نے کہا۔

"سلام علیکم! ——— فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"آپ کے یہاں ایک جگہ خالی ہے۔"

"جی ہاں! ——— جی ہاں!! تشریف رکھیے۔" اس نے امیدوار کا ماہرانہ نظروں سے جائزہ لیا۔ لڑکی میں شدت کی سیکس اپیل تھی۔ چھوٹا سا قد، بہت سفید رنگت، چھوٹی چھوٹی شربتی آنکھیں، سنہری مائل، بالکل جاپانی گڑیا ایسی۔ بالوں کی اس نے خوب موٹی سی ایک چوٹی گوندھ رکھی تھی جو ترشیدہ بالوں کے مروجہ فیشن کے مقابلے میں بہت انوکھی اور بھلی معلوم ہو رہی تھی۔

"آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟" اس نے دل میں فوری فیصلہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"سلمیٰ مرزا۔"

اس نے کاغذ پر نام لکھ لیا۔

"کوالی فی کیشنز ؟"

"بی ۔ اے ۔ بی ۔ ٹی"

"پہلے کبھی کام کیا ہے ؟"

"جی نہیں ——— جی ہاں ! ——— جی ہمارا مطلب ہے ہم نے کسی دفتر میں کام نہیں کیا ۔ ہم اسکول ٹیچر ہیں"

مینجنگ ڈائرکٹر لڑکی کے اس "ہم" کہنے کے انداز پر زیر لب مسکرایا ۔ پھر تھوڑے سے وقفے کے بعد اس نے کہا ۔

"بہت خوب ! دیکھئے ہمارے یہاں صرف یہ کام ہے کہ یہاں دفتر میں آپ کو ہمارے غیر ملکی کلائنٹس کو ریسیو کرنا ہوگا ۔ علاوہ ازیں جب کبھی میں غیر ملکی تاجروں، اعلا افسروں وغیرہ کو میٹروپول یا جم خانہ وغیرہ میں مدعو کروں تو ان کو انٹرٹین کرنے کے سلسلے میں بھی آپ میرا ہاتھ بٹائیں گی ۔"

"مگر ———" چھوٹی بٹیا نے کہنا چاہا ۔

مینجنگ ڈائرکٹر نے ان کی سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے بات جاری رکھی ———

"آپ یقیناً آج کل کے مغربی طور طریقوں سے واقف ہوں گی اور ڈانس بھی کر سکتی ہوں گی ۔ معاف کیجیے گا، یہ سوال میں اس لیے کر رہا ہوں کہ میں نے پچھلے دنوں ایک پاکستانی لڑکی کا اسی کام پر تقرر کیا مگر وہ پارٹیوں میں بات کرتے گھبراتی تھی اور ٹیبل مینرز TABLE-MANNERS سے اچھی طرح واقف نہ تھی ۔ تو میرا مطلب ہے کہ آج کل اعلا پیمانے کے کاروبار میں پبلک ریلیشنز کی اہمیت بہت زیادہ ہو گئی ہے ۔ میں کسی یوروپین لڑکی کو باسانی اس جگہ پر رکھ سکتا ہوں مگر آپ جانتی ہیں آج کل یوروپین اور امریکن حضرات مشرقی خواتین سے کس قدر متاثر ہیں"۔

"جی ——— لیکن ——— ہم ———"

مینجنگ ڈائرکٹر فوراً بھانپ گیا کہ امیدوار یہ عہدہ قبول کرتے ہوئے جھجک رہی ہے مگر وہ جانتا تھا کہ ایسی غیر معمولی دل کشی اور سیکس اپیل کی مالک لڑکی اسے آسانی سے دستیاب نہ ہوگی۔ اور اسے اپنا "آئیڈیا" سیل کرنا بھی خوب آتا تھا۔ اس نے لڑکی کو سمجھانا شروع کیا ——— چند منٹ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے کرتے وہ پھر اپنے موضوع کی طرف لوٹا ——— "مثال کے طور پر ——— یہ دیکھیے کہ مغربی ممالک کی مشہور ایر لائینز اپنی ایر ہوسٹس لڑکیوں کو ساریاں اور کیمونو پہنا رہی ہیں۔ محض اس لیے کہ مسافروں کو ———"

"جی ——— مگر ———"

"نیو یارک کی اقوام متحدہ میں خود دیکھ کر آیا ہوں جو گائڈ لڑکیاں مشرقی ممالک کی ہیں۔ ان کے پیچھے سیاحوں کا جم غفیر چلتا ہے۔ یہ کوئی ایسی پریشان کن بات نہیں ہے تو پھر طے ہے ——— مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ بڑی مکمل سکریٹری ثابت ہوں گی۔ پہلی مارچ سے میں آپ کا تقرر کیے لیتا ہوں۔ آپ کی تنخواہ ساڑھے سات سو روپے ماہوار ہوگی ———" اس نے کن انکھیوں سے امیدوار لڑکی کا ردِّعمل دیکھا اور گھنٹی بجائی۔ دبیز پردوں میں سے ایک سیاہ فام گوانی کلرک جن کی طرح نمودار ہوا۔

"مسٹر پیٹرک! ——— آپ مس مرزا ہیں۔ ان کو میں اپنا سوشل سکریٹری مقرر کر رہا ہوں۔ ان کا ذاتی فائل تیار کیجیے!"

"یس سر ——— !"

پندرہ منٹ کے اندر اندر ساڑھے سات سو روپے ماہوار پر اس کا تقرر ہوگیا۔ یہ بات چھوٹی بٹیا کو بہت عجیب لگی۔

"لیکن ہم سمجھتے تھے کہ یہ اشتہار آفس ریسپشنسٹ کے لیے تھا۔" انھوں

نے ایک بار پھر احتجاج کیا۔

"جی ہاں! مگر آپ کو دیکھ کر میں نے اپنا خیال بدل دیا" مینجنگ ڈائرکٹر نے کرسی کا رُخ گھمایا اور لڑکی کی بڑھتی ہوئی گھبراہٹ دیکھ کر دل میں سوچا —— بہت بھولی اور ذرا بے وقوف بھی ہے اور بے حد ضرورت مند' اور ناتجربہ کار تو یقیناً ہے!

"دوسری بات یہ ہے" —— اس نے بآواز بلند کہا —— "کہ آپ رہتی کہاں ہیں؟"

چھوٹی بٹیا نے اپنا پتا بتلایا۔

"اوہ ——!" مینجنگ ڈائرکٹر کے مُنہ سے نکلا۔

چھوٹی بٹیا ساری کا پلّو سنبھال کر اُٹھیں۔

"آپ کو یہ ملازمت منظور نہیں ہے؟"

چھوٹی بٹیا نے لحظے بھر کے لیے آنکھیں بند کرلیں۔

بابا کے انتقال اور بھیّا کے چلے جانے کے بعد وہ اسی طرح لشتم پشتم ایک پرائیویٹ اسکول میں پونے دو سو روپے ماہوار پر پڑھاتی رہی تھیں۔ وہ ہر اتوار کو بھیّا کے لیے اچھے اچھے پھل اور ان کے پسندیدہ سگریٹ اور نئی نئی کتابیں اور رسالے لے جانا چاہتی تھیں مگر وہ اس تنخواہ میں ممکن نہ تھا۔ پھر بھیّا یہاں سے کہیں بہت دُور بھیج دیے گئے تھے اور اسے بہاول پور کے ایک گرلز اسکول میں سکنڈ مسٹریس کی جگہ مل گئی تھی۔ کولونی کا مکان انھوں نے بہار سے آئے ہوئے ایک دوہیالی رشتے دار کے حوالے کیا تھا اور ماما کو ساتھ لے کر بہاول پور چلی گئی تھیں۔ وہاں زندگی کے مزید پانچ جھلسے ہوئے برس انھوں نے تپتے ہوئے ریگستان کے وسط میں ایک دُور افتادہ' گمنام تحصیل میں لڑکیاں پڑھاتے گزارے تھے' وہاں

ماما پر دل کے دَورے پڑنے لگے تھے۔ اس تحصیل میں ان کا علاج ناممکن تھا۔ اس لیے وہ ماما کو ساتھ لے کر پھر کراچی آگئی تھیں۔ پچھلے ایک برس سے وہ پھر کولونی کے اسی مکان کے ایک کمرے میں رہ رہی تھیں۔ جس پر اب ددھیالی رشتے دار نے قبضہ کر لیا تھا اور اسی پرائیویٹ اسکول میں پڑھا رہی تھیں۔ اس ایک برس میں کلیم کے دفتر کے چکر لگاتے لگاتے ان کی ٹانگیں تھک چکی تھیں۔ ضروریات زندگی پوری کرنے کے لیے اور ڈاکٹروں اور ہسپتالوں کی دَوڑ بھاگ میں بسوں اور سائکل رکشاؤں پر اور پیدل شہر کی خاک چھانتے چھانتے اب ان میں سکت نہ رہی تھی۔ مگر بھیا کا کبھی کبھار جو خط آتا تھا وہ اس میں کتنے پیارے الفاظ میں ان کی ہمت بندھاتے تھے ——— اور وہ پھر سر اٹھا کے زندہ رہنے کی جدوجہد میں مصروف ہو جاتی تھیں ——— وقت کتنی تیزی سے گزر رہا تھا۔ بابا کو مرے، بھیا کو گھر سے گئے کتنی مدت گزر گئی تھی۔ ۱۹۶۱ء آچکا تھا۔ پچھلے پندرہ برس میں ایک دن، ایک رات ایسی نہ آئی تھی جب وہ فکروں اور پریشانیوں اور غم و الم سے ایک لمحے کے لیے آزاد ہوئی ہوں۔ جب انھیں روزی کمانے کے لیے جی توڑ کر محنت اور تگ و دو نہ کرنی پڑی ہو۔ ساڑھے سات سو روپے ماہوار ——— ساڑھے سات سو روپے ماہوار ——— ناقابلِ یقین ——— اور دُنیا کی لڑکیاں دفتروں میں کام کر رہی تھیں۔ دفتر میں سکریٹری کا کام کرنا قطعاً کوئی گھٹیا بات نہ تھی ——— بھیا نے ان کو کتنی بار سمجھایا تھا ——— "بٹیا تم دوسرے انسانوں سے بالکل مختلف نہیں ہو" ——— اور پچھلے پندرہ برسوں میں انھوں نے بھیا پر ثابت کر دیا تھا کہ وہ دُنیا کے عام انسانوں سے مختلف نہیں تھیں اور بھیا کو اُن پر کتنا بے پناہ فخر تھا ——— میری بہادر بہن! ——— میری سپاہی بہن!

اُنھوں نے فیصلہ کر لیا ———

"جی ہاں!"

"گڈ ——— ! پہلی تاریخ کو ساڑھے آٹھ بجے صبح ہماری مائیکروبس آپ کو پک اپ کرنے آجائے گی ———"

دفعتاً چھوٹی بٹیا ایک بار پھر گھبرا گئیں ——— "مگر ہمیں شارٹ ہینڈ اور ٹائپ تو آتا ہی نہیں!"

"نیور مائنڈ ——— ! ہمارے یہاں آدھی درجن ٹائپسٹ لڑکیاں موجود ہیں۔ پہلی تاریخ ساڑھے آٹھ بجے ——— خدا حافظ، مس مرزا ——— !"

گھر میں داخل ہو کر چھوٹی بٹیا نے پھولے ہوئے سانس سے آواز دی ———

"ماما ——— ماما ——— ہمیں ساڑھے سات سو کی نوکری مل گئی ——— ایک دم ساڑھے سات سو ——— اور آنے جانے کے لیے موٹر ـ"

"اچھا!" ماما نے مختصر جواب دیا۔ انھوں نے کلکٹر صاحب کی موت کو برداشت کر لیا تھا۔ مگر سلمان کے جانے کے بعد سے انھیں چُپ لگ گئی تھی۔

دہلیز پر اکڑوں بیٹھ کر لوٹے سے مُنہ پر چھپکے مارتے ہوئے اور اس کے بعد کھانا کھاتے ہوئے چھوٹی بٹیا سوچا کیں ——— مینجنگ ڈائرکٹر آدمی تو خاصا معقول نظر آتا تھا۔ اس کے فوراً بعد بوس اور سکریٹری کے تعلقات کی مخصوص نوعیت، اس سے متعلق لطیفے اور کہانیاں ان کے ذہن میں گھوم گئیں۔ لوگ ہمیں کیا سمجھیں گے؟ سستی، گھٹیا سکریٹری لوگ کیا کہیں گے ——— بٹیا! یہ تمھارا خیال ہے۔ لوگوں کو تمھاری اتنی پروا نہیں ہے۔ اُنھیں اپنے ہی غم بہتیرے ہیں، انھیں بابا کے الفاظ یاد آئے۔ مگر یکم مارچ سے وہ اس مشتبہ ملازمت پر جانے والی تھیں۔ انھوں نے فوراً ساڑھے سات سو روپے کا تصور کیا۔ ساڑھے سات سو روپے ماہوار یکمشت ——— فنٹاسٹک ——— اتنی بڑی رقم انھوں نے مدتوں سے نہ دیکھی تھی

انھوں نے پہلی تنخواہ کا بجٹ بنایا۔ سب سے پہلے تو بھیا کے لیے ڈھیر ساری چیزیں خریدیں گے۔ سب سے پہلے ایک عمدہ سا شیونگ سیٹ۔ بھیا کا شیونگ سیٹ اب تک کتنا خستہ حال ہو چکا ہوگا۔ نئے پاجامے اور قمیص بنوائیں گے بہت سارے چاکلیٹ کے ڈبے اور سگریٹ کے ٹین لیں گے۔ بھیا نے پچھلی مرتبہ ایک کتاب کے لیے لکھا تھا جو وہ.... پڑھنا چاہتے تھے اور طامس اینڈ طامس میں جاکر دیکھا تو اس کی قیمت پچیس ۲۵ روپے نکلی۔ اب ان کے لیے پچیس پچیس روپے کی کتابیں خریدنا کیا مشکل ہے۔ ہمارے پاس ساریاں بالکل ختم ہو چکی ہیں۔ اس مہینے تو صرف سو روپے کی ساریاں خریدیں گے اور ایک جوڑا نئے سینڈلز، سیاہ رنگ کی، جو ہر ساری کے ساتھ چل جائے۔ اور مینجنگ ڈائرکٹر کہہ رہا تھا کہ اس کی پارٹیوں میں جانا ہوگا۔ اس کے لیے کیا ہوگا؟ اس کے لیے تو بہت عمدہ ساریاں خریدنی پڑیں گی ——— اور ایک میک اَپ کا سامان——— خیر میک اپ تو میں کبھی نہ کروں گی ——— بھیا کو پاؤڈر، لپ اسٹک والی لڑکیوں سے کتنی نفرت ہے!

اچھا- اور دوسری بات یہ ہے کہ اس آدمی نے کوئی ذرا سی بھی بدتمیزی کی تو ہم فوراً استعفا دے دیں گے۔ یہ طے کرکے ان کو یک گونہ سکون ہوا اور وہ کھانے کے برتن سمیٹ کر باورچی خانے کی سمت چلی گئیں۔

سید اختر علی کا کمرہ جمشید کی کوٹھی کی دوسری منزل پر تھا جہاں وہ مسہری پر دن بھر چپ چاپ لیٹے رہتے۔ ان کی بیوی سینے ٹوریم سے صحت یاب ہو کر آ چکی تھیں مگر ان سے شوہر کی ملاقات بہت کم ہوتی۔ سید اختر علی کو زندگی میں پہلی

بار آرام، آسایش اور سکون نصیب ہوا تھا۔ وہ پیٹ بھر کر اچھّے سے اچھا کھانا کھاتے اور سوتے رہتے۔ ایک ملازم محض ان کی خدمت پر مامور تھا۔ مکمل اطمینان اور سکون کی وجہ سے ان کی دماغی حالت رفتہ رفتہ نارمل ہونے لگی۔ اور جب ان کے دماغ نے دوبارہ باقاعدگی سے کام کرنا شروع کیا تو وہ اُس مسلسل بے کاری سے اکتا گئے ——— "ابّا ——— !" جمشید نے ان سے کہا۔ جس کا بیسیوں نارمل اور "اب نارمل" ہر طرح کے انسانوں سے سابقہ پڑتا تھا اور جو اچھا خاصا ماہر نفسیات ہو چکا تھا ——— "کمپنی لا کی کتابوں پر ایک نظر ڈال لیا کیجیے۔ آپ کی قانون دانی میری فرم کے کام آئے گی ——— "

چنانچہ سیّد اختر علی بے حد ذوق و شوق سے قانون میں کھو گئے۔ تقریباً اٹھارہ سال بعد انھوں نے اپنے ایل - ایل - بی کے علم کو دوبارہ بروے کار لانا شروع کیا۔ کبھی کبھی وہ جمشید کے دفتر بھی جانے لگے اور اس کے بعد آہستہ آہستہ بیٹے کے کاروباری معاملات میں گھُل مِل گئے۔

ثریا کراچی پہنچ کر ناظم آباد میں اپنی ایک سہیلی کے وہاں اُتری جو چند برس قبل ڈھاکہ اسکول میں اسٹاف پر اس کے ساتھ رہ چکی تھی۔ اس نے دبی دبی زبان سے سلمان کے متعلق پوچھ گچھ شروع کی۔ مگر جن لوگوں سے اس نے یہ استفسار کیا، انھوں نے اسے ذرا عجیب سی اور مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ چند روز بعد اسے پتا چلا کہ سلمان کو کراچی سے بہت دُور کسی نامعلوم جگہ پر ایک نامعلوم مُدت کے لیے منتقل کر دیا گیا ہے۔ اس نے چھوٹی بٹیا کی تلاش شروع کی۔ سلمان نے اپنے خطوں میں احتیاط کی وجہ سے کبھی چھوٹی بٹیا کا تذکرہ نہ کیا تھا۔ نہ کبھی ان کا پتا تحریر کیا تھا۔

اتنے بڑے شہر میں چھوٹی بٹیا جیسی گمنام اور مختصر ہستی کو ڈھونڈنا آسان نہیں تھا لیکن ایک روز ثریا کو معلوم ہوا کہ وہ بھی اب کراچی میں نہیں ہیں اور کسی غیر معروف دُور افتادہ مقام پر کسی اسکول میں کام کر رہی ہیں۔ ان کا پتا بھی کسی کو معلوم نہ تھا۔ ثریا خاصی مشہور آرٹسٹ تھی۔ اسے ایک گرلز کالج میں آرٹ کی لیکچررشپ مل گئی۔

اسٹاف کی چار پانچ لڑکیوں نے ناظم آباد اور پی۔ای۔سی۔ایچ۔ایس میں تین تین سو چار چار سو گز کے پلاٹ خرید لیے تھے اور ان پر اپنے مکان بنوا رہی تھیں۔ انھوں نے ثریا سے اصرار کیا۔ کراچی میں مکان کرلیے پرے کررہو گی تو دیوالہ نکل جائے گا، تم بھی قرضہ لے کر اپنا مکان تعمیر کروالو۔ ثریا نے "سوسائٹی" میں چار سو گز زمین قسطوں پر خریدی ــــــ مکان کی تعمیر کے لیے قرضہ لیا اور چھ مہینے میں بیس ہزار کے صرفے سے اس کی خوبصورت کاٹج تیار ہو گئی۔ بوٹا بیگم نے اس کا باورچی خانہ اپنی پسند کا بنوایا۔ چونکہ دونوں ماں بیٹیاں سمندری راستے سے مشرقی پاکستان سے آئی تھیں۔ بوٹا بیگم ڈھاکے سے باورچی خانے کا رتی رتی سامان، پتیلیاں، کرچھے، ڈوئیاں، توا، چمٹا، سل بٹّہ، ہاون دستہ، ایک بڑی سی بوری میں بھر کے ساتھ لیتی آئی تھیں۔ لیکن فرنیچر خریدنے کے لیے ثریا کے پاس پیسا نہیں بچا تھا۔ وہ اپنی ساری تصویریں ڈھاکے سے لے آئی تھی۔ مگر ابھی وہ ان آرٹسٹوں میں نہیں تھی جن کی تصاویر دھڑا دھڑ فروخت ہوتی ہیں۔ یوں بھی کراچی میں پینٹنگز کے خریدار بہت زیادہ نہیں تھے۔ اس نے ناظم آباد والی سہیلی سے اُدھار لے کر دو سکنڈ ہینڈ کرسیاں، دو میزیں اور دو نواڑی پلنگ خریدے۔ غسل خانے کی چوکی، ایک اسٹول، بوٹا بیگم کے لیے نماز کا چھوٹا سا تخت، اور ایک پیڑھی ناظم آباد والی سہیلی نے اسے مستعار دے دی۔

بوٹا بیگم مدتوں پہلے جب محمد گنج میں رہتی تھیں تو ڈولی میں بیٹھ کر نکلتی تھیں۔ قصرِ سلماں میں بھی انھوں نے اپنا پردہ قائم رکھا۔ کلکٹر صاحب سے ان کا کانا پردہ رہا۔ پرانے کڑے کے مکان میں البتہ وہ ثریا کے تین چار دوستوں کے سامنے آگئیں۔ وہ سب انھیں بڑے پیار سے "اماں ——— اماں" کہتے اور کرید کرید کر بے عد دلچسپی سے اُن سے گانو اور گڑھی کے قصے سنا کرتے تھے۔ ڈھاکے آکر بوٹا بیگم نے کبھی کبھی ساری پہننا شروع کر دی۔ گو برقع ترک نہ کیا مگر کراچی میدانِ حشر تھا۔ یہاں ان کا پردہ زیادہ عرصہ نہ چل سکتا تھا۔ کاٹج انھوں نے اپنی نگرانی میں بنوائی، اس لیے ٹھیکیدار اور راج مزدوروں کے سامنے آنا پڑا۔ اس کے بعد گھر جمانے کی ساری بھاگ دوڑ انھوں نے خود کی۔ انھوں نے برقع اتارا اور بسوں اور سائکل رکشاؤں میں بیٹھ کر مختلف کاموں کے لیے سارے شہر کے چکر لگانے شروع کیے۔ پڑوس کی کوٹھیوں کی "یو۔پی والی" بیبیوں سے ان کی ملاقات ہو گئی۔ اب وہ بیگم حُسین کہلاتیں اور ساری پہنے بڑی متانت کے ساتھ آنچل سے سر ڈھکے، براؤن پلاسٹک کا بیگ اور گلابی پلاسٹک کا جالی دار تھیلا ہاتھ میں سنبھالے، سائکل رکشا پر بیٹھی بوری بازار جاتی نظر آتیں۔

ثریا دن بھر اپنی مصروفیتوں میں لگی رہتی اور سلماں کو بھلاتے رکھنے کی کوشش کرتی۔ رات کے سناٹے میں سلماں کی فکر اور یاد اُسے کھا جاتی۔ مگر کتابوں، رسالوں، سیاست، دُنیا کی ہر چیز کے ساتھ ساتھ اپنی مصوری سے سلماں کی یاد سب سے زیادہ وابستہ تھی۔

ان دنوں اُسے پیسے کی بہت سخت ضرورت تھی۔ تنخواہ کا زیادہ حصہ زمین اور مکان کے قرضے کی قسطوں میں کٹ جاتا تھا۔ بوٹا بیگم کا دمے کا پرانا مرض عود کر آیا تھا۔ اس کا علاج ہو رہا تھا۔ اس کے پاس نئے کپڑے بھی نہیں تھے اور وہ ڈھاکے

میں خریدی ہوئی ساریوں ہی سے کام چلا رہی تھی۔ وہ تصویر بناتے وقت بھی ننانوے کے پھیر میں پڑی رہتی۔

ایک روز وہ ڈھنڈار کمرے میں ایزل کے سامنے کھڑی اپنی تازہ تصویر مکمل کر رہی تھی کہ باہر ایک چمکیلی شیورلے آن کر رکی اور تنگ موریوں کے سلیکس میں ملبوس ایک بے حد اسمارٹ لڑکی اندر آئی۔ اس کے ساتھ دو امریکن خواتین تھیں۔

"میں عالیہ سیّد ہوں ——— !" لڑکی نے کہا ——— "آپ کا پتا مجھے آپ کے کالج سے معلوم ہوا۔ یہ میری دوستیں کچھ پاکستانی پینٹنگز خریدنا چاہتی ہیں۔"

نو واردوں نے چاروں طرف دیکھا اور بیٹھنے کو کوئی چیز نہ ملی تو فرش پر گھٹنے ٹیک کر تصاویر دیکھنے لگیں۔ دونوں سکنڈ ہینڈ کرسیاں پچھلے برآمدے میں رکھی تھیں۔ ان پر بوٹا بیگم نے کپڑے دھو کر پھیلا دیے تھے۔ اسٹول باورچی خانے میں تھا۔ ثریا کو اس وقت شدّت کی کوفت ہوئی ——— تصویروں کے خریداروں کو بٹھانے کے لیے کمرے میں ایک صوفہ سیٹ اشد ضروری تھا۔

امریکن عورتوں نے تین تین سو روپے میں سہلٹ کے دو مناظر فوراً خرید لیے۔ ثریاؔ نے عالیہ سیّد کا شکریہ ادا کیا۔ عالیہ سیّد نے اسے اپنا ٹیلی فون نمبر دیا اور اسے بتایا کہ اسے اتنی بڑی آرٹسٹ سے ملنے کا بہت شوق تھا۔ اس نے ثریا کو اپنے گھر مدعو بھی کیا۔

اسی روز شہر جا کر ثریاؔ نے ایک صوفہ سیٹ، ایک چھوٹا سا بک شیلف اور ایک ٹیبل لیمپ خریدا۔ اور یہ سامان بڑے کمرے میں سجا کر سوچنے لگی کہ اگر ایک خوش رنگ سا قالین اور پردے بھی ہوں تو کمرہ جگمگا اُٹھے۔

لیکن یہ فرنیچر خریدنے کے لیے اس نے پچاس روپے گھر کے خرچ میں سے بھی ڈال دیے تھے اور ہر مہینے قرضہ بڑھتا جا رہا تھا۔

چند روز بعد اسے معلوم ہوا کہ ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں میں آرٹسٹوں کو بہت اچھی تنخواہیں ملتی ہیں۔ اُسے عالیہ سید کا خیال آیا جو بہت بارسوخ معلوم ہوتی تھی۔ اس نے کالج سے اُسے فون کیا۔

دوسرے سرے پر فون کا ریسیور عالیہ کے بھائی جمشید علی سید نے اٹھایا اور جب اُسے معلوم ہوا کہ مشہور فن کار ثریا حسین بات کر رہی ہیں تو اس نے کہا ——— "کمال ہو گیا ——— ! مجھ سے عالیہ نے کل ہی آپ کا ذکر کیا تھا۔ میرے۔۔ چند امریکن دوست بھی تصویریں خریدنا چاہتے ہیں۔ کسی روز آپ میرے ساتھ لنچ کھانا پسند کریں گی ——— ؟"

چنانچہ اتوار کے روز ثریا حسین موٹر رکشا میں بیٹھ کر کراچی جم خانہ گئی ——— جمشید ٹینس کورٹ کے رُخ والے بڑے کمرے میں اس کا منتظر تھا۔ تھوڑی دیر میں ٹینس کھیل کر عالیہ بھی آ گئی۔

باتوں باتوں میں عالیہ نے بڑے بے تکلف اور دوستانہ لہجے میں اس سے پوچھا ———

"ثریا ——— تم تو ریڈ ہو نا ——— ؟"

"ریڈ ——— ؟" ثریا چونک پڑی اور ذرا گھبرا کر اس نے کہا ——— "نہیں تو ——— کیوں ——— ؟"

"ارے کچھ نہیں ——— میں نے سنا تھا ———" عالیہ نے بے پروائی سے کہا۔

جمشید زور سے ہنسا ——— "کالج کے زمانے میں رہی ہوں گی ———"

لیکن ثریا کی گھبراہٹ دیکھ کر اس نے سنجیدگی سے کہا ——— "مس حسین آپ کے لیے کسی بھی ایڈورٹائزنگ فرم میں جگہ نکل سکتی ہے ——— اس کی فکر نہ

کیجیے —— مگر اپنے خیالات —— اگر وہ اس قسم کے ہیں —— تو ذرا ان کو —— میرا مطلب ہے —— ان کا اظہار نہ کیجیے گا —— علاوہ ازیں، زیادہ تر امریکن ٹورسٹ ہی ہمارے مصوّروں کی تصاویر خریدتے ہیں اور بہت اچھے دام دیتے ہیں ۔ اور میرا مطلب ہے ۔ آپ کی تصویریں امریکنوں کے ہاتھ خوب بک سکتی ہیں اگر —— ان کو یہ خیال نہ ہو جائے کہ آپ یعنی کہ ——"

وہ کھوکھلی سی ہنسی ہنسی ۔ عالیہ کو کہیں اور جانا تھا ۔ وہ ان دونوں کو لنچ کھانا چھوڑ کر باہر چلی گئی ۔

اگلے مہینوں میں ثریا کی کئی تصویریں عالیہ اور جمشید کے ذریعے بک گئیں اس نے نشست کے کمرے کے لیے کھدر کے خوبصورت پردے خریدے جن پر موہن جو دارو کے نقش و نگار چھپے تھے ۔ رنگین جوٹ کی بڑی آرٹسٹک سی چٹائی خریدی اور ٹیلی فون لگوانے کی درخواست دے دی ۔ اس کے آیندہ مہینے میں اس کی ایک بڑی تصویر خود جمشید نے اپنے دفتر کے لیے سات سو روپے میں خریدی اور ایک اور تصویر کے لیے ایک امریکن سیاح نے پورے ایک ہزار روپے دیے ۔ ثریا نے اس مرتبہ ایک چھوٹا سا فریجڈیر بھی خرید لیا ۔ کھانے کے کمرے کا فرنیچر اور اپنی سنگھار میز اس نے کچھ عرصے بعد سنٹرل جیل سے بہت واجبی قیمت پر بنوالی ۔ ٹیلی فون بھی لگ گیا اور اب اس کا کانچ منہہ سے بولنے لگا ۔ بڑے سے بڑا آدمی اس سے ملنے آجاتے اسے کوفت نہیں ہوتی تھی ۔

لیکن اس کا خرچ بڑھتا جا رہا تھا ۔ ٹیلی فون کا بل ۔ بوٹا بیگم کے ڈاکٹر کا بل ۔ دکانوں کے بل ۔ کالج جانے کے لیے اسے روزانہ ایک نئی ساری چاہیے تھی ۔ وہ ایک ہی ساری کلاس میں دو دن نہیں پہن سکتی تھی ۔ اس کی طالبات ایک سے ایک فیشن ایبل تھیں ۔ اس کا حلقۂ احباب وسیع ہوتا جا رہا تھا ۔

روز شام کو کہیں نہ کہیں باہر جانا ہوتا تھا اور یہاں کے فیشن ایبل ماحول کے مطابق معقول ساریاں درکار تھیں ۔ ڈھاکے میں تو چھ سات سوتی ساریوں میں سارا سال گزر جاتا تھا ——— اور یوں بھی وہ ایک "شخصیت" میں تبدیل ہو چکی تھی اور معمولی کپڑے پہن کر اِدھر اُدھر نہ گھوم سکتی تھی ۔ اس کا معیارِ زندگی روز بروز اُونچا اور منہگا ہوتا چلا گیا ۔ لیکن خوش قسمتی سے اسے ایک ایڈورٹائزنگ فرم میں نو سو روپے ماہوار کی ملازمت مل گئی ۔ یہ ایجنسی جمشید کے کاروبار کی ساری پبلسٹی سنبھالتی تھی ۔ اس معقول مشاہرے کی وجہ سے ثریا کی بیش تر مالی اُلجھنیں حل ہو گئیں ۔

اس ایجنسی میں ابھی اس نے سال بھر ہی کام کیا ہو گا کہ ایک بے حد نفیس اسکالر شپ اسے پیش کیا گیا ۔ اس نے بوٹا بیگم کو اپنی سہیلی کے وہاں ناظم آباد منتقل کیا ۔ کاٹیج چار سو روپے ماہوار کرایے پر اٹھایا اور دو سال کے لیے پیرس چلی گئی ۔ مارچ سالاء میں وہ کراچی واپس آئی اور لوٹتے ہیں جرمنی سے اپنے لیے ایک فوکس ویگن بھی خریدتی لائی ——— !

چھوٹی بٹیا کے تقرر کو ابھی ایک مہینا ہی گزرا تھا کہ بوس نے نیچ لکڑی میں ایک بہت بڑی پارٹی دی اور اپنی سوشل سکریٹری سے ڈکٹا فون پر کہا کہ وہ سات بجے شام کو تیار رہے ۔ وہ خود آکر اسے پک اپ کرلیں گے ۔

چھوٹی بٹیا نے پہلی تنخواہ ملنے پر الفنسٹن اسٹریٹ سے ایک "انڈین ساری" اصل سے دوگنی قیمت پر خریدلی تھی اور دفتر میں مِس ڈی سوزا نے اصرار کیا تھا کہ کم از کم شام کے وقت میک اَپ کرنا بہت لازمی ہے ۔ ورنہ چہرہ پھیکا پھیکا اور بے جان لگتا ہے ۔ چنانچہ چھوٹی بٹیا نے ایک ہلکے رنگ کا لپ اسٹک بھی خرید لیا تھا ۔

اندھیرا پڑ گیا تھا اور وہ کھڑکی کے پاس بیٹھی میک اَپ کر رہی تھیں ۔ وہ

کھڑکی ہمیشہ بند رکھتی تھیں۔ کیوں کہ اس میں سے گلی کا سامنا ہوتا تھا۔۔ اس وقت انھوں نے اس کا ایک پٹ کھول کر آئینہ کھڑکی کی گرد آلود جالی میں اٹکا دیا تھا اور پلنگ کے کنارے بیٹھی ناخنوں پر کیوٹکس لگا رہی تھیں۔

چہرے پر فاونڈلیشن کریم ملتے ملتے یک لخت ان کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔ انھیں دفعتاً یہ احساس ہوا کہ آج وہ پہلی مرتبہ اپنی اس ڈیوٹی پر جا رہی تھیں جس کے لیے ان کو ملازم رکھا گیا تھا۔ انھیں بوس کے غیر ملکی دوستوں کو "انٹرٹین" کرنا تھا۔ وہ اس پارٹی کی "ہوسٹس" تھیں اور انھیں لامحالہ بوس کی "مسٹریس" بھی سمجھا جاتے گا۔ "اللہ میاں ——— اللہ میاں —— ہم مرکیوں نہیں جاتے ——— ہم ———" انھوں نے نقاہت سے دیوار کا سہارا لیا ——— "یا اللہ ہمیں موت کیوں نہیں آجاتی ———"

باہر ایک سُرخ رنگ کی طویل کرائسلر آکر رُکی اور بڑا وبیز سا ہارن بجا۔ انھوں نے جلدی سے کھڑکی بند کی۔ لپ اسٹک لگایا اور بیگ اٹھا کر دوسرے کمرے میں گئیں۔

"ماما ——— ماما! ہم پارٹی میں جا رہے ہیں۔ رات کو دس گیارہ بجے تک لوٹیں گے۔"

"اچھّا ———!"

برآمدے کے بالکل برابر کار کھڑی کر کے جمشید اسٹیرنگ وہیل پر بازو رکھے الٰہی بخش کوٹھی کے اُداس ماحول کو دیکھ رہا تھا جسے جھٹ پٹے کی نیم تاریکی نے زیادہ المناک بنا دیا تھا۔ دُنیا میں زیادہ تر انسان کس قدر بے رنگ زندگیاں گزارتے ہیں۔ اس نے سوچا ——— اتنے میں مس مرزا باہر نکلیں۔ اس نے دروازہ کھولا اور اس کے برابر آبیٹھیں۔

کرائسلر گلیوں کی دھول اور کیچڑ اور گڈھوں پر سے نہایت وقار کے ساتھ گزرتی باہر کی سڑک پر آگئی۔ جمشید نے مڑکر اپنی دلکش سکریٹری کو دیکھا اور مسکرا کر اخلاق سے دریافت کیا ——

"سو —— ہاؤ آر یو دِس ایوننگ مس مرزا —— ؟"

"فائن —— تھینک یو —— !"

کار اب چوراہے کے بھیڑ بھڑکّے کو چیرتی ہوئی نکل رہی تھی —— گھڑگھڑ کرتی بسیں دُھواں چھوڑتی ایک ایک کرکے برابر کے میدان میں جاکر کھڑی ہو رہی تھیں۔ لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ دفتروں سے لوٹ رہے تھے۔ حلوائیوں اور چائے والوں کی دکانیں تیز نیون لائٹس سے چمک رہی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے مکانوں کے برآمدوں پر جافریاں چڑھی تھیں اور ناموں کی چھوٹی چھوٹی تختیاں لگی تھیں۔ ان سب ناموں کے پیچھے کتنی کہانیاں چھپی تھیں۔ دیواروں پر بڑے بڑے حروف میں ہومیوپیتھک ڈاکٹروں "پانی بجلی اور بھاپ کے اصل جرمنی علاج" اور پرائیویٹ کالجوں کے اشتہار لکھے ہوئے تھے۔

جمشید نے ایک گہرا سانس لیا اور پھر پہلو میں بیٹھی ہوئی لڑکی پر نظر ڈالی وہ اپنے اسٹاف کے دُکھ سُکھ میں ذاتی دلچسپی لیتا تھا اور ان سے بڑی دردمندی سے پیش آتا تھا۔

"آپ کو دفتر کا کام کیسا لگ رہا ہے مس مرزا —— ؟"

"اِٹس آل رائٹ" —— جواب ملا۔

اب کرائسلر سنٹرل جیل کی دیوار کے نیچے سے گزر رہی تھی۔ دفعتاً جمشید نے دیکھا کہ اس کی سکریٹری کا رنگ پیلا پڑ گیا اور وہ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں میچ کر آنسو پینے کی کوشش کررہی ہے!

"مس مرزا ——— مس مرزا ——— کیا بات ہے؟" اس نے مضطرب ہوکر پوچھا۔

"کچھ نہیں ———" چھوٹی بٹیا نے گھبرا کر چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"کیا ہوا ——— بتلائیے تو ——— !"

"کچھ بھی تو نہیں ———"

وہ خاموش ہوگیا ——— بہت شریف لڑکی ہے۔ مگر بے حد نروس طبیعت کی مالک ہے۔ خیر ٹھیک ہو جائے گی۔

"اگر آپ پارٹی میں بھی اسی طرح چُپ رہیں تو میری بزنس ہو چکی ——— !" کچھ دیر بعد جمشید نے ذرا خوش دلی کی سعی کرتے ہوئے کہا۔

وہ دل پر جبر کرکے اخلاقاً ہنسی۔ جمشید نے سگریٹ جلایا۔

"آپ اسموک نہیں کرتیں ——— ؟"

"جی نہیں ——— !"

اس لڑکی کے بے بس سے وقار نے اُسے اتنا مرعوب کر دیا کہ مزید ذاتی سوال کرنے کی اسے ہمت نہ پڑی۔ اُس نے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔

پارٹی کے اختتام پر جمشید اپنی سکریٹری کے قریب آیا اور بڑی گرم جوشی اور طمانیت سے اس کا چھوٹا سا سفید ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"——— مس مرزا! ——— آپ تو فرینچ بولنا بھی جانتی ہیں۔ چھپی رستم نکلیں آپ تو ——— آپ نے اتنی خوبصورتی سے میزبانی کے فرائض انجام دیے ——— یہ لوگ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ اگر اس ملک میں اتنی چارمنگ، اور پرفیکٹ سکریٹریز ہوتی ہیں تو ہم اپنا سارا کاروبار یہاں منتقل کرنے کو تیار ہیں!"

"اب ہمیں گھر پہنچا دیجیے ——— !"

"یقیناً ——— لیکن مس مرزا ——— آپ عموماً اس قدر خاموش رہتی ہیں اور آج شام اتنی ڈسپیریسیڈ معلوم ہو رہی تھیں کہ مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ آپ نے پارٹی اینجوائے کی۔ آج میں نے آپ کو پہلی مرتبہ ہنستے ہوئے دیکھا۔ اور آپ نے شیری چکھنے میں اتنا تکلف کیوں کیا؟ پڑھی لکھی لڑکی ہو کر اتنی دقیانوسیت! ——— خوش رہیے ——— زندگی سے جی بھر کر محظوظ ہوجیے ہم لوگ اس دنیا میں بار بار پیدا نہ ہوں گے ——— ہنسیے ——— ہنسیے! ڈیم اٹ ——— میں نے بہت آپ جناب کر لیا ——— تم میری سکریٹری ہو میں تمھیں صرف سلمیٰ کہوں گا۔ اپنا یہ اسکول مسٹریس کا ذہنی لبادہ اتارو ——— اگر یہ اولڈ میڈ والی ذہنیت اختیار کی تو یاد رکھو، واقعی ساری عمر اولڈ میڈ ہی رہو گی ——— اور یہ بڑی سخت ٹریجڈی ہو گی۔ جوانی کی مسرتوں کا تم پر بہت زیادہ حق ہے ——— !"

جمشید کی آنکھوں میں ہلکی سی سرخی تھی۔

رات کو جمشید علی گھر واپس پہنچا تو شراب کے مدھم سرور کی لہروں پر تیرتا ہوا سوچ رہا تھا کہ گو اس لڑکی کے خاندان کا کچھ پتا نشان معلوم نہیں مگر ہے بڑی پیاری سی۔ اور انگریزی بالکل میموں والی بولتی ہے۔ ممکن ہے اس کی ماں انگریز ہی ہو ——— بہترین بیوی ثابت ہو گی ——— خاموش طبیعت، محنتی اور خوش اخلاق۔ مگر رہتی ہے کولونی میں STATUS کا بڑا پرابلم ہے، وہ برات لے کر کولونی کس طرح جائے گا ——— ؟

لیکن کپڑے تبدیل کر کے پلنگ پر لیٹتے وقت جب اس کا سرور تھوڑا سا

زائل ہوا تو اس نے سوچا ——— لاحول ولاقوۃ، یہ میں کیا بکواس سوچ رہا ہوں ——— کیسی شادی اور کس کی شادی ——— ؟ میں اس لونڈیا کو GROOM کروں گا۔ بہترین CONTACT WOMAN ثابت ہوگی ایک سے ایک بڑا گھاگ اس کی بھولی بھالی صورت پر ریشہ خطمی ہو کر سارے کاروباری راز اگل دے گا۔ لاکھوں کے معاملات منٹوں میں طے ہو جائیں گے۔

اُس نے پلنگ پر لیٹ کر ٹیبل لیمپ بجھا دیا اور سگریٹ جلایا۔

WHAT A LUCKY DOG I AM, WHAT A LUCKY DOG

اس نے دل میں کہا۔

برابر کے ایک کمرے میں سیّد اختر علی چند ملاقاتیوں سے کلیم کے متعلق تبادلۂ خیالات کر رہے تھے۔

"آپ نے کتنے کا کلیم داخل کیا ہے وکیل صاحب؟"

"صرف تین لاکھ کا ———" سیّد اختر علی کی آواز آئی۔

"آپ کی زرعی جایداد بھی تو ہوگی؟"

"جی ہاں! مگر میرے بھائی صاحب ابھی بھارت ہی میں ہیں" ——— سیّد اختر علی نے جواب دیا ——— "وہ ابھی تک وہیں پھنسے ہوتے ہیں۔ بہت لکھا کہ یہاں آجائیے مگر نہیں مانتے۔ مَیں نے تو اپنی کان پور کی کوٹھی کا کلیم ہی داخل کر دیا ہے فی الحال۔ منظور ہونے پر بھی اس کا چالیس فی صد ہی ملے گا۔ مگر صبر و شکر کر کے وہی قبول کر لیں گے ——— کیا کیا جاتے؟ یہاں تو ہر طرف لُوٹ مچی ہوئی ہے۔ آبادکاری کے محکمے میں ذرا بھی انصاف نہیں ——— یہ ملک تو بالکل اندھیر نگری بنا ہوا ہے ——— !"

"بالکل بجا فرمایا آپ نے وکیل صاحب!"

جمشید کو پیاس محسوس ہوئی۔ اُس نے روشنی جلائی۔ اُٹھ کر الماری میں سے وہسکی کی بوتل اور سوڈا نکالا اور ایک گلاس بھر کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

اس کے باپ کی آواز اس کے کانوں میں آتی رہی۔ اب وہ کہہ رہے تھے "اب یہی دیکھیے۔ جمشید میاں نے دو ہزار گز زمین سوسائٹی میں لے کر ڈال دی تھی۔ اس پر کوٹھی کی تعمیر شروع کروائی مگر سیمنٹ اور لوہا سب بلیک میں چلا گیا۔ اب تک ساڑھے تین لاکھ روپیا اس پر خرچ ہو چکا ہے۔ مگر تعمیر ختم نہیں ہوئی ——"

جمشید نے گلاس ختم کیا اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ دفعتاً ایک بھیانک انکشاف اس کے ذہن کے دھندلکے میں کوندا —— اپنے خدا پرست، فقیر منش، توکل پسند باپ کو، اس شخص کو جو ایک زمانے میں سید منظہر علی اور گوسائیں کاکا اور مولوی محمد حسن کے محدود و معصوم دائرے کا ایک فرد تھا۔ اس بھولے بوڑھے کو جھوٹا، بددیانت، ریاکار، اور جعل ساز اس نے خود بنا دیا تھا ——

Oh, WHAT A DOG I AM WHAT A DOG, WHAT A DOG

اُس نے زور سے تکیے پر مُکّا مارا اور کمبل میں مُنہ چھپا کر سو گیا۔

منصور احمد ثریا سے پیرس میں ملا تھا۔ وہ ایک ہونہار، محنتی اور بے انتہا ذہین جرنلسٹ تھا اور کئی سال امریکہ میں پبلک ریلیشنز کی تکنیک سیکھنے کے بعد حال ہی میں کراچی واپس آیا تھا اور ان دنوں ایک انگریزی روزنامے سے منسلک تھا اور شہر کے کامیاب اور باا ثر صحافیوں میں اس کا شمار کیا جا رہا تھا۔

اس وقت وہ پریس کلب میں بیٹھا ثریا کی ہونے والی نمائش کے متعلق ایک

رائٹ اپ لکھ رہا تھا۔ ثریا نے پریس کلب کو اپنی ایک بڑی پینٹنگ تحفے میں دی تھی اور منصور نے اسے فون کیا تھا کہ وہ خود پریس کلب آکر تصویر کو اپنی مرضی کے مطابق دیوار پر آویزاں کرے اور کھانا بھی وہیں کھائے۔ اتوار کی سہ پہر تھی۔ تین چار صحافی ہال کے ایک کونے میں بڑی سنجیدگی سے شطرنج میں غلطاں و پیچاں تھے۔ منصور نے مضمون شروع کرنے کے لیے کاغذ ٹائپ رائٹر پر چڑھایا کہ دفعتاً اسے یاد آیا کہ اُسے اپنے اخبار کے لیے بھارت کے متعلق ایک اہم مضمون تیار کر کے جلد از جلد کاپی فائنل کرنی ہے۔ وہ فوراً لمبی میز کی طرف گیا جس پر رسالے اور اخبار بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے سرعت سے بھارت کے تازہ انگریزی اور اردو اخبارول کی ورق گردانی شروع کی۔ شمالی بھارت کے سیاسی کوائف کا جائزہ لینے کے لیے اس نے اُتر پردیش کا ایک نسبتاً غیر معروف سا اُردو اخبار اُٹھا لیا۔ اس میں زیادہ تر ملک کے مختلف حصّوں میں ہونے والے عرسوں کی اطلاعات اور صوبے کے اسلامی اور عربی مدارس اور اوقاف کے انتظامات کے متعلق خبریں درج تھیں۔ اضلاع کی خبروں کے کالم میں ایک چھوٹی سی سُرخی تھی ——

شاہ منوّر علی کا وصال۔

موضع محمد گنج ضلع سلطان پور (اودھ) کی درگاہ شریف کے سجادہ نشین مخدوم زادہ شاہ منوّر علیؒ نور مرقدہٗ ہندستان جنّت نشان کی پاک سرزمین (پاک سرزمین؟ منصور احمد نے دل میں کہا، پاک سرزمین صرف پاکستان کی ہے ——) کے اُن عارفین کاملین اور بزرگانِ گرامی میں سے تھے جو ——

منصور احمد نے اُکتا کر آگے نظریں دوڑائیں۔ اسی کالم میں ایک اور غیر دلچسپ سی خبر تھی —— جناب نوروز حسین خاں آف پاربتی پور (ضلع

سلطان پور) نے جو ودھان سبھا میں سوتنتر پارٹی کے ممبر ہیں۔کل ——
منصور احمد نے اور آگے پڑھا —— جہاں وزرا پر نکتہ چینی، بلیک مارکیٹ، رشوت ستانی، ذات بندی، صوبہ پرستی اور فرقہ پرستی کے انسداد کے مطالبے اور دیگر متعلقہ معاملات کے کوائف چھپے تھے۔ ایک سُرخی پر اس کی نظر ٹھہر گئی جو اہم ہو سکتی تھی —— کامریڈ آنند موہن گھوش کا لوک سبھا میں سوال
—— نئی دہلی ۱۲ مئی —— لوک سبھا میں بحث کے دوران کمیونسٹ ممبر کامریڈ آنند موہن گھوش نے ——

"ہیلو —— ! کیا ہو رہا ہے —— ؟" ثریا نے پیچھے سے آن کر آواز دی۔

"ہیلو —— ثریا —— !" منصور نے اخبار بند کرتے ہوئے مڑ کر کہا۔

"معاف کرنا مجھے دیر ہو گئی —— !" ثریا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ عابد انصاری بھی تھا جو منصور کے مخالف اخبار میں چیف رپورٹر تھا۔ ان دونوں میں بہت دوستی تھی۔ مگر خبروں کی اسکوپ کے معاملے میں دونوں ایک دوسرے کو چوٹ دینے کی فکر میں رہتے تھے —— "میں عابد کو اپنے میورل دکھانے لے گئی تھی۔ اس میں ایک گھنٹہ لگ گیا" —— ثریا نے کہا۔

" —— جو تم ایر پورٹ پر بنا رہی ہو ؟" منصور احمد نے دریافت کیا۔

"نہیں ! جمشید ہاؤس کی لاؤنج میں" —— ثریا نے کہا۔

"جمشید ہاؤس ؟ —— اچھا —— وہ جمشید سید کی نئی کوٹھی ——"

"اس کے لیے بہت سے آرٹسٹ دانت لگائے بیٹھے تھے۔ کیونکہ جمشید علی پیسے بہت فراخ دلی سے دیتا ہے" —— عابد انصاری نے کہا۔

"میں فوٹو گرافر لے چلوں ؟ میورل کی تصویر بھی تمھارے متعلق مضمون کے ساتھ چھپ جائے" —— منصور احمد نے کہا۔

"ابھی رہنے دو ——— ابھی اس میں ہاتھی کی سونڈ باقی ہے" ثریا نے جواب دیا۔

"ہاؤس وارمنگ کے روز دیکھ لینا"

"اچھا ——— تو تم نے اس میں بھی مشرقی پاکستان کا موتیف رکھا ہے"۔ منصور احمد نے میز پر جھک کر کاغذ پر ایک جملے کا اضافہ کیا۔ پھر اس نے کہا۔

"ثریا! تم کو ماننا پڑے گا کہ تمھاری نمائش کے لیے اس سے بڑھ کر ایڈوانس پبلسٹی نہیں ہو سکتی تھی۔ ایک مضمون میں اپنے نام سے لکھ رہا ہوں ——— چار مضامین اگلے ہفتے تک مختلف ناموں سے پریس میں اور آجائیں گے۔ اور تمھاری نمائش کا کتابچہ بے حد خوبصورت چھپا ہے"

"تھینکس ——— ہاو سویٹ آف یو"

"تم دونوں جا کر کھانا منگواؤ۔ میں ایک ضروری نوٹ لکھ کر ابھی آتا ہوں"

"جلدی کرنا ———" ثریا نے کھانے کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

منصور احمد نے نہایت سرعت سے بھارت پر نوٹ مکمل کیا اور ٹائپ رائٹر پر دوسرا کاغذ چڑھایا اور تیزی سے ٹائپ کرنا شروع کیا۔

"کراچی کے فنی حلقوں کے لیے مس ثریا حسین محتاج تعارف نہیں ہیں۔ مس حسین نے جو اتر پردیش (بھارت) کے ایک تعلقہ دار کی صاحب زادی ہیں، مسوری کانونٹ میں تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد شانتی نکیتن اور ———"

۳

پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ ایس کی ایک اونچی نیچی پتھریلی سڑک پر بے شمار موٹریں کھڑی تھیں اور معزز مہمان اتر اتر کر اندر جا رہے تھے۔ کراچی کے مشہور بزنس مین

جمشید علی سید نے اپنی نئی کوٹھی کی "ہاؤس وارمنگ" کی دعوت میں شہر کے تقریباً سبھی اہم لوگوں کو مدعو کیا تھا۔ کوٹھی کی لاونج کے طویل دریچے میں سے وسیع اور سرسبز لان کا منظر ایک ٹیکنی کلر سینما اسکوپ پردے کے مانند دکھلائی دے رہا تھا۔ درختوں میں جگمگاتی برقی روشنیاں، قندیلیں، کیاریوں کے خوبصورت پھول۔ گھاس پر بکھرے ہوئے صوفے۔ اشیائے خورد و نوش سے لدی ہوئی میزوں کی قطاریں ـــ سفید کپڑوں میں ملبوس بیرے۔ تپائیوں پر رکھے ہوئے قیمتی سگریٹوں کے ڈبے۔ سفارت خانوں کے افراد۔ نظر فریب ہندستانی ساریوں میں ملبوس و لعزیب پاکستانی بیگمات ـــ سرسراتے ہوئے ایوننگ گاؤن اور کاک ٹیل ڈریس۔ عطر کی لپٹیں۔ برف کی بالٹیوں میں ڈوبی ہوئی شراب کی بوتلیں۔ اِدھر اُدھر کھڑے ہوئے جرنلسٹوں کے گروہ۔ کیمرہ سنبھالے چاروں طرف ٹہلتے ہوئے فوٹوگرافر۔ وقتاً فوقتاً کوندتے ہوئے فلیش بلب۔ بڑے بڑے کاروباری۔ جغادری مل اونر۔ اعلا سرکاری عہدے دار۔ کابینہ کے وزیر۔ سفیر اور فرسٹ سکریٹری اور پریس اتاشی اور کمرشل اتاشی ـــ چبوترے پر ڈانس بینڈ بج رہا تھا اور چند جوڑے رقص میں مشغول تھے۔ شراب پانی کی طرح بہہ رہی تھی۔ کوٹھی کی دوسری منزل پر راک اینڈ رول کا شور مچ رہا تھا اور فیری اپنے ہم عمر لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ اودھم مچا رہی تھیں۔ نیچے لان پر عالیہ سید نہایت بیش قیمت سفید رنگ کی بنارسی ساری میں ملبوس، گلے میں سچے موتیوں کی ایک لڑی پہنے میزبانی کے فرائض انجام دینے میں مصروف تھی۔ سید اختر علی سوٹ پہنے ایک کونے میں بیٹھے سگار پی رہے تھے۔ جمشید کے دونوں چھوٹے بھائی امریکہ پلٹ کم عمر لڑکیوں کے ایک گروہ میں کھڑے قہقہے لگا رہے تھے۔

لاؤنج کے اندر چند مہمان دیوار کی سطح پر بنے ہوئے فریسکو پر رائے زنی میں منہمک تھے۔ ثریا جس نے فرانسیسی شیفون کے بڑے بڑے سرخ پھولوں والی

ساری پہن رکھی تھی۔ تصویر کے سرے پر کھڑی مدّاحوں سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کے بال تازہ ترین بی ہائیو اسٹائل میں بنے تھے اور اس نے شینیل فائیو کی خوشبو لگا رکھی تھی اور اس کے بلاؤز کی تراش میں سے اس کی ساری پیٹھ عُریاں تھی۔

"مِس حُسین میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اب آپ جیمینی رائے کے اثر سے آزاد ہو چکی ہیں ــــــ آپ کے بنائے ہوئے نقوش اور رنگوں میں اب قومی کردار اور قومی طرز کی جھلک نظر آنے لگی ہے" ــــــ پاکستانی آرٹ کے ایک مشہور نقّاد نے اس سے کہا۔

"پاکستانی آرٹ کا مستقبل اب صرف ہمارے فن کاروں کی نئی نسل کے ہاتھ میں ہے۔ آپ کے پیرس پیریڈ کی تصاویر سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ آپ اپنے تہذیبی ورثے کی طرف آ رہی ہیں۔" دوسرے نقّاد نے کہا۔

"مثال کے طور پر موسیو ویژیے آپ ہاتھی کی سونڈ ملاحظہ کیجیے ــــــ" فریسکو کے سامنے ایک اور انٹلکچوئیل نے ایک موٹے فرانسیسی کو مخاطب کیا۔

"ہاتھی ــــــ" اس نے حلق صاف کر کے مقرّرانہ انداز میں بات جاری رکھی ــــــ مشرقی پاکستان کی کلچر کا ایک سمبل ہے وہاں کی ندیاں۔ بوٹ مین۔ ہاتھی اور مچھلیاں ــــــ"

"مچھلیاں، کشتیاں اور جُوٹ ــــــ" دوسرے انٹلکچوئیل نے اضافہ کیا۔ موٹے فرانسیسی نے جو شکل سے ذرا احمق سا معلوم ہوتا تھا۔ عینک ناک کی پھننگ پر اچھی طرح جمائی اور آنکھیں پھاڑ کر تصویر کو دیکھا ــــــ "ایسے ہاتھی تو انڈیا میں بھی ہوتے ہیں۔" اس نے حیرت سے کہا۔

"مِس حُسین!" ــــــ پہلے انٹلکچوئیل نے کہا ــــــ "موسیو ویژیے

کو اپنے شاہکار کی سمبلزم سمجھائیے۔ پاکستان کی تہذیبی روایت کی جڑوں کی تلاش اور مسلمانوں کے اجتماعی فنی لاشعور کے مظاہر کی معنی آفرینی اور ——"

بیرا شراب کی بوتلیں اور جام ایک ٹرے میں رکھے ادھر آیا۔ وہ سب جام ہاتھوں میں لے کر فریسکو کے سامنے کھڑے آرٹ پر تبادلۂ خیالات میں مصروف رہے ——

دیوار کی سبز روغنی سطح پر آم کے درخت بے ترتیبی سے آڑے ترچھے کھڑے تھے۔ عقب میں ایک گہری نیلی ندی بہہ رہی تھی۔ سامنے سے ایک ہاتھی گزر رہا تھا جس پر زرد رنگ کی جھول اور چوکور سا ہودہ تھا۔ اس میں ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ پوری تصویر بنگالی فوک آرٹ کی طرز میں بنائی گئی تھی۔

"ثریا —— !" دوسری طرف سے کسی نے آواز دی —— "تمہیں جمشید ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔"

وہ لاؤنج میں جمع مہمانوں سے معذرت چاہ کر باہر لان میں گئی۔

مقابل کی روش پر سے اس نے ایک سنہرے بالوں والی پستہ قد لڑکی کو آتے دیکھا۔ اس لڑکی نے جھلمل کرتے ستاروں والی آتشیں گلابی ساری پہن رکھی تھی اور بالوں کا بہت اونچا پھیلے ہوئے تاج یا پنکھے کا سا جوڑا بنائے تھی۔ جس کی اونچائی کی وجہ سے اس کے قد میں کافی اضافہ ہو گیا تھا۔ پپوٹوں کے ہلکے نیلے روغن اور ہونٹوں کے گہرے گلابی رنگ کے ساتھ اس کا میک اپ بے حد نفیس اور مکمل تھا۔ وہ لڑکی قریب آ گئی۔

وہ دونوں آمنے سامنے اپنی اپنی جگہ پر منجمد ہو گئیں۔ کئی سکنڈ گزر گئے وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں۔

"چھوٹی بٹیا —— !" ثریا نے چند لمحوں بعد کہا۔

سلمیٰ گم سم آنکھیں پھاڑے گھاس کو دیکھنے لگی۔

"چھوٹی بٹیا ـــــ!"

وہ خاموش رہی۔

"چھوٹی بٹیا ـــــ آپ ـــــ میں ـــــ"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"اوہلو ثریا ـــــ!" کسی مہمان نے قریب آکر گرم جوشی سے کہا ـــــ "لونگ ٹائم نوسی[1] ـــــ تمھیں فون کرتے کرتے عاجز آگیا۔ ویسے تم رہتی کہاں ہو ـــــ؟"

"ہاؤسنگ سوسائٹی ـــــ!" ثریا نے اس آواز میں کہا جو اس نے خود نہیں سُنی۔ پھر اس نے جواب دہرایا ـــــ "ہاؤسنگ سوسائٹی!"

"اچھا۔ میں کل شام کو عالیہ کے ساتھ آؤں گا ـــــ" وہ مجمع میں غائب ہو گیا۔

پیچھے سے جمشید نے آکر ثریا کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں کاک ٹیل کا گلاس تھا۔

"جانِ من ـــــ" اس نے ذرا لہک کر کہا ـــــ "ڈھونڈ تھکا ہوں بن کے بن، چھان پھرا گلی گلی ـــــ! کہاں تھیں ـــــ؟ ارے تم دونوں ایسی چپ کیوں کھڑی ہو؟ کیا تمھارا ایک دوسرے سے تعارف نہیں ـــــ؟ ثریا ـــــ دِس از سلمیٰ مرزا ـــــ مائی موسٹ ایفی شنٹ سوشل پرسنل اینڈ کانفی ڈنشل سکریٹری۔ چلو جانِ من ناچیں ـــــ" اس نے گلاس

---

[1] LONG TIME NO SEE

تپائی پر رکھا اور ثریا کو کھینچتا ہوا چبوترے پرے گیا۔ وہاں دونوں رقصاں جوڑوں کے بھنور میں غائب ہو گئے۔

ڈانس بینڈ کی دُھن تیز ہو گئی۔ سلمیٰ قریب کے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کا دل بہت گہرے اندھیرے سمندر میں ڈوب چکا تھا۔ صوفے پر ٹِک کر وہ ثریا کو جمشید کے ساتھ ناچتا دیکھتی رہی۔

ثریا باجی۔ اس نے دل میں کہا۔ بھیا! آپ کے نام کی مالا جپتے جپتے برسوں کی قید کاٹنے چلے گئے۔ جب وہ قید تنہائی کی لمبی مُدت کے بعد باہر نکلیں گے ان کے بال سفید ہوں گے اور وہ بوڑھے ہو چکے ہوں گے لیکن میرے بھیا کبھی بوڑھے نہ ہوں گے ——— کبھی نا اُمید نہ ہوں گے ——— کبھی ہار نہ مانیں گے۔ جب کہ آپ نے ثریا باجی ——— اتنی آسانی سے ہار مان لی۔ آپ جنھوں نے بھیا کو روشنی دی تھی۔ دل دیا تھا، ہمت دی تھی ——— اس نے آنکھیں میچ لیں تاکہ اس پارٹی کے منظر کی کسی چیز کو نہ دیکھ سکے۔

"ہلو ——— !" کسی نے پیچھے سے آکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ چونکی سامنے کپاس کے ملک التجار پینسٹھ سالہ مسٹر زاوؔیری کھڑے اپنے نقلی دانت نکوس رہے تھے۔ ان دنوں سلمیٰ کی ڈیوٹی تھی کہ ان کو انٹرٹین کرے ——— "ارے تم ادھر پاگل کا مانک کاتے کو بیٹھا ——— ؟ ڈانس نہیں بنائے گا ——— ؟" مسٹر زاوؔیری نے کہا۔

"جی نہیں۔ میں اس وقت ڈانس نہیں کروں گی" ——— سلمیٰ نے کپکپاتی آواز میں کہا ——— "اس وقت مجھے معاف کیجیے!"

"ارے ارے ——— ہم کو بولو ——— کیا بات ہے؟ ——— طبیعت کھراب ہے تمھارا ——— ؟" مسٹر زاوؔیری نے اس بے تکلف لہجے میں دریافت

کیا جس طرح لوگ اپنی بیویوں سے بات کرتے ہیں۔ سلمیٰ لرز اُٹھی۔

" اچھا چلو۔ ادھر ٹیبل پہ تمھارا اکھا فرینڈ لوگ ویٹ کرتا ہے ——"

وہ کانپتی ہوئی ٹانگوں سے اُٹھی —— "ثریا باجی! میں آپ سے کس بات کا شکوہ کر سکتی ہوں۔ میں خود ہار مان چکی ہوں۔"

وہ مسٹر زاویری کے ہمراہ میزوں کی طرف چلی گئی جہاں "بوفے" شروع ہو چکا تھا۔

رقص کے بعد جب ثریا چبوترے سے اُتر کر لان میں آئی تو اس نے سلمیٰ کو ایک درخت کے نیچے مسٹر زاویری کے ساتھ صوفے پر بیٹھا دیکھا۔ وہ جس انداز سے سلمیٰ کو گھور رہے تھے۔ ان کے چہرے پر ثریا کو درگا کنڈ کے نواب سکندر قلی خاں عرف نواب بھورے کی آنکھیں نظر آئیں۔

دفعتاً ایک بھیانک دھماکہ ہوا اور سامنے کے اس رنگین سینما اسکوپ نظارے کے پرخچے اُڑ گئے۔ سیاہ دھواں اور سرخ شرارے ساری فضا میں رقصاں تھے۔ بہت دُور ایک مہیب جوالا مکھی نے آگ اُگلنا شروع کی۔ گرم گرم، دہکتا ہوا لاوا بہتا ہوا سارے میں پھیل گیا۔ آتش فشاں کی گڑگڑاہٹ، زلزلے کے دھماکوں، آرکیسٹرا کے سروں، راک این رول کے شور، قہقہوں اور گلاسوں کی کھنکھناہٹ میں سے گزرتی ایک مدھم اُداس، خوبصورت آواز ثریا کے کانوں میں گونجی —— ماضی کے محل سرائیں جل کے راکھ ہوئیں۔ مگر ابھی اس ملبے کی بنیادوں پر دونوں ملکوں میں نئی بورژوازی کے نئے محل کھڑے ہوں گے۔ کل کے جاگیردار کی جگہ آج کا سرمایہ دار حاصل کرے گا —— کل کے جاگیردار کی جگہ آج کا سرمایہ دار ——

ثریا نے سہم کر آنکھیں بند کر لیں۔ یہ بلجین کٹ گلاس کے فانوسوں سے

جگمگاتا، اطالوی معمار کا بنایا ہوا، الٹرا ماڈرن جمشید ہاؤس نہیں تھا۔ یہ ضلع سلطانپور کے تعلقے درگا کنڈ کی نیم تاریک گڑھی تھی جس میں وہ خود بسنتی بیگم قید تھی۔ پھر درگا کنڈ کی گڑھی جمشید ہاؤس میں تبدیل ہو گئی۔ اس میں چھوٹی بٹیا قید تھیں۔ اس نے آنکھیں کھول کر پہچاننے کی کوشش کی۔ سامنے ہری گھاس پر جاپانی قندیلوں کے نیچے کون لوگ ٹہل رہے تھے۔ مسٹر زاویری۔ مسٹر گھاسلیٹ والا۔ مسٹر برٹن۔ اس نے آنکھیں بند کیں۔ نواب بھورے۔ میاں نوروز۔ مُنّن خاں۔ اس نے دوبارہ آنکھیں کھولیں۔ نواب بھورے۔ میاں نوروز۔ مُنّن خاں ایک بار پھر مسٹر زاویری۔ مسٹر گھاسلیٹ والا۔ اور مسٹر برٹن میں تبدیل ہو گئے۔ اس نے نظریں اوپر اُٹھائیں۔ سامنے جمشید کھڑا تھا۔

"جانِ من ——" اس نے سرور کے عالم میں کہا —— "اس جام جمشید کا جام تو پی لو۔ جس کا نام جمشید ہاؤس ہے —— یہ میرا جامِ جہاں نما ہے ——" اس نے ہاتھ سے چاروں طرف اشارہ کر کے کہا —— "یہ میرا ساغرِ جم ہے" —— اس نے گلاس اُٹھایا اور دوسرا گلاس ثریا کو دیا۔

"چیرز ——!"

"چیرز ——!"

پھر وہ ثریا کی کمر کے گرد ہاتھ ڈال کر اسے ڈرائنگ روم کی سمت لے گیا۔ جس کے ایک گوشے میں بار کے اسٹولوں پر تین چار غیر ملکی اور دیسی بزنس مین چڑھے بیٹھے تھے اور مسٹر پیٹرک سیاہ پتلون، سفید کوٹ پہنے، سیاہ بو ٹائی لگائے بارمین کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ جمشید ایک اسٹول پر بیٹھ گیا اور ثریا کو نزدیک کے اسٹول پر بٹھا لیا۔

گلاسوں میں تیز شراب انڈیلتے ہوئے جمشید نے ان لوگوں سے کاروباری

باتیں شروع کیں۔
" جمشید بھائی! تم ہمارے کو یہ بولو کہ لندن آفس سے کیبل آگیا یا نہیں"۔
سیٹھ عیسیٰ بھائی موسیٰ بھائی گھاسلیٹ والا نے جو ابھی ابھی بار پر آئے تھے
ذرا غرّا کر اسے مخاطب کیا۔
" ابھی نہیں آیا سیٹھ صاحب ــــــ"۔ جمشید نے بے پروائی سے جواب
دیا اور غیر ملکی تاجر کی طرف مڑا ــــــ " ہاں تو جارج میں تم کو کیا بتا رہا تھا؟
ہاں! میں نے لندن سے درخواستیں منگوائی تھیں۔ ایک مسٹر ایس۔ ڈی۔ جانسن
کا میں نے مانچسٹر آفس میں تقرر کر لیا ہے۔ مسٹر جانسن نے اپنی درخواست میں لکھا
ہے کہ وہ انڈین سول سروس میں عرصے تک کلکٹر اور کمشنر وغیرہ رہ چکے ہیں اور
برِصغیر سے بہت اچھی طرح واقف ہیں۔ یقیناً وہ مانچسٹر برانچ کا کام اچھی طرح
سنبھال لیں گے۔ میں اپنی غیر ملکی شاخوں میں ہمیشہ وہاں کے ایسے آدمی ملازم
رکھتا ہوں جو برِصغیر کے معاملات سے اجنبی نہ ہوں"۔
" اپن کے تپاس کا جواب دو جمشید بھائی!" ــــــ سیٹھ عیسیٰ بھائی
موسیٰ بھائی نے دوسرا گلاس چڑھا کر یک لخت بار کی چمکیلی سطح پر زور سے مُکا
مارا ــــــ " اپن کا ڈیل سٹیل کیا کہ نہیں!"
اب مسٹر زاویری بھی اندر آکر باتوں میں شریک ہو گئے۔ ثریا اس کاروباری
گفتگو سے اُکتا کر اسٹول پر سے اتری۔ دوسرے کونے میں ایک صوفے پر جا بیٹھی۔
دفعتاً بار پر بیٹھے ہوئے لوگوں میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ سیٹھ عیسیٰ بھائی موسیٰ
بھائی نے گلاس فرش پر پٹخ کر جمشید کا گلا پکڑ لیا ــــــ " سالا ــــــ تم نے
ہم کو پانچ لاکھ کا دھوکا دیا ــــــ ہم تمہارے اوپر کیس چلائیں گا ــــــ"
" شٹ اپ عیسیٰ بھائی یو اولڈ فول ــــــ"۔ جمشید نے گلا چھڑاتے ہوئے

جواب دیا۔

"شٹ اپ ——— یو ڈرٹی بلیک مارکیٹر ———" سیٹھ گھاسلیٹ والا گرجے۔

"اوہ ——— فور گاڈز سیک[۵] ———" جارج نے انگلی اٹھاکر اکتائی ہوئی آواز میں کہا۔

"سالا۔ تم خان برادرز سے ایگریمنٹ کرتا، اور ہم سے چارسو بیس کرتا ——— ہم سے پانچ لاکھ کا فراڈ کرتا ——— ہمارا اکھا بزنس میں لفڑا کرتا ——— ہمارے روکڑ میں گول مال کرتا ——— ہمارے ساتھ اتنا بڑا گھٹالا ڈالیں گا تو ہم تم پر سوٹ فائل کریں گا ——— ہمارا پانچ لاکھ کا نقصان کیا ——— سالا موالی ——— چور ——— بے ایمان ———" سیٹھ عیسیٰ بھائی نے نشے میں وحشت ہوکر جمشید کی ناک پر زور کا گھونسا رسید کیا اور ہاتھا پائی شروع کردی۔ بار میں بیٹھے ہوئے باقی احباب بھی اس مار پیٹ میں خوشی خوشی شامل ہوگئے۔ چیخ و پکار سن کر سلمیٰ اندر آئی۔ مسٹر پیٹرک نے جلدی سے ڈرائنگ روم کے سارے دروازے اندر سے بند کر دیے۔

ثریا نے ڈرائی مارٹینی کا جام تپائی پر رکھا اور آنکھیں نیم وا کرکے سلمیٰ پر نظر ڈالی ——— "ہیو اے ڈرنک سلمیٰ ڈیر ——— !" اس نے کہا۔

مسٹر پیٹرک نے سلمیٰ کے لیے شیری سے جام بھرا۔ وہ ثریا کے پاس صوفے پر بیٹھ گئی!

ہاتھا پائی کرتے ہوئے معزز مہمانوں نے تین چار سر خوشی کے نعرے بلند

OH, FOR GOD'S SAKE. ۵

لیے۔ لیکن سیٹھ عیسیٰ بھائی موسیٰ بھائی پر جنون سوار تھا۔ انھوں نے جمشید کو پیٹ بھر کے گھونسے مارے۔ جمشید قالین پر گر پڑا۔ کئی گلاس جھناکے سے ٹوٹے۔ جمشید کے چہرے اور ہتھیلیوں میں کرچیں چبھ گئیں اور خون نکل آیا۔ ثریّا اور سلمیٰ اطمینان سے کونے میں بیٹھی تماشا دیکھتی رہیں۔

باہر چبوترے پر تقریباً سارے مہمان کسی تازہ ترین تیز رفتار جنوبی امریکن رقص میں مصروف تھے اور ڈانس بینڈ کے ڈرم زور زور سے بج رہے تھے۔ چند لمحوں بعد دُھن تبدیل ہوئی اور ڈانس بینڈ نے افریقہ کے تاریک جنگلوں کی ایک تیز و تند، وحشی تال ڈرم پر بجانا شروع کی اور رقصاں جوڑے تالیاں بجا بجا کر فرش پر زور زور سے پیر پٹختے افریقی تال پر تیز تیز چکّر کاٹنے اور اُچھلنے کودنے لگے۔

اندر ڈرائنگ روم میں سیٹھ عیسیٰ بھائی بنکار رہے ——— "جھوٹا ——— بے ایمان ——— سالا ——— چور ———" مسٹر پیٹرک نے اُن کا نشہ اتارنے کے لیے پانی کا پورا جگ اُن کے سر پر انڈیل دیا۔ سیٹھ عیسیٰ بھائی موسیٰ بھائی فرش پر لمبے لمبے لیٹ کر ایک سانس میں دہرانے لگے ——— "اکھا پانچ لاکھ روپیا ——— پانچ لاکھ روپیا ——— پانچ لاکھ روپیا ———" مسٹر پیٹرک نے بقیہ حضرات کے لیے تازہ گلاس بھرے۔ دفعتاً سیٹھ عیسیٰ بھائی اٹھے اور چالاک بلّی کی سی تیزی کے ساتھ جھپٹ کر جمشید کو پھر دبوچ لیا ——— "چور ———" وہ اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے دھاڑے۔

"ثریا باجی ——— ثریا باجی! مسٹر گھاسیٹ والا نے چور پکڑا ہے ———" سلمیٰ نے سرخوشی کے عالم میں کہا اور نازک سا قہقہہ لگایا۔

جمشید سیٹھ عیسیٰ بھائی کی گرفت سے چھٹ کر پھر فرش پر گر گیا۔ کچھ دیر کے

یہ مکمل سناٹا چھاگیا۔ مسٹر زا آویری سیٹھ گھاسلیٹ والا کو کمرے سے باہر لے گئے۔
جمشید کہنیوں کے بل قالین پر سے اُٹھا۔ رومال سے چہرے اور ہاتھوں کا خون صاف کیا۔ پھر وہ چاروں ہاتھ پیروں کے بل کُتے کی طرح چلتا ہوا دونوں لڑکیوں کی طرف آیا۔ وہ بُری طرح سسکیاں بھر کے رو رہا تھا۔ وہ کھڑا ہوگیا اور سلمیٰ پر جُھک کر بولا ——— "ہم چور نہیں ہیں ——— ثریا ——— اس کو بتادو ہم چور نہیں ہیں۔ اس کو بتادو جمشید وا چور نہیں ہے!"

"یو آر میرلی ویری ڈرنک[1] مسٹر جمشید ———" سلمیٰ نے بیزاری سے چہرہ پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

یکایک وہ گانے لگا ——— "اگیا لاگی۔ سندر بن جل گیو رے"

ثریا نے ایک لمبا سانس لیا اور صوفے سے اٹھی اور سلمیٰ کی مدد سے لے جاکر اسے بڑے صوفے پر لٹادیا۔ باقی ماندہ مہمان بھی بار سے اُٹھ کر جاچکے تھے۔ مسٹر پیٹرک نے جھاڑن سے بار کی تر بتر سطح کو پونچھا اور باہر چلا گیا۔

جمشید نے صوفے پر پڑے پڑے ایک اور بہت پرانا تھیٹر کا گیت شروع کردیا ———

"میں آفت کا پر کالہ ہوں
ناچ نچادوں دم بھر میں ——— آگ لگادوں دم بھر میں
جس کی تاکا اس کو مارا۔ پو بارہ ہیں پو بارہ۔ پو بارہ ہیں پو بارہ ———
پو بارہ ہیں پو بارہ ——— ہُرّے ہپ ہپ۔ ہُرّے ہپ ہپ ہپ ہپ ہپ"

"شٹ اپ جمشید ———" ثریا نے اسے سختی سے ڈانٹا اور جاکر دریچے

---

[1] YOU ARE MERELY VERY DRUNK

کے نیچے رکھے ہوئے دیوان پر بیٹھ گئی۔

"یس سر ——— آل رائٹ سر ——!" جمشید نے اٹھ کر سیلوٹ کیا اور پھر دراز ہو گیا۔

مسٹر پیٹرک ڈاک کا پلندا لے کر اندر آیا ——— "سر کیبل آیا ہے۔ شام کی ڈاک میں چٹاگانگ کے دو ضروری لیٹر ہیں۔ ذرا دیکھ لیجیے!"

"گیٹ آؤٹ!"

"سر ——— خان برادرز کا اگریمنٹ ——— مسٹر جانسن کا کیبل ——— موسٹ ارجنٹ۔" مسٹر پیٹرک نے کہا۔

جمشید نے صوفے پر کھڑے ہو کر الاپنا شروع کر دیا ———

"یہ سب کو سیر عجائب دکھائی شیریں نے
ادھر تو ہاتھوں میں مہندی لگائی شیریں نے
پھر اس طرف دل کوہکن میں آگ لگی + اگیا لاگی سندر بن جل گیو رے"

سلمیٰ ایک میز پر چڑھی بیٹھی تھی۔ اور گھٹنوں پر سر رکھے فرش کو تک رہی تھی۔ جمشید صوفے پر سے کود کے الاپتا ہوا اس کی طرف گیا۔

"گلال زلفوں میں ان کی پڑا تھا ہولی میں
تو لالہ بولا کہ مشک ختن میں آگ لگی ہے"

اس نے سلمیٰ کے بالوں پر بڑے پیار سے ہاتھ پھرا۔ سلمیٰ نے غصے سے سر پیچھے ہٹا لیا۔ وہ اچانک کر میز پر آگیا اور اس کے سامنے دو زانو بیٹھ کر لگاتار دہاڑتا چلا گیا

"یہ وصف تجھ ہی میں دیکھا نگار غصے میں
ہوا ہے چہرہ ترا زرد یار۔ غصے میں
تو بلبلوں نے بھی جانا چمن میں آگ لگی ——— ارے ہاں اگیا لاگی"

"ڈونٹ اَپ پلیز ——— !" سلمیٰ نے تلملا کر کہا۔
جمشید نے ہوا میں ہاتھ لہرایا ——— دیگر ———

"میں بھولی باتوں کا اس کے کروں بیاں کیا کیا
شفق کو دیکھ کے کہتا ہے نوجواں میرا
عجب تماشا ہے چرخِ کہن میں آگ لگی
اجی ہاں آگ لگی ———"

"ثریا باجی ———" سلمیٰ نے میزپر سے اُترتے ہوئے آواز دی۔ ثریا جو دیوان پر نیم دراز اونگھ رہی تھی۔ اس نے ایک آنکھ کھولی۔

"پری بی۔ مجھے سمجھاؤ کہ جانِ من تمھاری ثریا باجی کس طرح ہیں۔: کیوں کر ہیں؟ کدھر ہیں۔ ایٹ سیٹ را۔ ایٹ سیٹ را۔ جمشید نے انگلی اٹھا کر سلمیٰ سے استفسار کیا "سر——— مسٹر پیٹرک نے دوبارہ زبان کھولی ———" ڈاک دیکھ لیجیے۔" "آل رائٹ آل ریٹ۔ یُو بلیک مین۔ کالٹین آدمی۔ ہمارے غلام کے چِلام کے تلام، نوکر کے چوکر، مرٹی کے ادسار، مسٹر ایس۔ ڈی جانسن صاحب بہادر۔ آئی۔ سی۔ ایس۔ ریٹائرڈ کا کیبل مارو ——— اور دیکھو۔ اگر تم نے ہمارا ٹائم زیاستی خراب کیا تو ہم تمھارا اتنا ٹھکائی کرے گا اتنا ٹھکائی کرے گا کہ تم افسوس کرے گا کہ تم پیدا ہوا تھا یہ کہہ کر اس نے کاروباری خطوط کے لفافے کھولے۔ مسٹر پیٹرک نے جلدی سے فاؤنٹن پن حاضر کیا۔ اس نے خطوں پر سرسری نظر دَوڑائی۔ آنکھ بند کر کے ایک فارم پر دستخط کیے اور کاغذات قالین پر پھینک دیے۔ مسٹر پیٹرک نے لپک کر انھیں اٹھایا اور ایک اور لفافہ پیش کیا۔ جس پر ہندستان کے ٹکٹ اور مُہر تھی۔ اس کے بعد مسٹر پیٹرک باہر چلا گیا۔ جمشید نے اسی طرح بہکتے ہوئے لفافہ کھولا اور خط پر نظر ڈالی۔ پھر اس کی تیوری پر بل پڑے اور اس نے آنکھیں پوری طرح کھول کر

پڑھنا شروع کیا:

باسمہ سبحانہ

متصل درگاہ شریف - موضع محمد گنج - تحصیل ہردوئی
ضلع سلطان پور - یو - پی - مورخہ ۱۴ جون ۱۹۶۱ء

برخوردار سعادت آثار، نورچشمی جمشید میاں سلمہٗ تعالیٰ

واضح ہو کہ بتاریخ ۱۲ جون بروز جمعہ بہ وقت دس بجے شب نورچشمی منظور النسا سلمہا، بعارضہ تپ محرقہ راہی ملک عدم ہوئی انا للہ وانا الیہ راجعون - مرحومہ کو خانقاہ شریف کے گورستان میں بھائی صاحب جنت آرام گاہ نور مرقدہٗ کے متبرک پہلو میں دفن کیا گیا۔

اوس مرحومہ نے مرتے وقت تمھیں معاف کیا - تمھارا خدا بھی تمھیں معاف فرماوے!

فقط

دعاگو

تمھارا چچا سیّد منظہر علی عفی عنہ

جمشید نے خط مٹھی میں زور سے بھینچا اور کاغذ کو توڑنا مروڑنا شروع کر دیا۔ دوبارہ پڑھا - اور ساکت و صامت ہو کر بیٹھ گیا۔

ثریا اور سلمیٰ بہت دور کونے میں کشنوں کے سہارے دیوان پر آڑی آڑی لیٹی باہوں پر سر رکھ کے سو چکی تھیں - باہر رقص ختم ہو چکا تھا اور مہمانوں کی بھیڑ چھٹنے لگی تھی۔

کمرے میں قبرستان کی خاموشی سرسرانے لگی - سنسان خانقاہ کے سارے کواڑ ہوا میں زور سے کھل گئے اور کھڑکھڑانے لگے ——— ارے خداوند تعالیٰ تو

عاشق کو اتنی لمبی جاید اد عطا کرتا ہے ——— صبر کی جایداد ——— صبر کی جایداد ——— بڑے ابا نے کاکلیں جھٹکا کر نارنجی کفنی سمیٹی اور اپنے خالی حجرے میں سے جھانکا ——— کھڑاؤں پہنے اور کھٹ کھٹ کرتے، سیڑھیاں اتر کر دوبارہ اپنی قبر میں جا گھُسے۔ ہوا روئی کے پیڑوں میں زور زور سے منڈلانے لگی۔ بہت سرد ہوا تھی اور لُو کے جلتے ہوئے تھپیڑوں میں تبدیل ہو گئی ——— شائیں شائیں شائیں شائیں زو وُووُوں ——— گھُوں گھُوں گھُوں گھُوں۔ جھڑا کے کی بارش شروع ہو گئی اور کچی قبر پانی میں بھیگنے لگی ——— بادل چھٹ گئے ——— چاند نکل آیا ——— سرخ آسمان پر سورج بھی ڈوب رہا تھا اور چاند بھی نکل آیا ——— "سہاگن کی قبر ہے جسے رات کو چنبیلی ایسی مہکت ہے ———" بکریاں ہنکاتی ہوئی چرواہن نے کہا۔ جمشید نے زور سے سسکی بھری۔

"تمھارا نشہ اب تک نہیں اترا؟" ثریا نے آنکھ کھول کر استہزا سے دریافت کیا اور پھر سو گئی۔

عابد انصاری تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا پھولی ہوئی سانس کے ساتھ لاؤنج میں آیا ——— "منصور ——— منصور ——— !" اس نے آواز دی۔

منصور ایک ہاتھ میں شراب کا گلاس لیے دوسرے میں ریسیور اٹھائے ٹیلی فون پر جھکا ہوا تھا۔ عابد نے اس کے قریب جا کر چاروں طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا ——— "منصور ——— قیامت گزر گئی ——— !"

منصور نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور ریسیور کو ہاتھ سے چھپا کر آہستگی سے جواب دیا۔

"مجھے معلوم ہو چکا ہے ——" اس نے رسیور ایک منٹ کے لیے تھامے رکھا۔ پھر فون پر رکھ دیا اور فرش پر بیٹھ گیا۔

لاؤنج خالی پڑی تھی۔ عابد ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔

"بے کار ہے ——" منصور نے ہاتھ بڑھا کر اسے روک دیا۔

"پولس کا اصرار ہے اس نے خودکشی کی، اور جیل کے حکام کا بیان ہے کہ پولس نے اسے تھرڈ ڈگری ——" عابد نے چونک کر چاروں طرف دیکھا اور فوراً چپ ہو گیا۔ ڈرائنگ روم کے دریچے کا پٹ آہستہ سے کھلا۔

لاؤنج میں باتوں کی آواز سے ڈرائنگ روم کے اندر دیوان پر پڑی ہوئی ثریا کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دریچے کا پٹ کھول کر باہر جھانکا —— "ہلو منصور —— عابد —— لوسو اینڈ سو —— تم لوگ کیا مسکوٹ کر رہے ہو —— ؟" اتنا کہہ کر اس نے پٹ بند کیے اور کشنوں پر گر کر دوبارہ سو گئی۔

لاؤنج میں وہ دونوں فریکو کے نیچے فرش پر پندرہ بیس منٹ تک بالکل چپ چاپ بیٹھے رہے۔

بہت دیر بعد منصور نے آہستہ کہا ——

"جاں بیچنے کو آئے تو بے دام بیچ دی
اے اہلِ مصر وضعِ تکلف تو دیکھیے"

عابد نے گھڑی پر نظر ڈالی اور اٹھ کھڑا ہوا —— "میں پریس جاتا ہوں"

"اس خبر کی اشاعت پر چوبیس گھنٹے کی پابندی ہے۔ بیٹھ جاؤ ——" منصور نے جواب دیا اور ہاتھ پکڑ کر اسے فرش پر بٹھا دیا اور قریب کی میز پر رکھی ہوئی تند شراب کی بوتل گلاس میں انڈیلی اور ایک دفعہ میں گلاس ختم کر دیا۔

عابد نے دوسرا گلاس بھر کے پینا شروع کیا۔ وہ پسینا پسینا ہو رہا تھا۔
"میں جانتا ہوں ——— !" اس نے دوبارہ کہا ——— "یہ میرا بہت بڑا اسکوپ ہے۔"
منصور نے سر جھکا کر شراب کے بلبلوں کو غور سے دیکھا اور آہستہ سے بولا
——— "ایں ——— میرا اسکوپ ——— جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے؟"
"یہ رات ——— یہ رات۔ اس درد کا شجر ہے ———" عابد نے بھوں بھوں کر کے روتے ہوئے گرہ لگائی اور فریسکو سے ٹیک لگا کر ایک ہچکی لی۔
دونوں پھر خاموش ہو گئے۔ عابد نے دوسرا گلاس چڑھایا ——— "ہم جو تاریک راہوں میں"۔ اس نے ایک اور ہچکی لی ——— "واہ فیض احمد فیض گریٹ مین دی لالٹین ——— زندہ باد ——— مارے گئے۔"
"زندہ باد چیرز۔ ——— تمھارا جام صحت ——— وعلیکم السلام ——" منصور نے کھڑے ہو کر کہا اور پھر بیٹھ گیا۔ ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ اندر سُریلے کلاک نے ٹکو ٹکو ٹکو کرنا شروع کیا۔ آدھ گھنٹہ اور گزر گیا۔
"کس نے ——— ؟" منصور نے سوال کرنا چاہا۔ مگر چاروں طرف دیکھ کر چُپ ہو گیا۔
"کس نے ——— ؟" عابد نے ہچکی لے کر پوچھا۔
"یہ کس نے ——— ہچ ———" منصور نے تھوڑی دیر لجد دہرایا۔
"یہ کس نے ——— لاش پھینک دی ——— جوانیوں کی ——— راہ میں؟" عابد نے کہا۔
"ابھی گزر رہے تھے ہم جو اررزم گاہ میں ——— ہچ ———" منصور نے کہا۔

چند یورو پین لڑکیاں اپنے سر سراتے ہوئے ایوننگ گاؤن ٹخنوں تک اٹھائے کھلکھلا کر ہنستی ہوئی سامنے سے گزر کر عالیہ کے ڈریسنگ روم کی سمت چلی گئیں۔

"یہ جور و ظلم کی کلائیاں مروڑ کر نکل پڑا ———" عابد نے کہا۔

"اندھیری رات تھی ——— ہیچ ——— مگر یہ چل پڑا ———" منصور نے کہا۔

"مگر یہ کس کی لاش تھی کہ بیڑیاں پڑی ہیں اب بھی پاؤں میں" ——— منصور نے کہا۔

"جیل کے حکام کا بیان ہے کہ اس کی ہتھیلیوں میں میخیں ٹھونکی گئیں ——— ہیچ" ——— عابد نے کہا۔

بیرا چھلکتے ہوئے سُرخ پیمانوں سے جھلملاتی روپہلی کشتی اٹھائے ان کے قریب آیا۔ دونوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ بیرے نے ان کے خالی گلاس کشتی میں رکھے اور نئے گلاس اُن کے ہاتھ میں تھماتے اور آگے چلا گیا۔

"ارے خداوند تعالیٰ تو عاشق کو صبر کی اتنی ای ای ای لمبی جایداد عطا کرت ہے ———" ڈرائنگ روم میں سے جمشید کی آواز آئی جو صوفے پر کھڑا ہوا ہیں ہاتھ لہرا رہا تھا۔

"یہ شام غم کا عکس تھا۔ یہ ایک انتباہ تھا ——— ہمیں اسے کچل نہ دیں ابھی ——— یہ روندنے کی چیز کیوں بنے امانتِ زمیں ———؟" منصور نے کہا اور جام خالی کر دیا۔ بتاؤ مسٹر عابد انصاری۔ کیوں بنے امانت زمیں ———؟ نہیں نہیں ——— بڑھے چلو، کچل بھی دو" ——— اس نے انگلی اٹھا کر کہا "کچل بھی دو ——— ہیچ ——— خزاں کا غنچہ ہے یہ لاش۔ یہ موت کا مجسمہ ڈرا رہا ہے دیر سے۔ لہو میں تر بتر ہے سر سے پاؤں تک ——— جمے ہوئے لہو میں ہے میرے ہی خون کی مہک"۔

"مہک" ——— اُس نے اتنے زور سے گرج کر کہا کہ عابد اُچھل کر کھڑا ہو گیا اور اس سے زیادہ گرج کر بولا ———

"یہ میرا اسکوپ ہے۔ میں کہے دیتا ہوں۔ یہ میرے کیریر کا سب سے بڑا اسکوپ ہے" ——— وہ لاؤنج سے نیچے کیاریوں میں پھلانگا۔ اور گھاس کے قطعے پر سے لڑکھڑاتا، دوڑتا، کرسیوں سے ٹکراتا، جہاں اب اِکّا دکّا مہمان اِدھر اُدھر نشے میں لڑھک رہے تھے، وہ تیزی سے پھاٹک تک پہنچا اور ثریا کی نیلی فوکس ویگن میں بیٹھ کر زنّاٹے سے اپنے دفتر کی سمت روانہ ہو گیا۔

منصور نے اُسے جاتے دیکھا اور سر ہلا کر کہا ——— "عابد میاں! میں تمھارے آنے سے پہلے ہی اپنے اخبار کو فون کر چکا ہوں ———" اس کے بعد اس نے کیاری میں چھلانگ لگائی اور سر جھکائے کیکڑے کی طرح ترچھا ترچھا چلتا تاریکی میں غائب ہو گیا۔

ثریّا نے جاگ کر آنکھیں ملیں اور سلمٰی کا بازو ہلایا ——— "اُٹھو سلمٰی! کیا رات بھر یہیں سونے کا ارادہ ہے؟"

"ہمیں سونے دیجیے ثریّا باجی! ——— ہم بہت تھک گئے ہیں ———" سلمٰی نے کروٹ بدل کر جواب دیا۔

جمشید صوفے پر سے کود کر لڑکھڑاتا ہوا لڑکیوں کی طرف آیا اور سلمٰی کے چہرے پر اپنا چہرہ رکھ کر پوچھا ——— "پری بی! ذرا یہ تو بتاؤ کہ جانِ من تمھاری ثریا باجی کس طرح ہیں ——— کیونکر ہیں ——— کدھر سے ہیں ——— ایں؟"

سلمیٰ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور جمشید کو پوری قوت سے پیچھے دھکیلتے ہوئے اس نے یک لخت شدید کراہت کے ساتھ کہا ـــــ "کیپ اوے یو ڈرٹی ڈوگ۔"[1]

"کیا کہا پری بی ـــــ ؟ میں ڈرٹی ڈوگ ہوں ؟ اور تم ـــــ ؟ اور تم ـــــ ؟ تم کیا ہو ـــــ ؟ یو ڈرٹی بلڈی بچ[2] ـــــ"

ثریا آگ بگولہ ہو کر اٹھی ۔ اس نے جمشید کے منہ پر اپنی پوری طاقت سے ایک طمانچہ رسید کیا۔

"جمشید علی سیّد، تم کتنے ہی نشے میں کیوں نہ ہو۔ مگر تم نے میرے سامنے چھوٹی بٹیا کی توہین کی تو میں تمہارے دانت توڑ دوں گی ۔ تمہارا خون کر دوں گی۔"

"آہاہاہا ـــــ اوہو ہوہو ۔ یک نہ شد دو شد ۔ چھوٹی بٹیا ـــــ ! یہ آپ کی چھوٹی بٹیا ہیں ۔ آپ ان کی اماں جان ہیں ـــــ والدہ محترمہ ـــــ چہ خوش چرا نہ بودی ـــــ چھچھڑ پہ بھینس کودی ۔ آج کی رات بڑے بڑے انکشافات ہو رہے ہیں ہم پر ـــــ چودہ دونی اٹھائیس طبق روشن شد۔"

پھر اس نے زور کی تان لگائی ـــــ آج کی رات ـــــ آج کی راآآ آت ۔ ساز درد نہ چھیڑ ـــــ" اور دیوان کے قریب قالین پر دھم سے بیٹھ گیا۔

سلمیٰ تھر تھر کانپ رہی تھی ۔ وہ ثریا سے لپٹ گئی ـــــ جیسے اس کی پناہ لینی ہو۔

ثریا دفعتاً ہوش میں آ گئی اور اس نے آہستہ سے جمشید کو مخاطب کیا۔

---

[1] KEEP AWAY, YOU DIRTY DOG

[2] YOU DIRTY BLOODY BITCH

جمشید! سلمیٰ تمہارے دفتر میں چار مہینے سے کام کر رہی ہے اور تم کو یہ معلوم نہیں کہ یہ کون ہے اور کس کی بیٹی ہے؟"

"مجھے موصوفہ کا شجرۂ نسب اور ہسٹری شیٹ معلوم کرنے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں ——— ان کے ذاتی فائل سے میرا وزیر باتدبیر مسٹر پیٹرک ڈیل کرتا ہے۔ مجھے صرف اس سے غرض ہے کہ یہ میری نوکر ہیں اور میرے کلائنٹس کی محبوبہ دلنواز ——— مس چھپتن چھری ——— ارے ——— !" اس نے پھر بہکنا شروع کیا ——— "ارے ایسے تو جگ میں جوان کوئی ہوئیہو نا ——— ارے دس گُنڈہ آگے ——— دس گنڈہ پیچھے ——— ایسے تو ———"

ثریاؔ نے طیش سے بے قابو ہو کر تین چار تھپڑ اسے اور لگائے۔ اس نے بازو چہرے کے سامنے کر کے ثریاؔ کا ہاتھ روکنے کی کوشش کی۔ سلمیٰ نے لرزتے ہوئے ثریاؔ کو اپنی طرف کھینچا ——— "ثریاؔ باجی ——— خدا کے لیے ——— ثریاؔ باجی!"

"ثریاؔ چیتے کی طرح چلتی ہوئی پھر جمشید کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی ——— ہاں جمشید علی سیّد آج کی رات، یقیناً انکشافات کی رات ہے!"

وہ ثریاؔ کے تیور دیکھ کر بے طرح خوف زدہ ہوگیا ——— "ڈارلنگ ہمیں مارو نہیں ——— ہمیں ڈانٹو نہیں ——— !" اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

پنجرے میں مقیّد شیرنی کی مانند چاروں طرف گھوم گھوم کر ثریاؔ نے کہنا شروع کیا ———

"جمشید علی سیّد ——— آج پہلی مرتبہ میری ملاقات کھانے کے میز پر تمہارے والد صاحب سے ہوئی ——— اور میں نے ان کو فوراً پہچان لیا ——— محمد گنج میں وہ ابا سے ملنے ہمارے گھر اکثر آیا کرتے تھے ———"

جمشید کا رنگ فق ہوتا دیکھ کر اس نے قہقہہ لگایا ——— "جمشید

ڈارلنگ! ——— میں کسی تعلقہ دار کی صاحب زادی نہیں ہوں۔ میں نے کسی مسوری کانونٹ میں تعلیم نہیں پائی ہے۔ میں نے کسی شانتی نکیتن کی شکل نہیں دیکھی ہے ——— میں سید زوار حسین مرحوم، سوز خواں و کاشت کار، موضع محمد گنج ضلع سلطان پور کی لڑکی ہوں۔ تم کان پور کے کسی مشہور ایڈووکیٹ کے بیٹے نہیں ہو۔ تم سید مظہر علی، کاشت کار موضع محمد گنج ضلع سلطان پور کے بھتیجے ہو، اور تم نے کسی کرنل براؤن اسکول دہرہ دون میں تعلیم حاصل نہیں کی ہے ——— تم اور میں ——— ہم دونوں اپنے پبلک ریلیشنز ایکسپرٹ کے تخلیق کردہ کردار ہیں ——— زندہ باد منصور احمد خاں ——— میرا حلق خشک ہو رہا ہے ———!" وہ فرش پر بیٹھ گئی۔

جمشید خاموشی سے اُٹھا اور بار پر سے دو گلاس بنا لایا۔

"آؤ ——— ہم دونوں اپنے عزیز "پریس ایجنٹ"، منصور احمد خاں کا جام صحت پییں ———" ثریا نے بڑی سنجیدگی سے اپنا گلاس جمشید کے گلاس سے ٹکرایا۔ جمشید نے وحشت زدہ ہو کر اسے دیکھا۔

لُوٹا بیگم آتو جی کی لڑکی ——— بسنتی بیگم

وہ کہتی رہی ——— "تمھارے چچا ابا سید مظہر علی نے سر پر کفن باندھ کر اپنی آقا نواب شمس آرا بیگم کے خلاف گواہی دی تھی اور مجھے میاں نوروز کے چنگل سے چھڑایا تھا۔ وہ میرے محافظ فرشتے تھے۔ وہ تمھارے بھی محافظ فرشتے تھے۔ مگر تم نے ان کو بھی نہ پہچانا ——— اور ان کی قدر نہ کی۔

"چھوٹی بٹیا کے بابا مرزا قمر الدین احمد نے مجھے آسرا دیا تھا۔ وہ بھی نیکی کر کے دریا میں ڈالنے کے قائل تھے۔ وہ میرے دوسرے محافظ فرشتے تھے۔ میرا

تیسرا محافظ فرشتہ"۔ وہ کہتے کہتے یک لخت رک گئی۔ چند لمحوں بعد اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور بات دوبارہ شروع کی ——— "میرا سب سے بڑا محافظ فرشتہ منصور احمد خاں ہے اور میری آخری جائے پناہ سوئٹزرلینڈ کے وہ بنک ہیں جن میں تمہاری دولت جمع ہے۔ آؤ ——— تمہارے سوئیس اکاؤنٹ کا جام پییں ———" اس نے گلاس دوبارہ ٹکرایا۔ اس نے دو سال پیرس میں رہ کے کبھی اتنی شراب نہ پی تھی جتنی وہ شام سے لے کر اب تک چڑھا چکی تھی۔

جمشید نے وحشت زدہ ہو کر سلمیٰ کو دیکھا جو بچوں کی طرح ہاتھوں کی مٹھی بنا کر اپنی آنکھیں مل رہی تھی اور ثریا کی ساری کا آنچل پکڑے اس کی آڑ میں دبکی اور سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔

کہر آلود آم کے باغ میں گرم، روشن خیمے کے اندر ایک چھوٹی سی بچّی نے چھتری سنبھال کر چھوٹی سی آواز میں "تھینک یو" کہا ———

کمرے میں لرزہ خیز سکوت طاری تھا ——— دونوں آشفتہ حال، بے سہارا لڑکیاں محمد گنج کے مندر کی سیتا کی مورتیوں کے مانند اس کے سامنے بیٹھی تھیں، وہ ان کے سامنے دو زانو جھک گیا اور اس نے آہستہ آہستہ کہا۔

"میری منظور یا نے مرنے سے پہلے مجھے معاف کر دیا۔ ثریا۔ سلمیٰ۔ تم دونوں بھی مجھے معاف کر دو ———"

"کے سیرا ــــ سیرا ــــ" دوسری منزل سے نغمے کی آواز بلند ہوئی اور رات کے گہرے سناٹے میں گونجی۔ اوپر ابھی پارٹی جاری تھی۔ اور فیری کے کسی بوائے فرینڈ نے ریڈیو گرام پر ڈورس ڈے کا ریکارڈ لگا دیا تھا۔

جمشید دفعتاً اپنی جگہ سے اٹھا اور زینے میں جا کر بے حد زور سے دہاڑا ــــ "اری او فرمتیا ــــ ہلا بند کر ــــ" وہ اس زور سے چیخا کہ سارے جمشید ہاؤس میں اس کی آواز گونج اٹھی۔ فیری نے گھبرا کر اوپر سے جھانکا اور ڈیڈی کی آواز اور اس لہجے سے بے حد متعجب ہوئی ــــ ڈیڈی نے آج تک اُسے اس گنوارو نام سے نہیں پکارا تھا۔

وہ پھر آکر فرش پر بیٹھ گیا۔

سُریلے کلاک نے رات کا دو بجایا۔

ثریا نے آنکھیں میچ لیں اور چپکے چپکے کہا ــــ "سلمان ــــ سلمان ــــ تم بھی مجھے معاف کر دو۔ تم جہاں کہیں بھی ہو، جس حالت میں بھی ہو۔ مجھے معاف کر دو ــــ مجھے معاف کر دو ــــ مجھے اس طرح نہ مرنے دو ــــ سلمان!"

کمرے میں ایک بار پھر قبرستان کی خاموشی سنسنانے لگی۔

جمشید ہاتھوں میں سر پکڑے اس طرح بیٹھا رہا جیسے وہ گورکن ہو اور بہت سی میتیں دفن کر کے اب سستا رہا ہو ــــ "اگیالاگی سندر بن جل گیو رے"، اس نے بیٹھی ہوئی آواز میں دہرایا اور گلاس کی باقی ماندہ شراب ختم کرنے کے بعد اپنی آنکھوں پر ہتھیلی پھیری۔ اور پھر بڑی دل دوز نیچی آواز میں آہستہ آہستہ الاپنا شروع کیا

لہ "جو کچھ ہونا ہے وہ ہوگا۔ ہم مستقبل کو نہیں دیکھ سکتے"

جلی ہے لاش موی آتش جدائی میں
مدد کو پہنچو صنم اب کفن میں آگ لگی

پھر اس نے کہا —— "بسنتی بیگم! تمھیں ہمارے گانو کا چپاتی بھانڈ یاد ہے جو یہ خمسہ گایا کرتا تھا ——"

ثریا اس کے نزدیک اکڑوں بیٹھ گئی اور آواز ملانے لگی —— "مدد کو پہنچو صنم اب کفن میں آگ لگی" —— کچھ دیر بعد ثریا نے یک بیک چیخ کر دہرایا۔

پھر وہ دونوں یک لخت چپ ہو گئے۔ سلمیٰ خاموشی سے سر جھکائے قالین کو تکتی رہی۔ ثریا نے ایک سانس میں متواتر دہرانا شروع کیا —— "پل نہ لاگیں موری انکھیاں پیو پل نہ لاگیں موری انکھیاں۔ پیو پل نہ لاگیں پل نہ لاگیں پل نہ ——" سلمیٰ نے گھبرا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا —— ثریا باجی —— ثریا باجی —— لیٹ جائیے —— پانی پی لیجیے!"

"میں بالکل ٹھیک ہوں چھوٹی بٹیا ——" اس نے جواب دیا اور ساری کے آنچل سے اپنا بھیگا ہوا چہرہ پونچھا۔ مگر آنسوؤں کا سیلاب اس کی آنکھوں سے امڈ آیا۔ پھر وہ دھیرے سے بولی —— "جمشید ——! مجھے بھی چپاتی بھانڈ کا ایک گانا یاد ہے۔ سناؤں ——؟" پھر اس نے دل کو ٹکڑے کر دینے والی آواز میں کہا —— "دن کو آ سکتے نہ تھے —— آنے کو کیا رات نہ تھی —— مہندی پاؤں میں نہ تھی آپ کے —— برسات نہ تھی —— کج ادائی کے سوا اور کوئی بات نہ تھی —— سچ تو کہیے کہ منظور ملاقات نہ تھی —— منظور ملاقات نہ تھی ——" پھر دفعتاً وہ بالکل خاموش ہو گئی اور دونوں ہاتھ گود میں رکھ کر بیٹھ گئی۔

وہ تینوں شکستہ جاموں، بکھری ہوئی بوتلوں، فرش پر بہتی ہوئی شراب

اور ٹوٹی ہوئی تپائیوں کے انبار پر اس طرح سر جھکائے بیٹھے رہے جیسے دُنیا کا خاتمہ ہو چکا ہے اور وہ جلے ہوئے کرۂ زمین کے آخری جان دار ہیں۔

دھڑ سے دروازہ کھلا اور سیٹھ عیسیٰ بھائی موسیٰ بھائی گھاسلیٹ والا اندر داخل ہوئے اور انھوں نے آگے بڑھ کر ایک اسٹامپ پیپر جمشید کی ناک کے سامنے لہرایا۔

"چٹا گانگ سے ٹرنک کال آگیا ہے زمشید بھائی۔ ادھر سائن کر دو۔ ہم کو گھر جانے کا ہے ——"

جمشید نے سر اٹھا کر اُنہیں دیکھا۔ آنکھیں ملیں اور اسے رفتہ رفتہ یاد آیا کہ وہ کون ہیں۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے آنکھیں پوری طرح کھول کر اپنے آپ پر نظر ڈالی اور اسے یاد آگیا کہ وہ خود کون ہے —— وہ مشہور بزنس میگنیٹ جمشید علی سید تھا۔ آج شام اس کی شان دار کوٹھی کی "ہاؤس وارمنگ" ہوئی تھی۔ یہ کوٹھی اس نے ساڑھے چار لاکھ میں بنوائی تھی۔ اس کے سارے کمرے ایر کنڈیشنڈ تھے۔ جو ایک دوسرے سے ہاؤس ٹیلی فون کے ذریعے منسلک تھے۔ شہر کے خوش پوش ترین جوانوں میں اس کا شمار کیا جاتا تھا اور اعلا طبقے کی بیش تر بن بیاہی لڑکیاں "بیگم جمشید" کہلانے کی متمنی تھیں۔ آج صبح اس نے دس لاکھ کا ایک معاملہ طے کیا تھا اور اس کے لیے مسٹر جانسن کے کیبل کا اسے جواب دینا تھا۔ اس کے بعد چٹا گانگ ٹرنک کال کرنا تھی —— اور اس کے بعد نئے معاہدے کے سلسلے میں ایک جرمن فرم سے گفت و شنید کے لیے کل تیسرے پہر کو یورپ روانہ ہونا تھا۔ اس نے ایک

لمبا سانس لیا۔ سگریٹ جلایا اور مسٹر گھاسلیٹ والا کے ساتھ اپنے آفس روم کی طرف چلا گیا۔

اب صبح کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ مسٹر پیٹرک ڈرائنگ روم میں آئے اور انھوں نے سلمٰی کو مخاطب کیا ——— "مس مرزا ——— بوس وانٹس یو۔"

سلمٰی قالین پر سے اٹھی۔ بیگ میں سے آئینہ نکال کر چہرہ صاف کیا اور مضبوط قدم رکھتی آفس روم میں گئی۔

"مس مرزا ——— !"

"یس سر ——— !"

"آپ کو اتوار کے دن بھی زحمت دینی پڑ رہی ہے۔ کل نو بجے صبح مسٹر ونکاکس اور ان کا گروپ بی۔ او۔ اے۔ سی سے آرہا ہے۔ ساڑھے نو بجے وہ دونوں جاپانی پہنچ جائیں گے۔ صبح کو ایرپورٹ چلی جائیے۔ ان لوگوں کے لیے میٹرو پول میں کمرے بُک کروا دیجیے اور دوپہر کو لنچ کِھلا دیجیے۔"

بوس نے نظریں نیچی کیے کیے اس سے کہا ——— "میں خود نہ آسکوں گا۔ کیونکہ کل فلائی کرنے سے پہلے مجھے بہت سے کام نپٹانے ہیں۔ کل دس بجے تک میٹرو پول پہنچ جائیے گا۔"

"یس سر ——— !" سلمٰی نے سیدھی کھڑی ہو کر نارمل اور باہمت آواز میں جواب دیا ——— "گڈ نائٹ!"

"گڈ نائٹ۔ مسٹر پیٹرک! ——— قادر بخش کو بولو، مس صاحب کو گھر پہنچا دے ———"

سلمیٰ کمرے سے باہر چلی گئی۔

مسٹر پیٹرک پھر ڈرائنگ روم میں گئے۔

"مس حسین! مسٹر سیّد نے بُلایا ہے۔"

ثریا قالین پر سے اُٹھی۔ بیگ میں سے آئینہ نکال کر چہرہ صاف کیا اور مضبوط قدم رکھتی آفس میں گئی۔

"ثریا ——— !" جمشید سیّد نے نظریں اٹھائے بغیر کہا ——— "شام کو تمھارا ٹکٹ بھی آگیا ہے۔ گھر جاکر پیکنگ کر لو۔ کل ڈھائی بجے ایرپورٹ آجانا۔ ابھی پیرس سے کیبل آیا ہے۔ تمھاری نمایش کا انھوں نے ۱۸ر جولائی سے انتظام کیا ہے ——— اتنا عرصہ ہم لوگ جنیوا میں رہ سکیں گے ——— اچھا کل ملاقات ہوگی ——— گڈ نائٹ ثریّا ——— !"

"گڈ نائٹ" ——— وہ بھی باہر چلی گئی۔ مگر چند منٹ بعد اس نے واپس آکر کہا ——— "میری کار غائب ہے ——— شاید منصور یا عابد لے گئے۔"

"مسٹر پیٹرک! ——— فتح گل کو بولو، عالیہ بی بی کی کار میں مس صاحب کو گھر پہنچا دے۔"

"یس سر ———"

دوسرے روز غیر ملکی مہمانوں سے نپٹ چکنے کے بعد سلمیٰ نے میٹرو پول کی دکانوں سے بہت سا سامان خریدا۔ قیمتی چاکلیٹ، ٹافی، بسکٹوں کے ڈبّے۔ خشک میوہ۔ شیرے میں ڈوبے ہوئے پھلوں کے ٹین۔ کفری کا سلز سگریٹ کا پورا کارٹن۔ ایکو اویلوا اور شیمپو کی شیشیاں۔ بڑھیا قسم کا شیونگ سوپ۔ ٹوتھ پیسٹ۔

بک اسٹال سے بہت سی پیپر بیک کتابیں اور تازہ رسالے اٹھائے اور گھر آ گئی۔ ماما کو ایک ایک چیز دکھائی اور رات کو کھانے کے بعد سارے سامان کا بڑا سا پارسل بنایا۔ پارسل کو سرھانے رکھا اور اس پر ہاتھ رکھ کر سو گئی۔

ایک صاحب کے ذریعے وہ ہر پندرھویں روز ایک پارسل سلمان کو بھجوایا کرتی تھی۔ وہ صاحب گھر سے لے جایا کرتے تھے۔ مگر پچھلی مرتبہ انھوں نے کہا تھا کہ اس دفعہ وہ خود نہ آ سکیں گے اور سلمٰی نے ان سے کہا تھا کہ پیر کی صبح کو وہ سامان خود ان کے پاس پہنچا دے گی۔

صبح کو وہ پارسل دفتر لیتی گئی اور اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی ان صاحب کا فون نمبر دیکھنے کے لیے ٹیلی فون ڈائرکٹری کھولی۔ اتنے میں مسٹر پیٹرک اندر آئے اور انھوں نے ایک لفافہ سلمٰی کو دیا ——— "بوس کا خط ———" انھوں نے کہا اور باہر چلے گئے۔ مس ڈی سوزا آئیں۔ چند کاغذات کرسی پر رکھے اور چلی گئیں۔ اس نے کھڑکی میں جا کر لفافہ کھولا۔

"چھوٹی بٹیا! ——— پرسوں رات انتہائی نشے اور نیم دیوانگی کے عالم میں میں نے جس طرح آپ سے گستاخی کی اس کے لیے صدقِ دل سے معافی کا خواستگار ہوں اور جانتا ہوں کہ معاف کیے جانے کا ہرگز مستحق نہیں۔ میری رذالت کے باوجود اس کے بعد آپ نے اسی تمکنت اور بردباری سے میرے "حکم" کی تعمیل کی۔ اور آج حسبِ معمول میرے لیے میزبانی کے فرائض انجام دیے۔ پرسوں رات جب میں نے دفتر کی میز پر بیٹھ کر آپ سے ایرپورٹ اور میٹروپول جانے کے لیے کہا تھا اس وقت میں آپ کے متعلق ایک اہم فیصلہ کر چکا تھا۔ وہ فیصلہ یہ تھا کہ میں اس ملازمت کے لیے جو آپ کے وقار اور شرافت کے

سراسر منافی ہے اور آپ کی شخصیت کی توہین ہے میں آپ کو مزید زحمت نہیں دے سکتا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں کیا لکھوں اور کن الفاظ میں آپ کو یقین دلاؤں کہ میرے دل میں آپ کی کتنی عزت ہے اور جو کچھ میں کہنے والا ہوں اپنے میں ہمت نہیں پاتا ہوں اور ان مناسب الفاظ کا متلاشی ہوں جن کے ذریعے آپ کے معصوم اور دکھی دل کو ٹھیس لگائے بغیر اپنا مافی الضمیر ادا کر سکوں۔

چھوٹی بٹیا، پرسوں رات میں نے بہت سے پوشیدہ ڈھانچے اپنی الماری میں سے نکالے، ان کو جھاڑا پونچھا اور انھیں الماری میں دوبارہ مقفّل کر دیا۔ میں نے اپنی لاش کا خود پوسٹ مارٹم کیا اور اسے زندگی کے مُردہ خانے میں برف کی سلوں تلے دبا دیا اور آج میں وہی جمشید سیّد ہوں جس سے آپ پچھلے چار مہینے سے واقف ہیں۔ آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں ایک انتہائی ذلیل بے رحم، خود غرض، کمینہ اور مفاد پرست انسان ہوں۔ میں ایک ایسا شخص ہوں جس کے لیے کسی قسم کی پُرانی اقدار، شرافت، اصول پرستی وغیرہ وغیرہ کے تصوّرات لایعنی ہو چکے ہیں۔ لیکن پرسوں رات جب مجھے معلوم ہوا کہ آپ مرحوم مرزا صاحب کی صاحبزادی ہیں۔ تو میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ اس اطلاع سے دوسرا ذہنی جھٹکا جو مجھے لگا اس کا تعلق سراسر میری کاروباری حس اور میرے کمینے پن اور کامن سنس سے ہے۔ وہ ذہنی جھٹکا یہ تھا کہ آپ نہ صرف مرزا صاحب کی صاحبزادی ہیں بلکہ اپنے بھائی کی بہن بھی ہیں۔

چھوٹی بٹیا، آپ کو اب معلوم ہو گیا ہے کہ میں ایک سیلف میڈ انسان ہوں اور میری زندگی کا سب سے بڑا مطمعِ نظر میرا ذاتی مفاد ہے۔ آپ یہ بھی جانتی ہیں کہ میرا کاروبار خصوصیت سے کسی غیر ملکی قوم کے ساتھ ہے۔ جب انھیں یہ معلوم ہو گا کہ میری کانفی ڈنشل سکریٹری کس شخص کی سگی بہن ہے تو آپ خود اندازہ کر لیجیے!

اس کا اثر میرے کاروبار کے لیے کس قدر تباہ کن ہوگا۔

چھوٹی بٹیا ——— میں در پردہ ہر ممکن طریقے سے آپ کی مدد اور اعانت کروں گا اور آپ کو کسی بھی دفتر میں ایک معقول ملازمت دلوا دوں گا۔ آپ کی اور آپ کی والدہ صاحبہ محترمہ کی خدمت میرا فرضِ اولین ہے ——— بٹیا ——— اب میں آپ کے "بزرگ" کی حیثیت سے چند پند و نصائح کرنا چاہتا ہوں ۔ آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ دُنیا بڑی ذلیل جگہ ہے۔ میں بھی دُنیا کا ایک فرد ہوں۔ آپ کے بھائی نے دنیا سے سمجھوتہ کرنے سے انکار کر دیا اور اس کی سزا بھگت رہا ہے۔ مجھے یقین ہے، اور اُمید ہے کہ بہت جلد اسے معلوم ہو جائے گا، یا شاید معلوم ہو چکا ہو کہ اس کے تجزیے اس کی انتہا پسندی اور آئیڈیلزم قطعاً غلط ہے۔ آپ نے اپنے حالات اور اپنی مجبوریوں کے تحت میرے ذریعے دُنیا سے ایک حد تک سمجھوتہ کر لیا۔ جس طرح ثریّا نے میرے ذریعے دُنیا سے سمجھوتہ کر لیا۔ جس طرح ثریّا نے میرے ذریعے دُنیا سے سمجھوتہ کر کے سُورج کے نیچے اپنی جگہ بنالی۔ مجھے یقین ہے کہ قطعی فیصلہ کرنے سے قبل اسے شدید ذہنی کش مکش کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ مگر اسے معلوم ہو چکا ہے اور آپ بھی دیکھ چکی ہیں کہ آج کی دُنیا ایک بہت عظیم الشان بلیک مارکیٹ ہے، جس میں ذہنوں، دماغوں، دلوں اور روحوں کی اعلا پیمانے پر خرید و فروخت ہوتی ہے۔ بڑے بڑے فنکار، دانش ور، عینیت پسند اور خدا پرست، میں نے اس چور بازار میں بکتے دیکھے ہیں۔ میں خود اکثر ان کی خرید و فروخت کرتا ہوں۔

میں یہ سب باتیں آپ کو اس لیے لکھ رہا ہوں کہ آپ ذہنی طور پر بڑی ہو جائیں اور زندگی کی طرف سے کسی قسم کے مزید الوژن اور خوش فہمیاں آپ کے دل میں باقی نہ رہیں۔ ورنہ آپ کو مرتے دم تک مزید صدمے اٹھانے پڑیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ زندگی سے خوف زدہ ہونا چھوڑ دیں ———

اور زندگی کے مکر و فریب اور ریاکاری اور کمینے پن کا انہی ہتھیاروں سے مقابلہ کریں۔ دُنیا میں زیادہ تر انسان جنگل کے درندے ہیں ـــــ اور ہمیں جنگل کے قانون کا ساتھ دینا ہے۔ مجھے اچھی طرح اندازہ تھا کہ آپ اپنی موجودہ ملازمت سے کس قدر دہشت زدہ تھیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ زندگی کی دہشت پر جلد از جلد قابو پا لیں۔

میں یہ خط ایرپورٹ سے لکھ رہا ہوں۔ میں اور ثریّا مہینے بھر کے لیے یورپ جا رہے ہیں اور ہم دونوں کی خواہش ہے کہ واپسی پر ہم آپ کو خوش و خرّم اور بخیر بہت پائیں!

آخر میں میرا ایک اور بزرگانہ مشورہ یہ ہے کہ اب آپ کو شادی کر لینی چاہیے اور اس نقطۂ نظر سے آپ کی موجودہ جائے رہائش کا آپ کے مستقبل پر اچھا اثر نہیں پڑ سکتا۔ میں جنیوا سے لوٹتے ہی کوشش کروں گا کہ آپ کو میرے قرب و جوار میں ایک معقول کرائے کا فلیٹ مل جائے تاکہ آپ بھی ہاؤسنگ سوسائٹی میں منتقل ہو سکیں۔

والدہ صاحبہ محترمہ کی خدمت میں میرا آداب کہیے گا۔ میری پُر خلوص دُعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ یقین کیجیے میں ہمیشہ آپ کا مخلص اور بے لوث دوست رہوں گا!

خدا حافظ

آپ کا تابعدار

کمترین جمشید"

سلمیٰ کے ہاتھ سے خط گر گیا۔ نیچے کرسی پر صبح کا اخبار رکھا تھا جس کے پہلے صفحے پر جلی سُرخی میں منصور احمد خاں کا اسکوپ چھپا تھا +

مصنف: سلامت اللہ

صفحات: 312

قیمت:-/83 روپے

مصنف: رضیہ سجاد ظہیر

صفحات: 216

قیمت:-/65 روپے

مصنف: رشید احمد صدیقی

صفحات: 288

قیمت:-/78 روپے

مصنف: محمد عبدالسلام خاں

صفحات: 348

قیمت:-/110 روپے

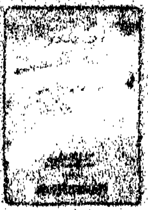

مصنف: محمد حسن

صفحات: 96

قیمت:-/50 روپے

مصنف: محمد اکرام خاں

صفحات: 124

قیمت:-/56 روپے

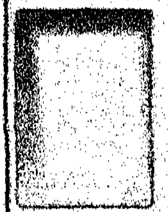

مصنف: محمد عبدالسلام

صفحات: 388

قیمت:-/120 روپے

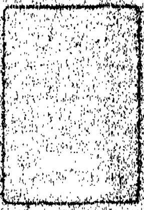

مصنف: ضیاء الحسن فاروقی

صفحات: 88

قیمت:-/48 روپے

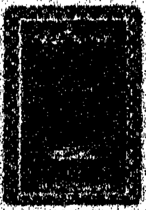

ISBN 978-81-7587-479-4

₹ 110/-